اسلامی تہذیب
کے
چند درخشاں پہلو
ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی
ترجمہ: معروف شاہ شیرازی
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
لاہور
ڈھاکہ

# اسلامی تہذیب

کے

# چند درخشاں پہلو

از

ڈاکٹر مصطفیٰ اسباعی

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

زیرِ اہتمام

ادارہ معارفِ اسلامی کراچی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (مغربی پاکستان)

شاخ :- ۱۶- بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

# اِدارہ معارفِ اسلامی

اِدارہ معارفِ اسلامی (رجسٹرڈ) ایک آزاد علمی و تحقیقی ادارہ ہے جو اسلام کی حقیقی اور بے آمیز تعلیمات کو دورِ جدید کی زبان میں پیش کرنے اور اسلام کی رہنمائی میں آج کے معاشرہ کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے علمی کام میں مصروف ہے۔ اس ادارہ کا قیام ۱۹۶۳ء میں عمل میں آیا۔ ایک با اختیار مجلس منتظمہ اس کے تمام امور کی ذمہ دار ہے۔ ادارہ کا مرکزی دفتر کراچی میں ہے اور ایک مختصر شاخ ڈھاکہ میں کام کر رہی ہے۔ جن مقاصد کے حصول کے لیے یہ ادارہ کوشاں ہے وہ یہ ہیں:

- اسلامی تعلیمات کو پوری تحقیق اور علمی جستجو کے بعد جدید ترین اسلوبِ اظہار کو اختیار کرتے ہوئے پیش کرنا اور تمدن، تاریخ، قانون، معیشت اور دوسرے دائروں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسلام کی روشنی میں پیش کرنا۔
- علمائے اسلام کے تحقیقی کارناموں کا ترجمہ، ترتیبِ نو، تشریح و توضیح اور اشاعت اسی طرح قدیم علمی خزانوں تک آج کے طالبعلموں کی رسائی کا سامان کرنا۔
- عالمِ اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسندانہ فہم پیدا کرنے کے لیے مسلم ممالک کے بارے میں بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص تحقیقی کام کرنا۔
- اسلامی موضوعات پر دورِ حاضر کے مسلم علماء کے نمایاں کارناموں کی وسیع اشاعت اور نفوذ کی خاطر دنیا کی اہم زبانوں میں بالخصوص عربی، اردو، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سواحلی میں ان کے ترجمہ اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- عام پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدن، تاریخ اور مسلم دنیا کے موجودہ مسائل کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لیے مناسب طرز کی عام فہم کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- تعلیم کو مثبت اسلامی آہنگ دینے کے لیے اور اسلامی بنیادوں پر تشکیل شدہ ایک نئے نظامِ تعلیم کے ارتقاء کی راہ ہموار کرنے کے مختلف مراحل کی نصابی اور امدادی کتب کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

## مجلسِ منتظمہ

| | |
|---|---|
| مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب | صدر |
| مولانا سید ناظم ندوی صاحب | نائب صدر |
| مولانا عبدالرحیم صاحب | ر ر |
| چوہدری غلام محمد صاحب | معتمد عمومی |
| عبدالمتین انصاری صاحب | خازن |

---

## ارکان

مولانا ظفر احمد انصاری صاحب

مولانا منتخب الحق صاحب

میاں طفیل محمد صاحب

ڈاکٹر الٰہی علوی صاحب

خرّم جاہ مُراد صاحب

خورشید احمد صاحب

---

کراچی دفتر :- ۱۰/ سی / ۱۶۳- منصورہ
نیڈل بی -ایریا کراچی

# عرضِ ناشر

ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی مرحوم، شام کے ممتاز ادیب اور رہنما تھے۔ ایک عرصہ تک شام کی مشہور دینی تحریک "الاخوان المسلمون" کے مراقب عام کے منصب پر فائز رہے۔ حالیہ انقلابات سے پہلے شام میں پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر نائب صدر کے عہدہ تک پہنچے۔ کلیۃ الشریعۃ (شام یونیورسٹی) کے بھی ایک عرصہ تک پرنسپل رہے۔

علمی و ادبی دنیا میں آپ کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ زمانۂ حال میں عالمِ اسلام نے چوٹی کے جو چند مفکرین پیدا کیے ہیں ان میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔ آپ متعدد بلند پایہ کتب کے مصنّف ہیں اور آپ کی کئی کتابیں بین الاقوامی علمی حلقوں سے زبردست خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

ادارۂ معارفِ اسلامی کے تعاون سے ہم اب آپ کی ایک نہایت اہم کتاب "من روائع حضارتنا" کا اردو ترجمہ برادرانِ ملّت کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا سہرا رفیقِ ادارہ سیّد معروف شاہ شیرازی ایم۔ اے کے سر ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ ہم نہ صرف اپنی روایات و تہذیب سے واقف ہوں گے بلکہ اپنے اسلاف کے اُن درخشاں کارناموں کا بھی علم حاصل کر سکیں گے جن کی بنا پر ہم اقوامِ عالم میں اپنا سر فخر و انبساط سے اُونچا کر سکتے ہیں۔

الحمد للہ کہ ہم اس بلند پایہ تالیف کو اپنی روایات کے مطابق کتابت وطباعت کے اعلیٰ معیار پر پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ناظرین اس کی ظاہری اور معنوی خوبیوں کو پسند فرمائیں گے۔

نیاز مند:

اخلاق حسین، ڈائرکٹر

۱۰ ربیع الاوّل ۱۳۸۹ھ

مطابق ۵ جون ۱۹۶۹ء

# فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصرِ حاضر اپنی مادی ترقیات اور علمی اکتشافات کے اعتبار سے تمام گذشتہ اَدوار سے بازی لے گیا ہے، لیکن اس کے باوجود علم الاجتماع، نفسیات اور طب کے ماہرین اس زمانے میں اعصابی امراض کے مریضوں کی تشویشناک کثرت کو دیکھ کر حیرت زدہ ہیں۔ تمام عالم پر ایک خوف واضطراب کی فضا چھائی ہوئی ہے جس میں تمام انسانیت کو اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے اور بالخصوص اس تہذیبِ نو کے معمار رفاہی سہولتوں کی بہتات اور عیش وعشرت کے ہجوم میں بھی کوئی لذت وآرام محسوس نہیں کرتے۔ اُنیسویں صدی کے علماء ومفکرین نے سائنسی ایجادات واکتشافات کے بل پر جس دورِ سعادت کا تخیل اپنے ذہن میں قائم کر رکھا تھا، وہ خوابِ پریشاں بن کر رہ گیا ہے۔

ایسا نظر آرہا ہے کہ جس قدر وسائل ترقی کرتے چلے جارہے ہیں، اسی قدر اضطراب اور پریشانی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ جن ممالک میں معیارِ زندگی بلند تر ہے وہاں دُوسرے ممالک کے مقابلے میں نفسیاتی بیماریوں کا تناسب بھی زیادہ ہے۔

اس بات کی شہادت خود امریکی حکومت کی طرف سے شائع کردہ اعداد و شمار دے رہے ہیں۔ یہ اضطراب فقط پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے وقوع یا تیسری عالمگیر جنگ کے خطرے سے پیدا نہیں ہوا، بلکہ یہ دراصل اُس نفسیاتی فضا سے پیدا ہوا ہے جسے تہذیبِ جدید نے اپنے سپوتوں کے لیے مہیا کیا ہے۔ اگرچہ استعماری طاقتیں ایسے حالات پیدا کرتی رہتی ہیں جو اُن کے زیرِ تسلط قوموں کو اضطراب میں مبتلا رکھیں۔ لیکن جس عمومی بے چینی کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ یہ اُن قوموں پر بھی چھائی ہوئی ہے جو سامراج کی زد سے بظاہر محفوظ رہی ہیں اور اس نے ان قوموں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جنھوں نے استعمار کے فوائد سمیٹے ہیں۔ اس قلق و اضطراب کو ہم ہر اُس معاشرے میں موجود پاتے ہیں جو جدید اجتماعی نظریات کے تحت پروان چڑھا ہے۔ یہی بے چینی ہم سارے مشرق و مغرب میں محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ سوویٹ یونین کے نظام میں بھی ہمیں یہی اضطراب جھلکتا نظر آتا ہے۔

اس بات کا بیّن ثبوت خودکشی کی وُہ واردات ہیں جو اُن متمدّن قوموں میں اکثر وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز خودکشی کے وہ واقعات ہیں جو اسکنڈے نیوی ممالک[1] میں رونما ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ معاشی تمدنی اعتبار سے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ وہاں کے بعض لوگ عیش و عشرت کی زندگی سے "اُکتا" کر خودکشی کا ارتکاب کر گزرتے ہیں۔[2]

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نئی نسل کا یہ قلق و اضطراب اور اخلاقی انحراف جس سے تنگ آکر مغرب میں خود والدین چیخ اُٹھے ہیں، خود اسی جدید تہذیب و تمدن کی پیداوار ہیں اور ان نظریات کے نتائج ہیں جو اس کی تہ میں کارفرما ہیں۔

---

[1]: مراد ہے ناروے، سویڈن اور ڈنمارک۔

[2]: یہاں خودکشی کرنے والوں کا تناسب دیگر مغربی ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ مترجم

## ۲۔ مغربی تہذیب کی رُوح :

جدید مغربی تہذیب، جیسا کہ معلوم ہے، اسلامی تہذیب اور اس کے ان عربی مراکز کے ساتھ مغرب کے اتصال سے وجود میں آئی ہے جو اسپین یا دوسرے بلادِ اسلامیہ میں قائم ہوئے تھے۔ متکلمین و فلاسفۂ اسلام نے یونانی فلسفے سے بڑے شغف کا ثبوت دیا تھا۔ چنانچہ انہی عربوں سے مغرب کے ذہین طلبہ نے فلسفۂ یونان سیکھا، ان کی کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل کیا اور کلیسا کی شدید مخالفت کے باوجود وہ ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگ گئے۔ پھر جب اہلِ مغرب کے ذہن کھل گئے اور انھوں نے ان حقائق کو اخذ کیا جو کلیسا کے پیش کردہ علوم و معارف سے یکسر متضاد تھے تو نتیجہ یہ ہوا کہ چرچ اور سائنس کے درمیان ایک طویل کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ آخر کار فلاسفہ و مفکرین کو قید و بند، فتاوائے تکفیر اور طرح طرح کی مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنے کے بعد کامیابی نصیب ہوئی۔ مغرب کی نشاۃِ ثانیہ کی یہ تحریک جب اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی تو اس پر دو چیزوں کی نہایت واضح چھاپ لگی ہوئی تھی۔ ایک یونانی فلسفہ سے محبت، جس نے خالص مادی اور بت پرستانہ تصورات سے تشکیل پائی تھی۔ دوسرے دین و مذہب سے بیزاری اور اس کے علمبرداروں سے عداوت و بغاوت۔ چنانچہ انہی دونوں عوامل کے تحت مغربی مفکرین کی آراء نے اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں پرورش پائی، اور انہی کے سائے میں مغرب کے ان تمام فلسفیانہ اور اخلاقی مدارسِ فکر نے نشو و نما حاصل کی ہے جو مغربی ذہن و قلب پر آج تک مسلط ہیں۔

پس وہ بنیادیں جن پر مغربی تہذیب استوار ہے، خالص مادی ہیں اور دین کی روحانیت اور باطنی اثرات سے بہت بعید ہیں۔ چنانچہ دین و مذہب مغربی ممالک میں اپنا غلبہ و اقتدار روز بروز کھوتا چلا جا رہا ہے اور آج مغرب کا انسان اپنے آپ کو انحطاط کے عمیق ترین گڑھے کی طرف جاتا دیکھ کر سخت ترین اضطراب

تشویش میں ہے۔ ان کے مفکرین اور اصحابِ بصیرت دین کی رُوحانی قدروں کو دوبارہ بروئے کار لانا چاہتے ہیں، لیکن یہ انھیں کہاں سے مل سکیں گی؟ الحاد و مادیت کا شجرِ خبیث اب اپنے کڑوے کسیلے پھل دے رہا ہے اور اس کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ جم چکی ہیں۔

مذاہبِ سماویہ میں سے جس مذہب کو بھی آپ لے لیں، اس کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وُہ انسانوں میں عدل و انصاف کو پروان چڑھاتا ہے، قلب و رُوح کو طمانیت بخشتا ہے اور احساسِ تکلیف کو کم کر کے زندگی کے بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ وُہ نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کا قلع قمع کرتا ہے۔ اسلام نے اپنے عہدِ عروج میں یہی کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ لیکن جب ہماری اجتماعی زندگی میں اسلام کے اس خداوندی مشن کی کارفرمائی ختم ہو گئی اور فرد اور جماعت کی آرزوؤں کو جگانے، عزائم کو بیدار کرنے اور ایثار و شفقت کے جذبات کو اُبھارنے والے کارگر ہتھیار کند ہو کر رہ گئے تو ہم نے ان بدبختیوں کا مزہ خوب اچھی طرح چکھا جن کا سامان مغربی تہذیب نے اپنے فرزندوں کے لیے فراہم کیا ہے۔

## ۳۔ مذہب کی زبوں حالی:

اس وقت ہمارا مقصودِ بحث یہ نہیں ہے کہ ہم مغربی تہذیب اور اس مذہب کے درمیان محاکمہ کریں جس سے یہ تہذیب اپنے ابتدائی مرحلوں میں پنجہ آزمائی کر کے نجات حاصل کر چکی ہے۔ سرِدست ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ ہم اس تہذیب کے افلاس کے اسباب کی طرف اشارہ کر دیں، جن کی بنا پر وُہ انسان کو سکونِ خاطر بخشنے میں عاجز و درماندہ ثابت ہو چکی ہے۔ سبب وُہی ہے کہ جب اس تہذیب نے اس مذہب سے ہٹ کر اپنا راستہ پیدا کیا جس سے اس نے جنگ لڑی تھی تو اس نے یہ مقروضہ قائم کر لیا کہ وُہ کسی دوسرے ایسے دین سے رجوع کیے بغیر تنہا اپنا سفر جاری رکھ سکتی ہے جو اس کی رُوح کو تر و تازہ اور اس کے ضمیر کو زندہ رکھنے میں مددگار بن سکے۔

لیکن یہ ایک خام خیالی تھی اور آج ہم پھر دیکھ رہے ہیں کہ مغربی ممالک کی مختلف حکومتوں اور کلیساؤں کے درمیان تہذیبِ جدید کی تلخیوں اور تباہیوں کو کم کرنے کے لیے صدقِ دل سے باہمی تعاون کا جذبہ اُبھر رہا ہے۔ میں جس مغربی ملک میں بھی گیا ہوں، میں نے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ اس مقصد کے لیے متعدد طریقے اور مختلف وسائل کام میں لائے جا رہے ہیں۔

یقیناً وہ شخص جس نے زمانۂ قریب میں سوئٹزرلینڈ کا دورہ کیا ہے، اس نے ہر اتوار کو "مکتی فوج" کے طرز پر ایک جلوس کو بینڈ باجے کے ساتھ پارکوں اور تفریح گاہوں میں گشت کرتے ضرور دیکھا ہوگا۔ اس مذہبی جلوس کا اہتمام چرچ کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ نوجوانوں، بوڑھوں، بچوں اور نوعمر لڑکیوں پر مشتمل ہوتا ہے جو کلیسا کی نظموں کو ساز کے ساتھ گا گا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس طرح مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے اور جو شخص چاہے ان کی بات کو توجہ سے سنتا ہے۔ جس شخص کو لندن کے ہائیڈ پارک میں جانے کا اتفاق ہو، وہ دیکھ سکتا ہے کہ وہاں بھی بالخصوص اتوار کے روز آزادانہ تقاریر ہوا کرتی ہیں۔ ان خطیبوں میں کلیسا کے واعظین بھی ہوا کرتے ہیں، جن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنی فصیح و بلیغ تقریر اور مؤثر اسلوبِ بیان سے پارک کی اکثریت کو اپنی جانب متوجہ کر لیں۔ اسی طرح جو علاقے سینماؤں کے لیے مخصوص ہیں، وہاں کی بھیڑ بھاڑ اور شور و غل میں دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص ایک آہنی اسٹیج پر کھڑا ہو جاتا ہے، جسے دوسرا ساتھی تھام لیتا ہے۔ پھر یہ شخص لوگوں کو نصیحت کرتا اور دین کی باتیں بیان کرتا ہے۔ ایک رات میں نے ایک شخص کو سینما کے دروازے میں کھڑے ہو کر وعظ کرتے ہوئے دیکھا، جو چیخ چیخ کر سینما کے دلفریب مگر مخرب اخلاق پہلوؤں سے لوگوں کو ڈرا رہا تھا۔ یہ سارا کام پولیس کی موجودگی میں ہو رہا تھا اور پولیس قطعاً معترض نہ تھی۔ بعض اس کی باتوں کو سنتے بھی تھے۔ لیکن میں نے کسی ایسے شخص کو نہ دیکھا جو کچھ اثر قبول کرتا اور سینما میں داخل ہونے سے باز رہتا۔

امریکہ اور یورپ میں یہ بات عام ہے کہ کلیسا کے ساتھ ایک انجمن ملحق ہوتی ہے جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ناچنے، گانے اور ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ وُہ اکٹھے سفر کرنے اور جلسے بھی منعقد کرتے ہیں۔ مجھے اس طرح کی ایک انجمن میں شرکت کا اتّفاق ہُوا۔ میں نے دیکھا کہ سوائے گانے بجانے، کھانے پینے اور رنت جگے کے کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ میں نے اس کے ناظم سے دریافت کیا "کیا آپ انجمن کے شرکاء کے سامنے وعظ و نصیحت کی باتیں بھی پیش کرتے ہیں" جواب نفی میں تھا۔ میں نے پوچھا "پھر کلیسا کیوں اس کا اہتمام کرتا اور سارے اخراجات برداشت کرتا ہے جبکہ انجمن کی ساخت ان انجمنوں کے مشابہ ہے جن سے کلیسا کا دُور کا بھی تعلق نہیں ہے" اس نے جواب دیا "یہ فائدہ ہی کیا کم ہے کہ انجمن کے اجلاس میں شرکت کے لیے لڑکے اور لڑکیاں کلیسا کے احاطے میں سے گذر کر جاتے ہیں اور اس طرح وہ کلیسا کو بھی یاد رکھتے ہیں"! یورپ کے بعض ہوٹلوں میں مسافر اس امر کا مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کے پلنگ کے نزدیک انجیل کا ایک نسخہ دھرا رہتا ہے جسے "جمعیتہ محبانِ انجیل مقدس" مہیا کرتی ہے۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ مسافر سونے اور بیدار ہونے کے وقت اس کا مطالعہ کرے اور اپنے دینی عقائد کو تازہ کرے۔ یورپ کی اکثر یونیورسٹیوں میں کرسچن سٹوڈنٹس یُونین کے نام سے تنظیمیں قائم ہیں جن کے ہفت روزہ اجتماعات میں کلیسا کے پادری خطاب کرتے اور دین کے اصُول و مبادی پیش کرتے ہیں اور بعض طلبہ بھی مباحثے میں حصّہ لیتے ہیں۔

مغربی جرمنی میں حکومت ایک خاص قومی فنڈ کلیسا کے نام سے وصول کرتی تاکہ وُہ عیسائیت کی نشر و اشاعت میں مدد کر سکے۔ ایک مرتبہ میں نے جرمنی کی کولون یونیورسٹی کے شفا خانے میں دیکھا کہ میرے وارڈ میں بستر کے سامنے دیوار میں کانسی کی ایک بہت بڑی صلیب نصب ہے۔ بعد میں مَیں نے دیکھا کہ اس طرح کی صلیب شفا خانے کے ہر کمرے میں، حتّٰی کہ ڈاکٹروں کے کمروں اور دفاتر میں بھی موجود تھی۔ میں نے اس کی حکمت کے بارے میں دریافت کیا، تو مجھے جواب

ملاکہ یہ کلیسا کی سرگرمیوں کا ایک مظہر ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں مذہب کی یاد تازہ ہوتی ہے اور یہ سب کچھ اس کے باوجود تھا کہ شفا خانہ یونیورسٹی کے ماتحت تھا اور کلیسا سے براہِ راست اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سلسلے میں میں ہالی ووڈ کی بڑے پیمانے پر تیار کردہ ان مذہبی فلموں کو نہیں بھول سکتا، جنھوں نے لوگوں کی نظروں کو متوجہ کر لیا تھا۔ ہم میں سے بہتوں نے "اخلاقی اسلحہ بندی" (مارل ری آرمامنٹ) کی تنظیموں کے بارے میں ضرور سنا ہو گا جو یورپ کے اکثر ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے نمائندوں نے مشرقِ اوسطا اور مشرقِ بعید، مثلاً قاہرہ کے دورے بھی کیے ہیں۔ میں نے سوئٹزرلینڈ میں ان کے مرکز کو دیکھا ہے جو سوزان کے قریب واقع ہے۔ یہ تنظیمیں بظاہر فضائلِ اخلاق اور رحم و انصاف پر زور دیتی ہیں۔

یہ سب کچھ ان سرگرمیوں کی مختصر روداد ہے جو مغربی ممالک میں دین و اخلاق کے احیاء کے لیے جاری ہیں اور یہ اس امر کی نہایت وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں کہ اقوامِ مغرب نے اپنی تہذیب و تمدن کی مضرتوں کو کم کرنے کے لیے مذہب و اخلاق سے استفادے کی ضرورت کو محسوس کر لیا ہے لیکن اس کے باوجود ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمامِ کار اب مذہبی رہنماؤں اور علمائے اخلاق و اجتماع کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔ موقع ہاتھ سے جا چکا ہے مصائب و آلام روز افزوں ہیں اور یہ تہذیب اپنے طبعی انجام کو پہنچ کر ہی رہے گی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یورپ میں دین کی طرف پلٹنے اور عوام کی رُوحانی سطح کو بلند کرنے میں جو داعیات کارفرما ہیں، ان میں اشتراکیت کے پھیلنے اور غالب آ جانے کا خوف بھی شامل ہے۔ لیکن یورپ میں مذہب اپنی کمزور حیثیت اور مغربی فلسفوں سے پیدا شدہ شک وارتیاب کے سبب اشتراکی سیلاب کا مقابلہ کرنے سے عاجز و درماندہ ہے۔ اس لیے اشتراکیت کا راستہ روکنے کے لیے اجتماعی اور اقتصادی تدابیر ناگزیر ہو چکی ہیں۔ مادی عقل ـــــ جیسی کہ مغربی عقل ہے، سوائے مادے کے کسی شے کا ادراک نہیں کر سکتی، نہ کسی

دوسری چیز پر راضی ہو سکتی ہے، حالانکہ خود اشتراکیت بھی مغربی شجرِ تہذیب ہی کی ایک شاخ اور اس کے ثمرات میں سے ایک ثمرہ ہے۔ یہ وُہ چیز ہے جس نے مغربی تہذیب کی شناعت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے اور اس کی مُضرتوں کو عام کر دیا ہے۔

مارکس اور انجیلز کا اشتراکی فلسفہ اٹھارھویں صدی میں ظہور پذیر ہوا۔ ان میں سے ایک جرمن یہودی اور دُوسرا بھی جرمن باشندہ تھا۔ اس فلسفے کی بدولت حالات اور بھی ابتر ہو گئے کیونکہ اس نے انسان اور اس کے قلبی و روحانی سکون کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا عقیدہ دلوں سے رُخصت ہو گیا اور اخلاق کی وُہ بنیادیں منہدم ہو گئیں جن پر ابتدائے تاریخ سے آج تک انسانی جمعیتیں اجتماعی امن و امان کے لیے انحصار کیا کرتی تھیں۔ دُنیا میں کمیونسٹ اصُولوں کی مُدعی پہلی مملکت وجود میں آگئی اور اس نے کوشش کی کہ وُہ اپنی رعایا کی حالت سُدھارے۔ لیکن وُہ ایسا نہ کر سکی اور وُہ اپنے مادہ پرستانہ فلسفہ زندگی کی بدولت ہرگز ایسا نہ کر سکتی تھی کہ اپنے عوام کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے ہر قسم کے قلق و اضطراب کو دُور کر سکے، اور ذہنی خوف و دہشت کو رفع کر سکے۔ بلکہ اس کے برعکس اشتمالی ریاست نے کچھ مزید خطرات اپنے شہریوں پر مسلّط کر دیے ہیں جن میں یہ خوف بھی شامل ہے کہ اگر وُہ حکومت اور اس کے طور طریقوں پر تنقید کریں گے تو بُرے انجام سے دوچار ہوں گے۔ پھر وُہ اضطراب اور خوف جو کمیونسٹ پارٹیوں کے اپنے ارکان پر طاری رہتا ہے، اس خوف سے کہیں زیادہ ہے جو اشتمالی ریاست کے عام باشندوں کے ذہنوں پر مسلّط ہے۔ پارٹی کے ہر ممبر پر لازم ہے کہ یا تو اپنے قائدین کی ہر رائے کی زور شور سے تائید کرے اور ان کی اندھی مدافعت و تقلید کرے یا پھر اس کا وُہی حشر ہو جو تائید نہ کرنے والوں کے لیے مقدّر ہو چکا ہے۔

پس کمیونزم نے اللہ اور اس کے دین کا انکار کر کے اُس آخری سہارے کو

ختم کر دیا ہے جس سے انسان خوف، مصیبت، محرومی اور ظلم کے خلاف تقویت حاصل کرتا تھا۔ کمیونسٹ ریاست جہاں کہیں بھی قائم ہوئی ہے، اس نے استبداد، خوف و دہشت اور خون آشامی کے بل بوتے پر انسانوں کو بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کے ایسے گلوں میں تبدیل کر دیا ہے جو اپنے ارادہ و اختیار کے استعمال سے قطعاً محروم کر دیے گئے ہیں اور ان سے وہ بلند ترین انسانی آدرش سلب کر لیے گئے ہیں جو ہر معزز انسانی معاشرے کا مطمح نظر ہوا کرتے ہیں۔

غرض یہ کہ مغربی تہذیب و تمدن کی دونوں شاخوں، سرمایہ داری اور اشتراکیت، نے انسان کے امن و سکون کو غارت اور اس کے اعلیٰ ترین مقاصد کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس تہذیب نے محض مادی خوشحالی کو اپنا حقیقی ہدف ٹھہرا لیا۔ پھر حالت یہ ہو گئی کہ جو اس تک رسائی میں ناکام رہا، تو "بدبخت" ہی ہو کر رہا، لیکن جس نے منزل پا بھی لی، اسے بھی سوائے کبیدگی اور افسردگی کے کچھ حاصل نہ ہوا اور اس افسردگی اور اکتاہٹ کا نتیجہ خودکشی کے سوا کچھ نہ نکلا۔

## ۴۔ اعترافِ حقیقت:

بہرحال اب مغرب نے اپنے اخلاقی اور روحانی دیوالیہ پن کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے اور وہاں کے اکثر لوگوں کی نگاہیں مشرق کی طرف منعطف ہونے لگی ہیں کہ شاید یہاں کے مذاہب و عقائد میں انھیں وہ شے مل جائے جو ان کے روحانی خلا کو پُر کر سکے اور انھیں شرفِ انسانیت سے بہرہ مند کر سکے۔ آپ اگر ان ممالک اور بالخصوص امریکہ میں یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں بعض لوگ بودھ مت، بہائیت یا اسلام قبول کر رہے ہیں، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان میں سے اسلام لانے والے دو گروہ ہیں۔ ایک[1] وہ جو عقلی و فکری حیثیت سے اسلام پر راضی ہے اور دوسرا وہ جو اپنی رُوح اور وجدان کے اعتبار سے اس پر مطمئن ہے

ایک مرتبہ نومسلم انگریز مستشرق جناب ابوبکر[1] نے مجھے اپنا قبولِ اسلام کا قصہ سُنایا تھا۔ پہلے وُہ جامعہ فواد، قاہرہ میں انگریزی کے پروفیسر تھے اور وہیں اسلام لائے تھے۔ آج کل وُہ لندن کے قومی کتب خانے کے مشرقی سیکشن کے سیکرٹری ہیں۔ انھوں نے قبولِ اسلام کے اسباب واضح کرتے ہُوئے فرمایا کہ مغربی تہذیب نے انسانی شرف اور حسن وجمال دونوں کو پامال کر ڈالا ہے۔ میں نے عرض کیا: "جہاں تک انسانی شرف کے ضیاع کا تعلق ہے، میں اس میں آپ سے اختلاف نہیں کرتا۔ البتہ حسن وجمال کے بارے میں آپ یہ رائے کیسے رکھتے ہیں؟ حالانکہ اس لحاظ سے لوگ مغربی تہذیب کو بہت حسین اور دلآویز سمجھتے ہیں۔ اس میں مناظر فطرت کے حسن، لباس کے حسن، رہن سہن اور گھر بار کے حسن، نسوانی حسن، غرض ہر قسم کے ذوقِ جمال کی رعایت رکھی گئی ہے" انھوں نے کہا: "اس تہذیب نے رُوح، وجدان اور اخلاق کے حسن وجمال و غارت کر دیا ہے۔"

میں نے ۱۹۵۶ء کی گرمیوں میں پیرس کی جامع مسجد میں ایک خطبہ دیا تھا۔ میلاد النبی صلعم کی مناسبت سے میں نے اس میں اسلام کے عادلانہ اور مشفقانہ مشن کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ اسلام کی یہ صفت کسی طرح فتوحات اور حکمرانی کے دَور میں بھی جلوہ گر رہی ہے۔ اس سلسلے میں الجزائر میں تاریخ کا جو سب سے بڑا قتلِ عام ہُوا ہے، میں نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ اس خطبے کے بعد جن حضرات سے میرا تعارف کرایا گیا۔ ان میں سے ایک رومانی نژاد نومسلم مصطفیٰ ولسن بھی تھے۔ وُہ پیرس میں اٹلی کے قونصل تھے۔ پھر انھوں نے اسلام قبول کیا اور سفارتی عہدے کو ترک کر دیا۔ اس وقت وُہ فرانسیسی نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت کے سربراہ ہیں جو

---

[1]: میں چونکہ یہ مقدمہ اس حال میں لکھ رہا ہُوں، جبکہ میری ڈائری اور یادداشتیں مجھ سے بہت دُور ہیں، اس لیے مجھے ان کا انگریزی نام یاد نہیں رہا۔ تاہم قاہرہ یونیورسٹی کے اساتذہ ان سے بخوبی واقف ہیں۔

خلوصِ دل کے ساتھ اسلام اختیار کر چکی ہے، اگرچہ اس وقت ان کی تنظیم بالکل غیر معروف اور گمنام ہے۔ یہ سب لوگ ہفتہ میں ایک مرتبہ اپنے قائد کے گھر جمع ہوتے ہیں۔ ان سب نے مشرقی لباس زیبِ تن کر رکھے ہیں اور ان میں سے بعض نے نوجوان ہونے کے باوجود صاف ستھری ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ اس اجتماع میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے اور اسلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جناب مصطفیٰ ولسن مجھ سے کہنے لگے: "آپ نے اسلامی فتوحات میں رحمت ورأفت کے پہلو پر جو زور دیا ہے، میں نے اُسے غور سے سُنا ہے۔ غالباً آپ مغربی مصنفین کے اس افتراء کا جواب دینا چاہتے تھے کہ مسلمانوں نے جنگ وجدال میں بے رحمی اور فسادت کا برتاؤ جائز رکھا ہے۔ آپ اس معاملے میں فکر مند نہ ہوں۔ ہر قوم کا ایک اخلاقی مابہ الامتیاز ہوتا ہے جس سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ مغربی اقوام کا نمایاں ترین اخلاق یہ ہے کہ وُہ رحم اور شفقت کے تمام دعووں میں قطعاً منافق ہیں۔"

ایک عرب مسلمان انہی فرانسیسی نومسلم نوجوانوں سے اسلام کی عظمت اور ترقی پذیری کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ وُہ اپنی لے میں اتنا آگے بڑھ گیا گویا کہ وہ کسی عرب ملک میں قوّت وشوکت کے حصول پر تقریر کر رہا ہے۔ چنانچہ وُہ اس بات پر زور دینے لگا کہ اسلام قوّت فراہم کرنے، ٹینک بنانے، ہوائی جہاز بنانے، اور نہ جانے کیا کیا ایجادات تیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ان نومسلموں میں سے ایک کہنے لگا: "میرے بھائی! ہم تو مغربی تہذیب سے اسلام کی طرف آئے ہی صرف اسی لیے ہیں کہ اس تہذیب نے لڑائیوں اور جنگی آلات کے ذریعے سے ہمارے اعصاب کو شل کر دیا ہے۔ اس نے ہماری رُوح کو موت کے گھاٹ اُتار کر اور مادہ پرستی کے ذریعے سے ہماری شہوات کو زندۂ جاوید بنا کر ہماری انسانیت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب تو ہم سے اسلام کی اس رُوحانیت کا تذکرہ کرو، جس میں ہم نے انسانی شرف اور روحانی اطمینان حاصل کر لیا ہے۔

اسی طرح مجھ سے ایک سوئیس لڑکی نے، جو پیرس میں مقیم ہے اور تحلیل نفسی میں اختصاصی ڈگری حاصل کرنے کی کوشش میں ہے، بیان کیا: "میں ایک غریب لڑکی ہوں اور میرے گھر والے اتنا نہیں بھیج سکتے جو اس "فاجر اور فاجر" بستی میں میری گذرِ اوقات کے لیے کافی ہو۔ اس شہر میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ انسان ایک بدنفس بھوکا جانور بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ میں کسی کنبے کی ملازمت اختیار کر لوں تاکہ ضروریات کو بفراغت پورا کر سکوں۔ آخر میں نے کسی مشرقی خاندان کی تلاش کی جس کی روحانی فضا میں میری شرافت و انسانیت محفوظ رہ سکے۔ چنانچہ ایک ہندو گھرانے میں چند گھنٹوں کی ملازمت مجھے مل گئی لیکن مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہاں بھی مجھے اپنی متاعِ گم گشتہ کا سراغ نہ مل سکا۔ میں نے ان کی رُوح کو بھی شرافت سے عاری پایا!"

یہ چند مثالیں ہیں جن میں مغربی انسان کی حیاتِ رُوحانی کے لیے تلاش و جستجو کی کہانی پیش کی گئی ہے، ایسی رُوحانی زندگی جس میں وہ اپنی مادی تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ دمائم، حیرانگی و درماندگی اور قلق و اضطراب سے نجات پا سکیں جن کے سوتے اس تہذیب کی بدولت خود ان کے باطن میں اُبل پڑے ہیں۔ آپ کسی متوازنِ فکر اور اخلاقی و رُوحانی شعور رکھنے والے مغربی انسان سے بھی بات کریں گے تو آپ اس حقیقت کو محسوس کر لیں گے۔

## ۵۔ وقت کی اصل ضرورت ——— اسلام:

جہاں تک مادی زندگی کا تعلق ہے، مغربی تہذیب نے اپنے آپ کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے مشاہدہ کیا، تنہا مادی خوشحالی کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ انسان کو فلاح و سعادت سے ہم کنار کر سکے۔ بلکہ ایک ایسے تمدن و تہذیب کی ضرورت باقی ہے جس میں مادی ترقی کے شانہ بشانہ توازن کے ساتھ روحانی بالیدگی کی کوشش بھی جاری رہے ... منفرد ...

ہو کر دُوسرے پہلو پر ناگوار اثر نہ ڈالے۔ کیا ایسے تمدّن کا وجود ممکن ہے اور کیا ایسی کوئی قوم موجُود ہے جو یہ فریضہ ادا کر سکے؟ دُنیائے مغرب کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس منصبِ مطلوب پر فائز ہو سکے۔ آج تو وہ اپنی مادی قوت اور اپنی فنّی ساز و سامانی کے اوج پر ہے، لیکن کل جب اس کا زور ٹوٹے گا تو امن و سکون اور عزت و شرف کے قیام کی خاطر جس عالمی قیادت کی ضرورت ہے، اس کی اہلیت و صلاحیت مغربی تہذیب کے علمبرداروں میں مفقود ہو گی۔ رہی اشتراکی دُنیا تو اس کے لیے اس فریضہ کی انجام دہی اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ وُہ سرتاسر مادیت میں غرق ہے اور اس نے روحانی، دینی اور اخلاقی اقدار کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ اشتراکی تہذیب بھی مغربی تہذیب کے ساتھ مل کر دنیا کی بدبختی اور بے چینی میں اضافہ ہی کرے گی۔ حتّٰی کہ اس تہذیب کا پورا محل اپنے مشرقی اور مغربی معماروں اور مکینوں سمیت ایک دن پیوندِ خاک ہو کر رہے گا۔

جہاں تک مشرق کے بُت پرستانہ اور مشرکانہ مذاہب کا تعلق ہے، وہ بھی یہ خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ کیونکہ تہذیب ہمیشہ ایسے علم اور فکرِ صحیح کے بل پر قائم رہ سکتی ہے جو اوہام و خرافات سے مبرّا ہو اور بُت پرستی اپنی ذات میں ان تمام باتوں کی ضد ہے مزید برآں دُنیا کو جس تہذیبِ مطلوب کی تلاش ہے اور وُہ جس رُوحانیت کی پیاسی ہے، وُہ ایک ایسی ایجابی اور تعمیری روحانیت ہے جو انسان کی ترقی اور تقدم میں ممد و معاون بن سکے۔ اس کے برعکس مشرق کی تثویت ایک سلبی اور منفی شئے ہے جو زندگی سے فرار سکھاتی ہے، حقوق و فرائض کی ادائیگی سے روکتی ہے اور انسان کی مادی ترقی کو ایک ایسی نجاست قرار دیتی ہے، جس سے پاک رہنا اور جس کے خلاف جنگ کرنا واجب ہو۔ موجودہ زمانے میں اُمتِ مسلمہ کے سوا کوئی دُوسری اُمت ایسی نہیں ہے جو مطلوب ثقافتی کردار ادا کر سکے اور مستقبل کی تہذیب کا علم اُٹھا سکے۔ اس کے وجوہ درجِ ذیل ہیں:-

اوّلاً ہم ایک ایسے عقیدے کے حامل ہیں جو تہذیبوں کو وجود میں لانے

والے عقائد میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہ انتہائی صاف ستھری، روشن اعلیٰ وارفع اور مکمل توحید کا عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ عقل کا احترام کرتا ہے اور اسے اتنی قوت بخشتا ہے کہ مجہول حقائق معلومات کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک معتدل اور معتز انسانی اخلاق کا عقیدہ ہے جو رحمت و شفقت میں افراط سے اور عدل و انصاف میں تفریط سے انسان کو بچاتا ہے اور اسی طرح محبت اور فرض شناسی کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔ یہ ایسے قوانین کا ماخذ ہے جن کا مقصد تنگی نہیں بلکہ آسانی ہے اور جو حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں۔ اس میں فرد کی مصلحت جماعتی مصالح کی ضامن ہے اور جماعت کی مصلحت پر انفرادی مصلحت قربان نہیں ہوتی۔ انسانی مصلحت کو بحیثیت مجموعی ملحوظ رکھا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ قومی اور علاقائی خصوصیات اور مقامی ترجیحات کو مٹایا اور برباد کیا جائے۔

ثانیاً ہم ایک ایجابی اور تعمیری روحانیت کے وارث ہیں۔ یہ ایک ایسی خداوندی روحانیت ہے جو ایک سپاہی کے ساتھ میدانِ جنگ میں، کاریگر کے ساتھ کارخانے میں، عالم کے ساتھ مطالعے میں فلسفی کے ساتھ بحث میں، جج کے ساتھ عدالت میں، ملازم کے ساتھ ملازمت میں اور رئیس کے ساتھ اپنی ریاست میں پائی جاتی ہے۔ یہ ہر انسان کے ہمراہ ہوتی ہے۔ خواہ وہ سنجیدگی میں ہو یا مذاق میں ہو۔ حرکت میں ہو، یا سکون میں ہو، دن میں ہو یا رات میں، آسانی میں ہو یا تنگی میں ہو، صحت میں ہو یا مرض میں ہو۔ لیکن وہ کسی حال میں بھی اس کے رستے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ اُسے ایک کمال سے دُوسرے کمال تک پہنچاتی ہے۔ یہ روحانیت انسان کو یاد دلاتی ہے اُس اللہ کی جس نے اُسے پیدا کیا، اُس زمین کی جس پر وہ چلتا پھرتا ہے، اُس نوعِ بشر کی جن کے ساتھ وہ رہتا بستا ہے، اُس وحدتِ کائنات کی جس کا وہ ایک حصّہ ہے اور اس اللہ رب العالمین کی جس کا وہ بندہ اور غلام ہے۔

ثالثاً، ہم ماضی میں بھی یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہم اس نوعیت کی تہذیب فرہنی

کی قدرت رکھتے ہیں۔ ہماری تہذیب کے معاندین ومنکرین کی جانب سے خواہ کچھ بھی کہا گیا ہو، اس بات سے کسی کو مجالِ انکار نہیں ہے کہ وُہ تہذیب موجودہ تہذیب کے مقابلے میں انسانوں کے لیے کہیں زیادہ باعثِ رحمت وسعادت ثابت ہُوئی تھی۔ ہماری تہذیب اخلاق کی برتری، عدل وانصاف کی حکمرانی، رُوح کی تازگی اور انسانیت کے مختلف اطوار وادوار میں ایک بہترین آئیڈیل ثابت ہُوئی۔ جب ہم علم وفکر کے اعتبار سے پس ماندہ زمانے میں بھی اس بات پر قادر رہے ہیں کہ ایسی حیرت انگیز انسانی تہذیب قائم کرسکیں، تو آج علمی ترقی کے دور اور ایجاد وانکشاف کے زمانے میں ہم ایسی تہذیب کو برپا کرنے کی اور بھی زیادہ قدرت واہلیت رکھتے ہیں۔

ہم جب اس تہذیبِ منتظر کی زمام اپنے ہاتھ میں لیں گے تو خلا میں پرواز کو اللہ کے انکار کی دلیل نہیں بنائیں گے۔ برّاعظموں کی حدُود پھاندنے والے راکٹوں اور میزائلوں کو اقوامِ عالم کے دھمکانے اور اپنے دائرۂ نفوذ میں لانے کا ذریعہ نہیں بنائیں گے۔ ہم ریڈیو کو گمراہی کا وسیلہ اور سینما کو دھوکہ کا آلہ نہیں بنائیں گے۔ ہم عورت کو جسمانی خواہشات کی تسکین کا سامان نہیں بنائیں گے۔ ہم تہذیبی ترقی کے بل پر مختلف اقوام میں لوٹ کھسوٹ نہیں مچائیں گے اور نہ ان کی عزت وثروت کو خاک میں ملائیں گے۔ یہ وہ اسباب یا ان میں سے چند ایک ہیں جنھوں نے ہمیں ایک منفرد اُمّت بنادیا ہے جو اس بات کی مستحق ہے کہ مغربی تہذیب کی ناکامی کے بعد ایک نئی تہذیب کا جھنڈا اُٹھائے جو انسان کی بدبختی کا خاتمہ کرے اور اسے امن واطمانیت اور تسکین وقرار سے حظّ وافر عطا کرسکے۔

جب ہم اپنے عقیدے کی اساس پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری آسمانی کتاب اس امر کا صریح اشارہ کررہی ہے کہ ہم اقوامِ عالم میں تنہا ایک ایسی اُمّت ہیں جو انسانیت کے لیے مطلوب تہذیبی کردار انجام دے سکتی ہے۔ یہ امتیاز نسل یا جنس پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ اسلام نے ان خرافات کو ایک دن کے لیے بھی قبول نہیں کیا۔

بلکہ یہ مذکورہ بالا سبب اوّل و سبب دوم پر مبنی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (آلِ عمران : ۱۱۰)

تم ایک بہترین اُمّت ہو جو برپا کی گئی ہے تمام انسانوں کے لیے، حکم دیتے ہو تم نیکی کا اور روکتے ہو بُرائی سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔

یہ آیت ہمارے عقیدہ و اخلاق کی جانب اشارہ کرتی ہے جس نے ہمارے اندر خیرِ اُمّت ہونے کی صلاحیت پیدا کی ہے۔

دُوسری آیت ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج : ۴۱)

وُہ لوگ جنھیں اگر ہم زمین میں طاقت بخشتے ہیں تو وُہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور معروف کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں۔

اس آیت میں بھی ہماری تہذیب کے انہی خصائص کا ذکر ہے جنھوں نے اسے بہترین انسانی تہذیب بنایا ہے۔

قرآن کریم میں دوسرے مقام پر آیا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ : ۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے بنایا تم کو بیچ کی اُمّت، تاکہ ہو جاؤ تم گواہ لوگوں پر اور ہو جائے رسول تم پر گواہ۔

اس آیت نے ہمیں ایک مشن کا علمبردار بنا دیا ہے، اور وُہ مشن یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کی قیادت کریں اور ہمیشہ ان کی رہنمائی حق اور خیر کے راستے کی طرف کرتے رہیں۔ یہ ذمّہ داری کسی ایک زمانے یا نسل تک محدود نہیں ہے۔

جب ہم نے فطرت کی پکار پر لبیک کہا اور اس مشن کے جھنڈے کو اُٹھا لیا تو ہم نے

امن، ہدایت اور روشنی کی منزل تک انسانیت کی رہنمائی کی۔ پھر ہم نے اس فریضے سے دست کش ہو کر راہِ فرار اختیار کر لی۔ یہ آیۂ کریمہ ہمیں اُبھار رہی ہے کہ ہم دوبارہ اس جھنڈے کو تھام لیں اور دوبارہ اس مشعل کو بلند کریں جس کے ذریعے سے ان قوموں کو نجات ملے جو اضطراب، نفسانیت، ظلم اور مہلک مایوسی کی تاریکیوں میں بھٹک رہی ہیں اور سوائے خودکشی کے خلاصی کی کوئی دوسری سبیل نہیں پاتیں۔ افراد عام ہتھیار استعمال کر کے یا زہر کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور قومیں ایٹم اور ہائیڈروجن بم کی شکل میں خودکشی کا سامان فراہم کر رہی ہیں۔

## ۴۔ ہمارا ثقافتی مستقبل:

ہماری جانب سے ایک نیا تہذیبی کردار انجام دینے کا جو نظریہ ہم نے پیش کیا ہے، دو گروہ اسے بہ نظرِ حقارت دیکھیں گے۔ پہلا گروہ وُہ ہے جسے تہذیبِ مغرب نے اپنا غلام بنا لیا ہے اور جنھیں اپنی قوم کے بارے میں اس امر کا اعتماد نہیں رہا کہ وہ اہلِ مغرب کی مدمقابل بن سکے گی، چہ جائیکہ وہ عالمی قیادت کے منصبِ جلیل پر فائز ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی بدولت ہماری اُمت بے شمار مصائب اور فکری معائب سے دوچار ہو چکی ہے۔ ہم اللہ کے شکرگزار ہیں کہ ہماری قوم کا یہ طبقہ اپنی تعداد کے لحاظ سے برابر سُکڑتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا باعث کچھ تو تہذیبِ حاضر کی اپنی حماقتیں اور اس کے وُہ جرائم ہیں جن کا ارتکاب اس نے اپنے پیروؤں اور دُوسری کمزور قوموں کے خلاف کیا ہے اور ایک حد تک اس کا سبب ہماری اُمت کی وُہ فکری و سیاسی بیداری ہے جو خوشگوار نتائج کی خبر دے رہی ہے۔ مغربی سامراج کی سیاسی غلامی کا دور اب ختم ہو چکا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ہمارے ان سیاسی قائدین کا دور بھی رخصت ہو چکا ہے جو سامراج کے خاتمے کو محال سمجھتے تھے۔ اسی طرح "مہذب" مغرب کی تہذیبی غلامی کا عہد بھی عنقریب ختم ہو کر رہے گا اور ہم اس پرانے طرز کے "روشن خیال اور آزاد منش" لیڈروں سے بھی چھٹکارا حاصل

کریں گے، جو درحقیقت جہالت، غلامی اور کند ذہنی کے ذلیل مظہر کے سوا کچھ بھی نہ تھے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو اس بات کو تو مانتا ہے کہ مغربی تہذیب اپنے شر و فساد کی کثرت کے باعث ملیا میٹ ہو جائے گی۔ لیکن وہ ہماری طرح اس امکان کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہم ایک جدید تہذیبی تحریک کی بنیاد ڈال سکیں گے، جبکہ متمدن اقوام اور ہمارے درمیان بہت بڑا تفاوت ہے۔ اس لیے تہذیبی قیادت کی باتیں ان کے نزدیک "ایں خیال است و محال است و جنوں" کے مترادف ہیں۔

لیکن ہم جب اس موضوع پر بات کرتے ہیں تو ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ مغربی تہذیب کا خاتمہ اور ہماری طرف تہذیبی قیادت کی منتقلی دس، بیس یا مثلاً پچاس برس میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ تہذیبوں کے قیام و انہدام کے کچھ فطری قوانین ہیں جو اٹل ہیں۔ جب کسی مضبوط سے مضبوط قلعے کی بنیاد میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی ہے تب بھی دیکھنے والوں کو ایک طویل مدت تک یہی دکھائی دیتا ہے کہ وہ نہایت مضبوطی اور جماؤ کے ساتھ قائم ہے۔ حالانکہ وہ اس ظاہری مضبوطی کے باوجود انحطاط پذیر ہوتا ہے اور تھوڑا عرصہ نہیں گذرتا کہ کھنڈر بن کر رہ جاتا ہے۔

ہم اپنی نشاۃ جدیدہ کے ابتداء سے اب تک کئی مرحلوں سے گذر کر آئے ہیں، جن میں سے ہر بعد کا مرحلہ پہلے مرحلے کے فطری نتیجے کے طور پر پیش آیا ہے۔ جب ہمیں ہوش آیا تو ہم نے اپنے آپ کو بہت بری طرح استعمار کے جنگل میں پھنسا ہوا پایا۔ ہم نے بیشتر ممالک میں سے استعمار کو نکال باہر کیا۔ اور انشاء اللہ عنقریب بقیہ ممالک سے بھی اُسے خارج کر دیں گے۔ اب ہم نے ان طور طریقوں کو سیکھنا اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو منظم کرنا شروع کیا ہے جو طور طریقے تہذیب جدید نے لازم کر رکھے ہیں اور یہ تہذیب وہی ہے جو کل ہماری تقدیر کی مالک بن بیٹھی تھی اور جس نے ہمارے ملکوں کو فتح کر کے اپنے تسلط میں لے لیا تھا۔ پھر ہم نے حصولِ قوت کے راستے میں قدم بڑھانا شروع کیا۔ اپنے قدرتی وسائل سے استفادہ کیا اور حتی الوسع یہ کوشش کی کہ مصنوعات

ہیں مغرب کے دست نگر نہ رہیں۔ اب ہماری جدّ وجہد اس مقصد کے لیے ہے کہ ہم مہذّب اقوام کی برادری میں شریک اور قوت و معیشت میں ان کے سہیم بن جائیں اس مرحلہ میں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے لیے ایک ایسا تہذیبی معیار مقرر کریں جس میں جدید تمدنی مشکلات اور ہمارے خصوصی احوال و حاجات دونوں کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس مرحلہ کے اختتام سے سے پہلے آنے والے مراحل کے لیے اپنے خطوطِ عمل متعیّن کریں۔ کیا ہم آئندہ بھی اسی تہذیب کے زیر سایہ ہی زندگی بسر کرتے رہیں گے اور انہی لوگوں کے پیچھے دوڑتے رہیں گے جو ہم سے کئی سو سال آگے بڑھ چکے ہیں، تاکہ عاجزی و درماندگی ہمیں چاروں طرف سے گھیر لے اور ہماری آرزو بس اتنی رہ جائے کہ ہم انہی پیش روؤں میں ضم ہو کر ان جیسے ہو جائیں؟ یا ہم اپنے لیے کوئی نئی راہِ عمل متعیّن کریں جو ہمیں آگے بڑھانے کے لیے مہمیز کا کام دے اور ہمیں ان مہذّب اقوام کے مصائب و مشکلات اور انحطاط و اضمحلال سے بھی محفوظ رکھے؟

ہم امرِ واقعی کے اعتبار سے اس بات پر قادر نہیں ہیں، کہ آئندہ چند سالوں میں مادی قوّت کے لحاظ سے اس معیار کو پہنچ جائیں، جہاں آج مغرب پہنچ چکا ہے۔ یہ بات آسان نہیں ہے کہ اس اثناء میں ہمارے پاس مصنوعی سیارے یا برِّاعظموں کے حدود کو پار کرنے والے راکٹ مہیا ہو جائیں۔ اور بالفرض اگر ہم چند سالوں میں یہ کامیابی حاصل کر لیں، تب بھی اس دوران میں مغرب دوبارہ ہم سے آگے نکل چکا ہوگا۔ پس صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم تکمیلِ قوّت کے لیے حسبِ استطاعت کوشش بھی کریں اور اس کے ساتھ ہم اپنے لیے اور پوری انسانیت کے لیے ایک جدید تہذیبی معیار وضع کریں حقیقت یہ ہے کہ ہم طرزِ تہذیب کے انتخاب میں پوری آزادی برت سکتے ہیں اور ہمارے پاس تہذیبِ حاضر کی مشکلات اور اس کے خطرات پر غور و خوض کرنے کے لیے کافی وقت ہے ایسا رویّہ اختیار کرنے کا باعث صرف یہ امر ہی نہیں ہے کہ ہم موجودہ مرحلے میں اس تہذیب کے تسلط سے نجات حاصل کریں، کیونکہ اس کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا اصل

مقصود یہ ہے کہ ہم آئندہ مرحلے میں اس بلا سے خلاصی حاصل کر سکیں اور اس کی زد سے محفوظ ہو جائیں۔ اس مقصد کے حصول کا راستہ ہمارے لیے بالکل ہموار ہے۔ بشرطیکہ ہم اپنے عقائد و اصول پر ایمان رکھتے ہوں اور ان اقدار پر ہمارا یقین ہو جن کی صحت و حقانیت کو تجربات نے بھی ثابت کر دیا ہے، اور جن سے ہمارا تہذیبی قافلہ ترکیب پاتا ہے۔ ہماری عظیم الشان قوم کے اندر سے ابھی تک ہمت و رفعت کی چنگاری بجھی نہیں ہے۔ جاں بازی و سرفروشی کی آگ ابھی تک سرد نہیں ہوئی ہے۔ اور حملہ آوروں کی مسلسل ضربیں کھانے کے باوجود اور غداروں کی چوٹیں برابر سہنے کے باوصف اس نے ظلم و عدوان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا!

اگر ہم نے اس کام کو سرانجام دے لیا تو ہم دیکھیں گے کہ تاریخ انسانی کے عہدِ جدید کو ہم نے ایک اہم ترین رُخ کی طرف موڑ دیا ہے۔ ہم اس طرح سے ایشیا اور افریقہ جیسے دو بڑے اعظموں پر اپنی روحانی و اخلاقی سطوت کے نقش ثبت کر دیں گے جو انھیں بقیہ ممالک سے زیادہ خوش نصیب اور امن و اطمینان کا زیادہ مستحق بنا دے گی۔ پھر اس وقت خستہ و درماندہ اور گم کردہ راہ عالم غربی بھی لامحالہ ہماری جانب متوجہ ہوگا اور ہم سے وہ شے حاصل کرے گا جو اس کی بدبختی اور غم نصیبی کو ہلکا کرے گی۔ اس دن قیادت کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں آ جائے گی، اور قبل اس کے کہ کچھ فاترالعقل لوگ انسانیت کا خاتمہ کر دیں، ہم انسانیت کا رُخ پھیرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ان سب باتوں کے باوجود میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ حوادثِ تاریخ کی رفتار مضمون نگاروں کے ذہن کی قائم کردہ ترتیب کے مطابق نہیں ہوتی۔ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا؟ یہ دُنیا ناگہانی حادثات سے لبریز ہے۔ زمین کے ایک کنارے پر ایک واقعہ رُونما ہوتا ہے اور وہ زمین کے دُوسرے سرے پر بسنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ تاہم یہ امر اس سے مانع نہیں ہے کہ ہم مستقبل کے بارے میں غور و فکر اور سوچ بچار کریں۔ تاریخی واقعات کو اللہ تعالیٰ مفکرین کے نظریات اور

انبیاء مصلحین کی دعوت کے مطابق ڈھالنا ہے۔

بہرکیف اس کتاب کا موضوع وہ تقاریر ہیں جو میں نے ۲۰ محرم ۱۳۷۵ھ (۸ ستمبر ۱۹۵۵ء) اور ۲۳ ربیع الثانی (۸ دسمبر ۱۹۵۵ء) کے درمیان دمشق ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی تھیں۔ ان میں ہماری تہذیب کے تابناک پہلوؤں کے کچھ دلکش نمونے پیش کیے گئے تھے۔ یہ ایسے پہلو ہیں جو ہر منصف مزاج اہلِ نظر کے دل کو موہ لینے والے ہیں۔ میں نے ان تہذیبی مظاہر کا استقصاء نہیں کیا۔ اور نہ ان کا علمی تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ میں ایسے سامعین سے مخاطب تھا جن کی ذہنی اور فکری سطح مختلف تھی۔ میری غرض ان تقاریر سے یہ تھی کہ وہ لوگ ان تقاریر پر کان دھریں جو بات سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کو قبول کرتے ہیں۔ بالخصوص وہ سعید نوجوان اور اہلِ فکر جو اللہ پر ایمان اور اپنی تاریخ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ لیکن مجھے ان تقاریر کو جاری رکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ میں مغربی ممالک کے ایک علمی سفر کی تیاری کر رہا تھا جو ۱۹۵۶ء میں اختتام پذیر ہوا۔ ورنہ میری خواہش تو یہ تھی کہ میں اس طرح کے بہت سے مسرت بخش واقعات کو بیان کروں۔ یہ ہماری تہذیبی تاریخ میں انسانیت کے وہ نمونے ہیں جو مثبت روحانیت سے آراستہ ہیں۔ یہ ایمان باللہ، اتباعِ حق، پاکیزگیٔ نفس، تنویرِ روح، حسنِ خلق، انسانی ہمدردی اور عادلانہ حکمرانی کی جلیل القدر مثالیں ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے باوجود تھا کہ انہوں نے تہذیب و تمدن کے ہنگاموں میں بھرپور حصہ لیا اور کارگاہِ حیات میں پوری طرح سرگرمِ عمل رہے۔ ان میں سلاطین بھی تھے، علماء بھی تھے، فلاسفہ اور قائدین بھی تھے، تاجر اور حکام بھی تھے، مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ بوڑھے اور جوان بھی تھے اور غنی اور فقیر بھی تھے۔ یہ انسانی کمال کے ایسے نمونے تھے جو صرف فلسفیوں اور دانشوروں کی دنیائے تخیل کے خیالی کردار نہ تھے بلکہ وہ زمین کی پیٹھ پر اہلِ زمین کے ساتھ رہتے سہتے بھی تھے۔

مثبت روحانیت کی یہ ایسی دلآویز مثالیں ہیں جن میں ہماری تہذیب تمام قدیم و جدید تہذیبوں سے منفرد اور ممتاز ہے۔ یہ درست ہے کہ تاریخ کچھ روحانی اشخاص

سے آشنا ہے جو مختلف اقوام بالخصوص مشرقِ بعید میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور آج بھی
ایسے لوگ موجود ہیں جن پر روحانیت کا ایک پاکیزہ میلان غالب ہے۔ لیکن ان
تمام لوگوں کا رویہ تہذیب کے معاملہ میں منفرد اور سلبی تھا۔ یہ ہنگامۂ حیات سے
تنفر اور تہذیب و تمدن سے گریز و فرار کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی زندگیاں
مندروں، پہاڑوں کی چوٹیوں، غاروں اور صحراؤں میں گذری ہیں۔ لیکن ہماری تہذیبی
تاریخ کے نمونے وہ ہیں جنھوں نے معرکۂ حیات میں گھس کر اسے سنوارنے اور
بنانے کی کوشش کی اور اس سعی و جہاد میں جان و مال کی ہر طرح کی قربانی پیش کی۔
تہذیبوں کی تاریخ میں ہمارے تعجب خیز روحانی نمونوں کے حسن و جمال کا اصل راز
یہی ہے۔

## مقصودِ اشاعت:

آج ان تقاریر کی اشاعت سے مقصود یہی ہے کہ نگاہوں کو ان دل پسند
نمونوں کی جانب منعطف کرایا جائے، جن کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ
ہم میں موجودہ تہذیب سے فائق تر اور کامل تر تہذیب کے قیام کی صلاحیت موجود
ہے، اور اپنی قوم کی نئی نسل کو اس طرح کی ایک اعلیٰ تہذیب برپا کرنے کا فریضہ
یاد دلایا جائے جس طرح کی تہذیب ان کے آباؤ اجداد نے قائم کی تھی۔ یہ وقت
اس یاد دہانی کے لیے نہایت موزوں ہے کیونکہ ہماری قوم پورے جوش و خروش
اور پورے ولولے کے ساتھ تاریخ کے ایک نئے دروازے میں قدم رکھ رہی
ہے تاکہ وہ ایک بہتر اور برتر مستقبل تعمیر کر سکے۔ امتِ مسلمہ میں ابھی تک اپنے آباؤ
اجداد کے خصائل و عادات کے آثار موجود ہیں۔ اس لیے جب وہ اپنے بڑوں
کے شرف و مجد اور بزرگی و سربلندی کی داستانیں سنتی ہیں تو اس میں زبردست حرکت
پیدا ہوتی ہے اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ آمادۂ عمل ہو جاتی ہے۔ ۵

جوانوں کو میری آہِ سحر دے　　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خداوندا میری یہ آرزو ہے! میرا نورِ بصیرت عام کر دے

ان دل پسند مناظر کے پیش کرنے سے ہمارا مُدعا یہ نہیں ہے کہ ہماری تاریخ میں
کچھ تھا حسین و درخشاں اور روشن و تابناک تھا۔ کوئی تاریخی تہذیب ایسی نہیں ہے
س کے علمبرداروں سے لغزشیں نہ ہوئی ہوں۔ مقصود صرف اس امر کا اثبات ہے
پائیدار انسانیت کو نمایاں کرنے والے گوشے ہماری تہذیب میں زیادہ مضبوط اور
تر ہیں۔ نیز مقصد یہ بھی ہے کہ ان معترضین کے الزامات کی تردید بھی کر دی جائے جنہیں
ماری تہذیب میں سوائے عیوب و نقائص کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اور جو اس بات
پر کمربستہ ہیں کہ ہماری تہذیب کو مستقل تہذیبوں کی فہرست سے خارج ہی کر دیں۔
یک غرض یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کی شاطرانہ چالوں کو ناکام بنا دیا جائے جو ہماری
جدید نسل کی نگاہوں سے ہمارے تاریخی آثار کو اوجھل کر دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے
ساتھ ہماری اس جدید نسل کو بھی لے ڈوبیں۔ کیونکہ وہ اپنی جس تہذیب میں ہماری جدید
نسل کو جذب کر لینا چاہتے ہیں اس کی ہلاکت خیزی بالکل عیاں ہو چکی ہے اور جس
کی تاریخ کا ایک ورق اگر کچھ فضائل پر مشتمل ہے تو ہزاروں صفحات نقائص و رذائل
سے سیاہ ہو رہے ہیں۔ استعمار کا اصل ہدف یہی ہے جس کے لیے وہ جدّ و جہد
کر رہا ہے اور اس کے دم چھلوں اور پرستاروں کا مشغلہ بھی یہی ہے کہ وہ ہمیشہ تہذیب
مغرب کے گن گانے میں منہمک رہیں۔

میں نے ابتدا کی ہے آپ تکمیل کریں۔

میں نے اس کتاب میں اپنی تہذیب کے پسندیدہ اجزا کے صرف چند نمونے
پیش کیے ہیں! میں اُمید رکھتا ہوں کہ ہماری تہذیب کا تاریخی مطالعہ کرنے والے اس
ابتدائی پیش کش کو پوری تفصیل و توضیح کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچائیں گے۔ تاکہ ہماری نئی نسل
کے سامنے وہ تہذیب اپنی حقیقی دلکشی اور کامل رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہو، جس سے ماضی
میں نور کی شعاعیں پھوٹی تھیں اور جس نے قرونِ وسطیٰ میں زندگی کی روح پھونک دی
تھی ـــــ جو قوم شاندار ماضی رکھنے کے باوجود اپنے ماضی سے بے خبر رہتی ہے۔ اس

کا کوئی "حال" نہیں ہوتا، اور جو قوم اپنے خصائص و فضائل سے بیگانہ ہے، اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے، کیونکہ کسی امت اور تہذیب کا اس کے ماضی سے قوی رشتہ ہوتا ہے اور اس کی بنیادی خصوصیات ہی کسی تہذیب کے وجود کا سبب ہوتی ہیں —— اس قسم کی پھبتی کسنے والے کہ "کاہل و ناکارہ لوگوں کا یہ کام ہے کہ وہ ماضی سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور پھر اسے یاد کر کے اس کا ماتم کرتے رہتے ہیں" —— اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ خیر و برکت کا سرچشمہ ہونے کے باوجود ماضی کے ساتھ تجاہل و حقارت کا رویہ اختیار کرنا نادانوں اور کینہ پروروں کا شیوہ ہے۔ خیر و فلاح اسی میں ہے کہ ہم اپنے حال کی تعمیر میں اپنے سابق خزانوں سے استفادہ کریں تاکہ ہماری اٹھان کا انجام بخیر ہو۔ ہمارا مستقبل کامیابی و کامرانی سے ہم کنار ہو اور امت کی بقا کے اسباب اسی پوری جد و جہد میں شامل اور شریک کار رہیں۔ اس طرح ہمارا گذشتہ مجد و شرف آئندہ کی عظمت کے ساتھ جڑ کر ہم رنگ و ہم مزاج بن جائے۔ اس طرح ہمارا کارواں جادہ پیما رہے گا۔ ماضی و مستقبل کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی رہیں گی اور عمارت مکمل ہوتی رہے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ارادوں کی تکمیل مشیتِ الٰہی پر موقوف ہے اور وہی توفیق دینے والا ہے۔

○

مصطفیٰ حسنی السباعی

# پہلا باب

# ہماری تہذیب کی خصوصیات

# ہماری تہذیب کی خصوصیات

بعض مصنفین نے تہذیب کی تعریف اس طرح کی ہے کہ وُہ ایک ایسا نظامِ اجتماعی ہے جو انسان کو ثقافتی ثمرات کے حصُول میں زیادہ سے زیادہ مدد دیتا ہے۔ تہذیب چار بنیادی عناصر سے ترکیب پاتی ہے۔ اقتصادی ذرائع، سیاسی نظم، اخلاقی قواعد و ضوابط اور علوم و فنون کا استحکام۔ تہذیب کی تنظیم و ترقی کے لیے بعض جغرافیائی، اقتصادی اور نفسیاتی عوامل ناگزیر ہیں۔ مثلاً دین، زبان اور تعلیم و تربیت۔ اور تہذیب کے زوال و انہدام کے لیے بھی بعض عوامل ہیں، جو ان عوامل کے برعکس ہیں جو اس کے قیام کے موجب ہیں۔ ان میں سے چند عوامل یہ ہیں: اخلاقی و فکری اضمحلال، نظم و قانون کا اضطراب، ظلم و فقر کا پھیلاؤ۔ بدبختی اور بے پروائی کا دور دورہ اور مخلص و قابل رہنماؤں کا فقدان۔ تہذیب کی کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے انسان کو زمین میں قرار و سکون حاصل ہوا ہے۔ تہذیب کی کڑیاں مسلسل ایک دُوسرے سے جُڑی ہُوئی ہیں جنھیں ہر قوم بعد کی اقوام کی طرف منتقل کرتی چلی آرہی ہے۔ یہ کسی نسل یا خطّے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مذکورہ بالا عناصر

ہی سے اس کی پیدائش ہوتی ہے۔ شاذ و نادر کوئی اُمّت بھی ایسی نہیں گزری جس نے تاریخِ تہذیب کے صفحات میں کچھ نہ کچھ اضافہ نہ کیا ہو۔ البتہ جو شے ایک تہذیب کو دوسری سے ممتاز کرتی ہے وہ ان اساسات کی قوت ہے جن پر کوئی تہذیب قائم ہوتی ہے اور وہ اثرات و فوائد ہیں جو اس تہذیب سے پوری انسانیت پر مترتب ہوتے ہیں (جو تہذیب اپنے مشن اور پیغام میں جتنی زیادہ آفاقی اور عالمگیر فطرت کے اعتبار سے جتنی زیادہ انسان دوست، میلانات کے لحاظ سے جتنی زیادہ اخلاق اور اپنے اصولوں میں جتنی زیادہ حقیقت پسند ہوگی، اتنی ہی زیادہ وہ تاریخ میں جاودانی لافانی اور لائقِ تکریم قرار پائے گی)

ہماری تہذیب بھی انسانی تہذیبوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس سے پہلے بھی تہذیبیں گذر چکی ہیں اور اس کے بعد بھی برپا ہوتی رہیں گی۔ ہماری تہذیب کے قیام کے بھی کچھ عوامل تھے اور اس کے انحطاط کے بھی کچھ اسباب ہیں، لیکن وہ اسباب و عوامل اس سلسلۂ تقاریر سے غیر متعلق ہیں۔ کیونکہ ہماری گفتگو اس دائرہ میں محدود ہے کہ جب وہ برپا ہوگئی تو کیا تھی؟ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس تہذیب کی جاذبیت و دلکشی پر گفتگو کریں، ہمیں چاہیے کہ انسانی ترقی کی تاریخ میں اس تہذیب نے جو عظیم الشان حصہ لیا ہے، اور عقائد و علوم، فن و ادب اور حکمرانی و جہانبانی کے میدان میں اس نے اقوامِ عالم پر جو دائمی احسانات کیے ہیں، اس کا بھی کچھ تذکرہ بیان کریں چنانچہ سب سے نمایاں خصوصیات جو ہماری تہذیب کا مطالعہ کرنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

## پہلی خصوصیت:

یہ تہذیب عقیدۂ توحید کی اساس پر قائم ہے۔ چنانچہ یہ اوّلین تہذیب ہے جو اللہ واحد کی طرف دعوت دیتی ہے، جس کی بادشاہی اور حکومت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ صرف اسی کی عبادت کی جانی چاہیے اور اس کو مقصود و ملجا ماننا

چاہیے (اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ) وہی ہے جو عزت دینا ہے یا ذلیل کرتا ہے بخشش وعنایات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

آسمانوں اور زمین میں کوئی شے نہیں ہے جو اس کی قدرت کے تحت اور اس کے قبضے میں نہ ہو۔ توحید کے مفہوم ومقتضا کو دل ودماغ میں رچا بسا لینے کا ہی کرشمہ تھا جس نے انسان کے مقام کو اونچا کیا اور عوام کو سلاطین و اُمراء کی چیرہ دستیوں اور پاپائیت اور برہمنیت کی گرفت سے آزاد کیا۔ حاکم اور محکوم کے تعلقات کو درست کیا اور نگاہوں کو الٰہ واحد کی جانب پھیرا جو تمام مخلوق کا خالق اور سارے جہان کا رب ہے۔

اس عقیدے کا اسلامی تہذیب پر اتنا زبردست اثر پڑا کہ وہ تمام پہلی اور پچھلی تہذیبوں سے ممتاز ہو گئی اور اپنے عقائد نظم ونسق اور شعر وادب میں بُت پرستی کے تمام مظاہر وآداب سے پاک ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے الیڈ اور دوسرے شرک آمیز یونانی ادب پاروں کا ترجمہ کرنے سے احتراز کیا ہے اور نقش ونگار، پچی کاری اور تعمیر کے فن میں مہارت رکھنے کے باوجود بُت تراشی اور تصویر سازی کے معاملہ میں زیادہ آگے نہیں بڑھے۔ اسلام نے بُت پرستی کے خلاف کھلم کھلا اعلانِ جنگ کیا ہے اور اس نے بُت پرستی کے مظاہر مثلاً قائدین، صالحین، انبیاء اور فاتحین کے مجسّمے بنانے کی اجازت نہیں دی۔ حالانکہ اس طرح کے مجسّمے قدیم اور جدید تہذیبوں کے نمایاں ترین مظاہر میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان تہذیبوں میں سے کسی نے بھی عقیدۂ توحید میں اسلام کے مرتبے اور مقام کو نہیں پایا۔

اس عقیدۂ توحید نے وحدت کا وہ رنگ پیدا کیا جس کی چھاپ ہماری تہذیب کے جملہ آثار واسباب اور تفصیلی مظاہر پر ثبت ہے۔ اسی لیے یہاں پیغام اور نصب العین میں وحدت ہے، قانون سازی میں وحدت ہے، مقاصدِ عامہ میں وحدت ہے، معاشرت کی مجموعی ہیئت میں وحدت ہے، وسائلِ معیشت میں وحدت

ہے، طرزِ فکر میں وحدت ہے، حتّٰی کہ فنونِ اسلامی کا مطالعہ کرنے والوں نے مسلمانوں کی مختلف اقسام کی فنی تخلیقات میں بھی اسلوب و ذوق کی وحدت کو کارفرما دیکھا ہے۔ اندلس کا ہاتھی دانت کا ٹکڑا، مصر میں بنا ہوا کپڑا، شام کا بنا ہوا مٹی کا برتن اور ایرانی معدنیات کا ڈھلا ہوا زیور شکل و صورت کے تنوع کے باوجود ان سب پر ایک ہی طرز کی چھاپ لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

## دُوسری خصُوصیّت:

ہماری تہذیب کی دُوسری خصوصیّت یہ ہے کہ وُہ اپنے میلان و رُجحان کے اعتبار سے پُوری انسانیّت پر حاوی ہے اور اپنے پیغام اور مشن کے اعتبار سے آفاقی اور عالمگیر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے نسل، خاندان اور وطن کے تنوّع کے باوجود نوعِ انسانی کی وحدت کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (الحجرات: ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تم کو پیدا کیا ہے ایک مرد اور ایک عورت سے اور بنایا ہے تم کو گروہ اور قبیلے تاکہ تم ایک دُوسرے کو پہچان سکو ورنہ اللہ کی نظر میں تم میں سے زیادہ بزرگ وُہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔"

قرآن مجید کے اس اعلان نے جب عالمی انسانیّت کی وحدت کی بنا رکھی، خیر اور خدا ترسی پر رکھ دی تو اس کی سلکِ تہذیب میں ہر اس اُمّت اور قوم کے ذہین اور فطین لوگ پرو دیے گئے جس پر اسلام نے اپنی فتوحات کا جھنڈا لہرا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دُوسری ہر تہذیب صرف ایک ہی نسل اور ایک ہی قوم کے ناموروں پر فخر کر سکتی ہے، لیکن اسلامی تہذیب ان تمام اقوام و قبائل کے سپوتوں پر فخر کر سکتی ہے جنھوں نے مشترکہ طور پر اس قصرِ تہذیب کے تعمیر

کرنے میں مدد دی - ابُو حنیفہ - مالک - شافعی - احمد - الخلیل - سیبویہ - الکندی - الفرابی - الفارابی - ابنِ رُشد اور ان کی طرح کے دوسرے مشاہیر مختلف قوموں سے تعلق رکھنے کے باوجود فرزندانِ اسلام ہی تھے جن کے ذریعے سے اسلامی تہذیب نے انسانیت کے سامنے فکرِ سلیم کے بہترین نتائج و ثمرات پیش کیے ہیں۔

## تیسری خصُوصیت :

تیسری خصُوصیت ہماری تہذیب کی یہ ہے کہ اس نے اخلاقی اصولوں کو اپنے پورے نظام اور اپنی ساری سرگرمیوں میں اوّلین مقام عطا کیا ہے۔ ان اصولوں سے کبھی بھی صرفِ نظر نہیں کیا ہے اور انھیں حکمرانوں، جماعتوں یا افراد کی مادّی منفعت کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ حکومت، علوم و فنون، قانون سازی، صلح و جنگ، اقتصادیات اور عائلی معاملات میں، اخلاقی اصولوں کی تطبیق کو ہمیشہ مدِنظر رکھا گیا ہے۔ بلکہ اسلامی تہذیب اس معاملے میں جس حدِ کمال کو پہنچی ہے، اُس تک کوئی جدید یا قدیم تہذیب نہیں پہنچی اور اس ضمن میں اس تہذیب نے جو آثار چھوڑے ہیں وُہ حیرت انگیز ہیں بلکہ یہ ایسی واحد تہذیب ہے جس نے انسانیت کے لیے خالص سعادت کی ضمانت دی ہے اور بدبختی کے سائے سے بھی بچایا ہے۔

## چوتھی خصُوصیت :

چوتھی خصُوصیت یہ ہے کہ یہ تہذیب علم کے سچے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے اور پاکیزہ ترین اصُول و عقائد کو اپنا مرکز قرار دیتی ہے۔ اس نے عقل و دل کو بیک وقت خطاب کیا ہے اور افکار و جذبات دونوں کو معاً اُبھارا ہے۔ نقطۂ نظر سے وُہ ممتاز ہے اور اس خصُوصیت میں بھی کوئی تہذیب اس کی شریک نہیں ہے۔ پھر ہماری تہذیب کا یہ ایک عجیب خاصہ ہے کہ اس نے حق و عدل پر مبنی ایک نظامِ ریاست وضع کیا ہے جو دین و عقیدہ پر مرتکز ہے، بلغیر اس کے کہ دین و ریاست کی ترقی اور تہذیب

کے نشوونما میں کوئی رکاوٹ بن سکے۔ بلکہ دین تو اس کی ترقی کے سبب سے اہم عوامل میں سے ہے۔ بغداد۔ دمشق۔ قاہرہ۔ قرطبہ اور غرناطہ کی مساجد کے در و دیوار سے علم کی جو شعاعیں پھوٹی تھیں، انہوں نے چار دانگِ عالم کو روشن کر دیا تھا۔

اسلامی تہذیب وُہ واحد تہذیب ہے جو دین کو ریاست سے جُدا نہیں کرتی، لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے امتزاج سے ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہُوئی، جن سے یُورپ قرونِ وسطیٰ میں دوچار ہوا تھا۔ لیکن حکمرانی اس کی ذات کے لیے نہیں بلکہ حق کے قائم رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ بلاشبہ صدرِ ریاست مسلمانوں کا خلیفہ اور امیر ہے اور قانون سازی ماہرینِ شریعت کا کام ہے اور اہلِ علم کے ہر طبقے کے سپرد ایک خاص خدمت ہے۔ لیکن قانون کے سامنے سب برابر ہیں اور فضیلت، تقویٰ اور خدمتِ خلق پر موقوف ہے۔ فاطمہ نامی ایک عورت پر چوری کے جُرم میں مقدمہ قائم ہوتا ہے اور اس کے لیے سفارش کی جاتی ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہو کر فرماتے ہیں "اگر فاطمہ بنتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔" (بخاری و مُسلم) ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

الخلق کلھم عیال اللہ فاحبھم الیہ انفعھم لعیالہ (البزار)

"ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ پس اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وُہ ہے جو اس کے کنبے کو زیادہ فائدہ پہنچائے۔"

یہ وُہ دین ہے جس پر ہماری تہذیب قائم ہُوئی ہے۔ اس میں کسی رئیس، کسی دینی رہنما، کسی خاندانی یا دولت مند آدمی کے لیے کوئی خاص امتیاز نہیں ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۔ (کہف : ۱۱۰)

"کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہُوں۔"

## پانچویں خصُوصیت:

آخر میں اس تہذیب کی جو خصوصیّت قابلِ ذکر ہے وُہ اس کی حیرت انگیز مذہبی

رواداری ہے جو کسی ایسی تہذیب میں نہیں پائی گئی جو دینی بنیادوں پر قائم ہوئی ہو۔ البتہ جو کسی دین اور خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو ممکن ہے کہ وہ تمام مذاہب کو ایک ہی نظر سے دیکھے اور ان کے پیروؤں سے یکساں معاملہ کرے۔ لیکن دین کا جو پیرو اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ اس کا دین حق ہے اور اس کا عقیدہ سب سے زیادہ سچا اور صحیح ہے، پھر اُسے تلوار اُٹھانے، ملک فتح کرنے اور ان پر حکومت چلانے اور عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کا موقع میسر آئے اور پھر بھی اس کا دین و عقیدہ اسے اس بات کی اجازت نہ دے کہ وہ حکمرانی میں جور سے کام لے اور طریق عدالت و انصاف سے منحرف ہو اور لوگوں کو اپنا دین اختیار کرنے پر مجبور کرے، تو اس طرح کا آدمی تاریخ کی عجیب و غریب مخلوق سمجھا جائے گا۔ لہٰذا یہ صورتِ حال کتنی عجیب اور منفرد ہو گی کہ تاریخ میں ایک پوری تہذیب ایسی موجود ہو جو دینی اساسات پر قائم ہو اور انھیں اصولوں پر اس کی تعمیر کی گئی ہو لیکن اس کے باوجود اس نے تاریخ عالم میں سب سے زیادہ رواداری، انصاف اور انسانیت کا رویہ اختیار کیا ہو؟ یہ کارنامہ ہماری اسلامی تہذیب نے سرانجام دیا ہے، اور آئندہ ہم جو تقریریں پیش کریں گے، ان میں اس کی بیسیوں مثالیں آپ کے سامنے آئیں گی۔ ہمارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ ہماری تہذیب اس بارے میں منفرد ہے کہ اس نے قائم تو ایک ہی دین کو کیا ہے لیکن اس کی برکتوں سے جملہ مذاہب مستفید ہوتے رہے ہیں۔

## انقلابات ہیں زمانے کے:

تہذیبوں کی تاریخ میں ہماری تہذیب کے یہ بعض خصائص و امتیاز ہیں، جو پوری دُنیا کے لیے موجبِ حیرت تھے اور ہر مذہب و ملّت کے سنجیدہ اور ذہین اصحاب کے لیے وجہ کشش تھے۔ اس روز یہ تہذیب غالب تھی، حکمران تھی، دُنیا کا رُخ موڑنے والی تھی اور دُنیا کو تعلیم و تربیت دینے والی تھی۔ لیکن جب یہ تہذیب زوال پذیر ہوئی اور اس کے بعد ایک دُوسری تہذیب برپا ہوئی تو ہماری تہذیب

کی قدروقیمت کے بارے میں مختلف رائیں ہوگئیں۔ کسی نے اس پر حقارت کی نظر ڈالی کسی نے اُسے سراہا۔ کوئی اس کے فضائل بیان کرتا ہے اور کوئی اس کی تنقیص میں مبالغہ کرتا ہے۔ مغرب کے پیشہ ور نقاد حضرات ہماری تہذیب کے معاملہ میں اس طرح کے مختلف نقطہ ہائے نظر رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ منصب تو نہیں تھا کہ وہ ہماری تہذیب پر حَکَم اور جج بن کر بیٹھتے اور فیصلے صادر فرماتے، لیکن کیا کیا جائے کہ آج کل انھیں کے ہاتھ میں پیمانے ہیں اور انھیں کی رائیں قبول کی جاتی ہیں۔ وُہ لوگ آج غالب ہیں اور انھیں کے ہاتھ میں عنانِ تہذیب ہے اور جن لوگوں کے بارے میں اور جن کی تہذیب کے بارے میں حکم لگایا جا رہا ہے وُہ ایسے کمزور ہیں کہ طاقتور لوگوں کی للچائی ہُوئی نگاہیں ان پر لگی ہُوئی ہیں تاکہ ان کی رہی سہی پُونجی بھی اُچک لیں اور ان کے ملکوں پر تسلّط جما کر اپنی حرص وآز کی آگ بجھائیں۔ ایک قوی کا ضعیف کے مقابلے میں شاید ہی مؤقف ہوتا ہے کہ وُہ اس کی تحقیر و تنقیص کرتا ہے۔ تاریخ کے ہر دَور میں زبردستوں نے زیردستوں کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے، بجز ہمارے کہ جب ہم طاقتور تھے تو ہم نے قوی اور ضعیف سب کے ساتھ یکساں انصاف کیا ہے، اور افضل کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے خواہ وُہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں۔ عادلانہ حکومت مقاصد کی طہارت اور ضمیر کی استقامت میں ہماری برابری تاریخِ عالم میں کون کر سکتا ہے؟

یہ بات افسوس ناک ہے کہ طاقت والوں نے ہمارے خلاف جو تعصّب روا رکھا ہے اور ہماری تہذیب کے بارے میں جو غیر منصفانہ رائے قائم کی ہے ہم اس سے پوری طرح باخبر نہیں ہُوئے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کی آنکھوں پر یا تو مذہبی تعصّب نے پٹّی باندھ دی ہے۔ اس لیے وُہ مشاہدۂ حق سے عاری ہیں یا ان کے اندر قومی عصبیّت کارفرما ہے اور ان کا قومی غرور انھیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی دُوسری قوم کی فضیلت کا اعتراف کریں۔ لیکن ہماری تہذیب کے معاملے میں اُن کی آرا سے خود ہمارا متاثر ہو جانا ناقابلِ فہم ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہماری قوم کے بعض افراد

کیوں اپنی اس تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جس کے قدموں پہ پوری دُنیا کئی صدیوں پہ جھکی رہی ہے۔

## برسبیلِ تنزل:

جو لوگ ہماری تہذیب کی قدر و قیمت کا استخفاف کرتے ہیں، شاید ان کی دلیل یہ ہو کہ تہذیب جدید کی ایجادات اور علمی فتوحات کے مقابلے میں ہماری تہذیب کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن یہ بات اگر درست بھی ہو تو اس سے ہماری تہذیب کی کمتری دو وجوہ کی بنا پر لازم نہیں آتی۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ہر تہذیب دو عناصر پر مشتمل ہوتی ہے، ایک اخلاقی و رُوحانی عنصر اور دُوسرا مادّی عنصر۔ جہاں تک مادّی عنصر کا تعلق ہے اس میں بلاشبہ بعد میں آنے والی تہذیب سابق تہذیب پر فائق ہوتی ہے۔ زندگی اور اس کے وسائل میں یہ ارتقار قانونِ الٰہی کے مطابق ہے اور یہ بات بالکل عبث ہے کہ مابعد کی تہذیب نے جو کچھ اس پہلو سے حاصل کیا ہے، تہذیب ماقبل سے اس کی توقع کی جائے۔ اگر یہ جائز ہوتا تو پھر ہمارے لیے یہ جائز ہوتا کہ ہم اپنے سے پہلے کی تمام تہذیبوں کو بنظرِ تحقیر دیکھتے، کیونکہ ہماری تہذیب نے بھی بے شمار ایسے وسائلِ حیات اور مظاہرِ تہذیب ایجاد کیے ہیں جن سے گذشتہ تہذیبیں ہرگز آشنا نہ تھیں۔ پس مادی عنصر تہذیبوں کے مابین کسی دائمی و ابدی فضیلت کے لیے کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔

باقی رہا اخلاقی و رُوحانی عنصر تو یہی وُہ خصوصیت ہے جو تہذیب کو جاوداں بناتی ہے اور جس کی وساطت سے انسانیت خوش بختی سے ہم کنار ہوتی ہے اور خطرات و آلام سے محفوظ رہتی ہے۔ اس میدان میں ہماری تہذیب سابق و لاحق تہذیب سے بازی لے گئی ہے اور اس منزل تک جا پہنچی ہے جس کی نظیر تاریخ کے کسی دَور میں نہیں ملتی۔ ہماری تاریخ کو زندہ و جاوید بنانے کے لیے ایک امر کافی ہے۔ تہذیب کی اصل غرض و غایت یہی ہے کہ انسان برکت و سعادت کی

بلندی تک پہنچے اور اس مقصد کے لیے ہماری تہذیب نے جو خدمت سرانجام دی ہے وہ مشرق و مغرب میں کسی دُوسری تہذیب نے انجام نہیں دی ہے۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ تہذیبوں کے مابین موازنہ صرف مادّی معیارات کے بل پر نہیں کیا جاتا۔ ظاہری ساز و سامان اور مادّی یادگاریں مقابلے کے لیے صحیح بنیاد نہیں ہیں۔ پُر تکلّف کھانا پینا اور ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرنا تہذیبی فوقیت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس معاملے میں فضیلت کا صحیح پیمانہ یہ ہے کہ ایک تہذیب نے تاریخ انسانی پر کس طرح کے اثرات چھوڑے ہیں۔ لڑائیوں اور سلطنتوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کے درمیان بھی مقابلہ اس بنا پر نہیں کیا جاتا کہ کس سلطنت کا رقبہ زیادہ ہے یا کس لڑائی میں زیادہ سپاہی شریک ہوئے۔ تاریخِ قدیم اور زمانۂ وسطیٰ میں جو جنگیں لڑی گئی ہیں اگر اُن کا مقابلہ دُوسری جنگِ عالمگیر کے ساتھ تعدادِ جیوش اور وسائلِ حرب کے اعتبار سے کیا جائے تو وہ لڑائیاں اس جنگ کے سامنے ہیچ نظر آتی ہیں۔ لیکن وُہ پُرانی لڑائیاں بھی بڑی اہمیت اور تاریخی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ کیونکہ ان کے نہایت دُوررس نتائج تاریخِ انسانی پر مترتب ہوئے ہیں کانی (Cannae) کی لڑائی جس میں کارتھیج کے مشہور و معروف سپہ سالار ہنی بال نے رُومیوں کو شکستِ فاش دی تھی، وُہ ان لڑائیوں کی فہرست میں شامل ہے جنھیں اب تک یورپ کے مدارسِ حربیہ میں پڑھایا جاتا ہے۔

خالد بن ولید نے عراق و شام کی فتح میں جو معرکے سرانجام دیے ہیں، مغربی فنونِ حرب کے ماہرین اب تک اُن کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ان پر اظہارِ حیرت کر رہے ہیں اور یہ معرکے ہماری جنگی فتوحات کی تاریخ کے زرّیں ابواب ہیں۔ کانی، بدر، قادسیہ اور حطین کی لڑائیاں قدیم ہونے کی بنا پر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتیں کیونکہ یہ تاریخِ انسانی کے سنگ ہائے میل ہیں۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد مجھے یقین ہے کہ اب نگاہیں ہماری تہذیب کے ان جلوؤں کا مشاہدہ کرنے کے لیے اُٹھ گئی ہوں گی جو کہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں

اگرچہ کما حقہ بحث جیسی کہ میں چاہتا تھا یہاں نہیں کی جاسکتی۔ میرے لیے اب اتنا کافی ہے کہ میں آئندہ تقاریر میں اپنی تہذیب کے دلکش پہلوؤں کو پیش کروں اور ان سے اس تہذیب کی جاودانیت کے حق میں استدلال کروں جسے اس اُمت نے استوار اور مستحکم کیا ہے، جو احکم الحاکمین کے دربار سے ایک ایسی "خیر اُمت" کا خطاب حاصل کر چکی ہے جو لوگوں کی اصلاح کے لیے میدان میں لائی گئی۔

## دُوسرا باب

# ہماری تہذیب کے تاریخی آثار

# ہماری تہذیب کے تاریخی آثار

ہم نے گذشتہ تقریر میں اپنی تہذیب کی چند نمایاں خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ تہذیبیں تاریخِ انسانی میں فکری، اخلاقی اور مادی اعتبار سے جتنے زیادہ جاودانی اثرات چھوڑتی ہیں اتنا ہی زیادہ خلود اور دوام انھیں حاصل ہوتا ہے۔ ہماری تہذیب نے انسانی ترقی کی تاریخ میں ایک عظیم الشان کردار ادا کیا اور عقائد و نظریات، علم و فن، حکومت، فلسفہ اور ادب کے میدانوں میں نہایت دُور رس اثرات اور مستحکم یادگاریں چھوڑی ہیں۔ آئیے دیکھیں کہ وہ آثار اور یادگاریں کیا ہیں اور ان کی اہمیت کیا ہے؟

ہم اپنی تہذیب کے زندۂ جاوید آثار کو پانچ بڑی اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

## ۱۔ عقیدہ و دین:

اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی کا نہایت گہرا اثر یورپ کی اُن اصلاحی تہذیبوں پر پڑا ہے جو ساتویں صدی عیسوی سے لے کر عہدِ جدید تک وہاں اُٹھتی

رہی ہیں۔ اسلام ہی وُہ دین ہے جس نے اللہ کی وحدانیت کا درس دیا اور بتایا ہے کہ اس کی حاکمیت و اقتدار میں کوئی شریک نہیں، اور وُہ حیم، ظلم اور نقص سے منزہ ہے۔ اسلام نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ انسان کو اللہ کی بندگی کرنے، اس سے تعلق پیدا کرنے اور اس کے قوانین کو سمجھنے کے لیے پجاریوں، بابا ڈیوں کی طرح کے کسی طبقہ کو واسطہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اقوام کے ذہنوں کو کھولنے اور ان محکم اصولوں تک ان کی رہنمائی کرنے میں اسلام نے ایک زبردست عامل کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ اس سے پہلے قومیں ایک شدید قسم کے مذہبی استبداد اور پیشوائیت کے تسلط میں جکڑی ہوئی تھیں۔ جس نے ان کے افکار و آراء پر بند باندھ رکھے تھے، اور ان کے جسم اور مال کو اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا۔ اسلام کو شرق و غرب میں جو فتوحات نصیب ہوئیں، اس کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ آس پاس کی قومیں سب سے پہلے اسلام کے عقائد و نظریات سے متأثر ہوں، اور واقعہ میں یہی کچھ ہوا بھی۔ چنانچہ ساتویں صدی عیسوی میں یورپ کے اندر ایسے ریفارمر اُٹھے جو بُت پرستی اور تصویر پرستی کے مخالف تھے۔ بعد میں ایسے لوگ اُٹھے جنھوں نے اللہ اور اس کے بندوں کے مابین انسانوں کو وسیلہ بنانے سے انکار اور پادریوں اور پاپاؤں سے بے نیاز ہو کر کتبِ مقدسہ کے افہام و تفہیم کی دعوت دی۔ بہت سے محققین نے پورے زور کے ساتھ کہا ہے کہ مارٹن لوتھر اپنی اصلاحی تحریک میں فلاسفۂ عرب اور علمائے مسلمین کے دینی عقائد سے متأثر تھا۔ ایک مدت سے حکمائے اسلام کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی میں ہو چکا تھا اور لوتھر کے عہد میں یورپ کی یونیورسٹیاں تعلیم و تدریس میں ان پر انحصار و اعتماد کرتی تھیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فرانسیسی انقلاب میں، مذہب اور ریاست کے درمیان علیحدگی کی جو تحریک اُٹھی تھی وُہ ان زبردست فکری تحریکات کی پیداوار تھی جو تین سو سال بلکہ اس سے زیادہ عرصے تک پورے یورپ پر چھائی رہیں اور صلیبی جنگوں اور اندلس کے واسطے سے ہماری تہذیب نے ان تحریکوں پر اپنا اثر ڈالا تھا۔

## ۲۔ علوم و فلسفہ :

طِب، ریاضیات، کیمیا، جغرافیہ اور فلکیات کے میدان میں بھی ہمارے تہذیبی اثرات نمایاں ہیں۔ یورپ میں جو علمی بیداری پیدا ہُوئی وُہ اس درس و تدریس کا نتیجہ تھی۔ جیسے اہلِ یورپ نے ہمارے علماء و حکماء کے سامنے اشبیلیہ، قرطبہ اور غرناطہ کی مساجد میں زانوئے ادب تہ کر کے حاصل کیا تھا۔ مغرب کے طالبین علم جب ہماری تعلیم گاہوں میں وارد ہوتے تو انھیں سخت تعجب ہوتا کہ ہر متنفّس کے لیے ان علوم و فنون کے دروازے کھلے ہیں۔ اور ہر شخص آزاد فضا میں پُورے شغف و انہماک کے ساتھ ان علوم و فنون سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی مثال اُن کے اپنے ملک میں موجُود نہ تھی۔ جس وقت ہمارے علماء اپنے حلقوں اور اپنی تالیفات میں زمین کی گردش، اس کی گولائی اور اجرامِ سماویہ کی حرکت پر بحث کرتے تھے، اس وقت اہلِ یورپ کے دماغ ان مسائل سے متعلق اوہام و خرافات سے بھرے ہُوئے تھے۔ یہیں سے عربی کتب کے لاطینی میں تراجم کی تحریک شروع ہُوئی اور ہمارے علماء کی تصانیف یورپ کی یُونیورسٹیوں میں پڑھائی جانے لگیں۔ ابنِ سینا کی طب پر "القانون" کا ترجمہ بارھویں صدی میں ہُوا۔ رازی کی تصنیف "الحاوی" کا ترجمہ تیرھویں صدی کے اواخر میں ہُوا جو ابنِ سینا کی "القانون" سے زیادہ مفصّل اور ضخیم ہے۔ سولہویں صدی تک یورپ کی یُونیورسٹیوں میں علمِ طب کا انحصار انھیں دو کتابوں پر تھا۔ جہاں تک کتبِ فلسفہ کا تعلق ہے، تو ان کی تعلیم و تدریس اس سے زیادہ عرصے تک جاری رہی اور یورپ نے فلسفہ یونان سے، تعارف ہماری تالیف و تراجم ہی کے ذریعے سے حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مغربی مصنّفین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں کم از کم چھ سو سال تک ہم یورپ کے اُستاد رہے ہیں۔

فاضل گستاولی بان کہتے ہیں "عام عربی کتب اور بالخصوص علمی تصانیف پانچ چھ سو سال تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں تقریبًا واحد ماخذ تدریس رہی ہیں۔ اور

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض علوم مثلاً علم طب میں عربوں کے اثرات اب تک ہمارے ہاں کام کر رہے ہیں۔ ابن سینا کی کتابوں کی تشریح گذشتہ صدی کے اواخر میں مونپلیہ میں کی گئی ہے۔ یہی عالم مزید لکھتے ہیں" روجر بیکن، لیونارڈ، ارنو فیلیفونی، ریمون لول، سان تھوما، البرٹ اور الفانسو دہم قشتالی نے فقط عربی کتب پر انحصار کیا ہے اور موسیو رینان کہتے ہیں" البرٹ دی اعظم ابن سینا کا ممنونِ احسان ہے اور سان تھوما فلسفہ میں ابن رشد کا رہینِ منت ہے" مشہور مستشرق سیدیو لکھتے ہیں" قرونِ وسطیٰ میں وہ صرف عرب ہی تھے جو تہذیب کے علمبردار تھے"۔ شمالی قبائل نے جس یورپ کو غارت اور پامال کر دیا تھا، اس کے وحشی پن کو عربوں ہی نے زائل کیا۔ عربوں نے یونان کے فلسفۂ قدیم تک رسائی حاصل کی اور صرف اس کی معرفت اور اکتساب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے وسعت دی اور مطالعۂ کائنات کے نئے ابواب کو وا کیا، نیز موصوف کہتے ہیں کہ" عربوں نے جب علم ہیئت میں مہارت حاصل کی تو علومِ ریاضیہ کو اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا۔ چنانچہ اس میں انہیں کمال حاصل ہو گیا اور اس میدان میں وہ فی الحقیقت ہمارے استاد تھے"۔ وہ کہتے ہیں کہ ابتدائی دور میں لاطینیوں نے عربی سے جو کچھ لیا، ہم جب اس کی تلاش کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جربرٹ سلفسٹر دوم کے نام سے ایک دروازہ بن جاتا ہے، جس کے ذریعے سے سنہ ۹۷۰ء اور سنہ ۹۸۰ء کے درمیانی عرصے میں وہ تمام علوم یورپ میں داخل ہو جاتے ہیں جو اس نے اندلس میں حاصل کیے تھے، اور انگریزی فاضل ادیلاڈ سنہ ۱۱ء اور سنہ ۱۲۰ء کے درمیان اندلس اور مصر کا دورہ کرتا ہے اور عربی زبان سے اقلیدس کی کتاب "الارکان" کا ترجمہ کرتا ہے جس سے اس وقت تک پورا مغرب نابلد تھا، ایک عالم افلاطون تیفولی، تھیوڈیسیوس کی کتاب "الاکر" کا عربی سے ترجمہ کرتا ہے۔ روڈلف بروجی عربی سے بطلیموس کا معمورۂ ارض کے متعلق تصنیف کردہ جغرافیہ کا ترجمہ کرتا ہے۔ لیونارڈ بیزی نے سنہ ۱۲۰ء کے قریب الجبرے میں ایک رسالہ لکھا ہے جو اس نے عربوں سے سیکھا تھا۔ کمپانوس نبوی نے تیرھویں صدی میں عربی میں مرتبہ کتاب اقلیدس کا بہترین ترجمہ کیا ہے۔

نیز اس صدی میں فیبنلون پولونی نے حسن بن ہیثم کی کتاب "البصریات" سے استفادہ کر کے فلکیات کا علم مغرب میں پھیلایا۔ ۱۲۵۰ء میں از فونش قشتقالی نے فلکی زیچ شائع کرنے کا حکم دیا، جو اسی کے نام سے ہے۔ اس دور میں ایک طرف راجر اوّل نے صقلیہ میں عربی علوم و فنون، خصوصاً ادبی کی کتابیں پڑھنے کا حکم دیا اور دوسری طرف فریڈرک ثانی نے علوم و آداب کے سیکھنے پر حد سے زیادہ زور دیا۔ ابن رشد کے بیٹے ہر وقت اس کے دربار میں رہتے تھے اور اسے نباتات و حیوانات کی طبعی تاریخ کی تعلیم دیتے تھے۔ ہومبلڈ سائنس سے متعلق اپنی کتاب میں لکھتا ہے "وہ عرب ہی ہیں جنھوں نے سب سے پہلے کیمیادی دواسازی کا طریق ایجاد کیا اور اس باب میں ہمارے ہاں اننہا محکم مشورے اور تجربات عربوں ہی سے آئے جو سالرم کے مدرسے نے لیے اور وہاں سے ایک عرصہ بعد جنوب یورپ میں پھیلے۔ پھر دواساز اور طبعی عناصر جن پر معالجہ کا دارومدار ہے، نباتات اور کیمیا کے مطالعہ کا باعث بنے۔ یوں یہ دونوں کام بیک وقت اور دو مختلف طریقوں سے ہوتے رہے اور اس طرح عربوں کے ذریعے اس علم کے نئے دور کا فتح باب ہوا۔ دنیائے نباتات میں عرب کی وسعت معلومات کے ثبوت کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے "ذلیقوریدس" کی جڑی بوٹیوں پر دو ہزار نباتات کا اضافہ کیا۔ ان کی دواسازی میں کئی ایسی جڑی بوٹیاں تھیں جن کی یونانیوں کو ہوا بھی نہ لگی تھی۔ سیدیو، رازی اور سینا کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ دونوں اپنی کتابوں کی وجہ سے پورے یورپ کے مدارس پر عرصہ دراز تک چھائے رہے۔ خصوصیت سے ابن سینا جو یورپ میں ایک طبیب کی حیثیت سے متعارف ہوئے، پورے چھ سو سال تک یورپ کے مدارس پر ان کا سکہ جاری رہا۔ ان کی کتاب "القانون" کا پانچ جلدوں میں ترجمہ ہوا اور کئی دفعہ چھپا، کیونکہ فرانس اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کا دارومدار اسی پر تھا۔

---

## ۳- لُغت و ادب :

اہلِ مغرب اور بالخصوص اسپین کے شعراء عربی ادب سے بہت زیادہ متاثر ہُوئے ہیں۔ مغربی ادب میں شہسواری، شجاعت، مجاز و استعارہ، اور عمدہ اور اچھوتے مضامین اندلس کے عربی ادب کے راستے سے داخل ہُوئے ہیں۔ اسپین کا مشہور اہلِ قلم ابانیز لکھتا ہے "عربوں کے اندلس میں داخلے اور جنوبی یورپ میں ان کے اصطبل گھوڑوں اور سواروں کے پھیل جانے سے قبل یورپ، فنِ شہسواری اور آدابِ مردانگی سے آشنا نہیں تھا۔ رزدزی نے اسلام کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس میں اس نے ہسپانوی انشاء پرداز الغارو کا ایک اسلہ نقل کیا ہے جس میں اس نے اہلِ یورپ کی لاطینی زبان سے بے پروائی اور عربی زبان سے شغف پر شدید افسوس کا اظہار کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مغربی ادبا عربی علم و ادب سے کس درجہ متأثر تھے۔ وُہ کہتا ہے "ذہین اور صاحبِ ذوق اصحاب پر عربی ترانوں کا جادو اثر کر چکا ہے" پس وہ لاطینی کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں اور دُوسری زبانوں کو چھوڑ کر اربابِ اقتدار کی زبان لکھتے ہیں۔ ہمارے ایک وطنی حمیت سے سرشار معاصر نے اس پر سخت اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے عیسائی بھائی عربی اشعار اور قصص پر فریفتہ ہو گئے ہیں اور ان کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جنہیں مسلمان فلاسفہ اور فقہاء نے لکھا ہے۔ یہ مطالعہ وہ ان کتابوں کی تغلیط و تردید کے لیے نہیں کرتے بلکہ فصیح عربی اسلوب سیکھنے کی غرض سے کرتے ہیں۔ مذہبی لوگوں کے سوا آج کون ہے جو تورات و انجیل کی تفاسیر کا مطالعہ کرتا ہے؟ آج کون ہے جو اناجیل و انبیاء و رُسل کے صحیفوں کی قرأت کرتا ہے؟ افسوس کہ عیسائیوں کی جدید ذہین نسل عربی ادب اور عربی زبان کے ماسوا کسی زبان اور کسی لٹریچر کو اچھا نہیں سمجھتی۔ یہ لوگ عربوں کی کتابوں سے دلچسپی اخذ کرتے ہیں۔ ان کتابوں پر مشتمل

بیش قیمت لائبریریاں جمع کرتے ہیں اور ہر جگہ عربی ذخائر کی تعریف و توصیف کے گیت گاتے ہیں۔ جب وہ مسیحی لٹریچر کے بارے میں سُنتے ہیں تو اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ شے لائقِ التفات نہیں ہے۔ ہائے افسوس! عیسائی اپنی زبان بُھلا چکے ہیں۔ ان میں آپ ایک فی ہزار بھی نہیں پائیں گے جو اپنے دوست کو اپنی زبان میں خط لکھے۔ لیکن جہاں تک عربی کا تعلق ہے کتنے ہی لوگ ہیں جو اس کے بہترین اسٹائل میں اظہارِ خیال کرتے ہیں، اور اس میں ایسے اشعار نظم کرتے ہیں جو خود شعرائے عرب کے کلام پر بھی صحت و بلاغت کے لحاظ سے فائق ہیں۔"

چودھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد یورپ میں متعدد نامور ادیب ایسے گذرے ہیں جن کے ادب و انشاء پر عربی ادب کا مستقل اثر رہا ہے ۱۳۴۹ء میں بوکاشیو نے "اپنے افسانے" "دس صبحیں" کے نام سے لکھے ہیں جن میں الف لیلہ کا تتبع کیا ہے۔ شیکسپیئر نے اپنے ایک ڈرامے کا موضوع یہیں سے اخذ کیا ہے، اور جرمنی کے ڈرامہ نویس لسنگ نے اپنے ڈرامے "ناتان حکیم" کا پلاٹ بھی وہیں سے مستعار لیا ہے۔ انگریزی میں جدید شعر و شاعری کے بانی چاسر نے بوکاشیو کے ہاں سے سب سے زیادہ اکتسابِ فیض کیا ہے۔ دونوں کی اٹلی میں ملاقات ہوئی تھی اور اس کے بعد چاسر نے اپنی مشہور حکایات "کنٹربری ٹیلز" لکھیں۔ اسی طرح ڈانٹے کی مشہور نظم "ڈیوائن کامیڈی" جس میں اس نے ایک دوسرے عالم کے سفر کی داستان بیان کی ہے، اس کا یہ خیال ہے کہ اس کو لکھتے وقت ابوالعلاء المعرّی کے رسالہ "غفران" اور ابنِ عربی نے جو کچھ جنّات کے متعلق لکھا ہے، اس کے اثرات ڈانٹے کے ذہن پر کام کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ امپیرر فریڈرک ثانی کے عہد میں صقلیہ میں اقامت پذیر رہا تھا۔ یہ بادشاہ ثقافت کا شیدائی تھا اور عربی ہی میں تہذیبی لٹریچر کے مطالعہ کا شائق تھا اور ان دونوں کے مابین ارسطو کے نظریات پر مذاکرات ہوا کرتے تھے۔ ان کا ذریعہ معلومات عربی کتابیں تھیں۔

ڈانٹی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ، قصۂ معراج و اسراء، اور آسمانوں سے متعلق جو تفصیلات روایات میں بیان ہوئی ہیں، ان سے واقف تھا۔

پیٹر آف یارک کا عہدِ حیات وہ ہے جبکہ عربی ثقافت اٹلی اور فرانس میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے مونپلیا اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی اور یہ دونوں درس گاہیں اندلس کی یونیورسٹیوں کے فاضل اصحاب نے قائم کی تھیں۔ اور ان میں عربی مؤلفات پڑھائی جاتی تھیں۔ قرونِ وسطیٰ میں عربوں کے ہاں جو قصص و حکایات رائج تھے، یورپ نے نشاۃِ ثانیہ میں ان سے اثر قبول کیا ہے۔ ان میں "مقامات مردانگی" شہسواری کی داستانیں اور وہ کارنامے شامل ہیں جو مشاہیر عرب نے محبت و عظمت کی خاطر سرانجام دیے تھے۔ اس سلسلہ میں الف لیلیٰ کے جو تراجم یورپ کی زبانوں میں بارھویں صدی میں ہوئے ان کا اثر نہایت نمایاں طور پر ہوا ہے۔ اب تک جملہ یورپی زبانوں میں اس کتاب کے تین سو سے زائد ایڈیشن نکل چکے ہیں، حتیٰ کہ یورپ کے متعدد ناقدین کا یہ خیال ہے کہ سوفٹ کا سفر نامہ، ڈیفو کا سفرنامہ رابنسن کروسو دونوں الف لیلیٰ، اور عرب فلسفی ابنِ طفیل کی تصنیف "حی بن یقظان" کے رہینِ منت ہیں۔ کوئی شخص اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ الف لیلیٰ کی کثرتِ اشاعت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اہلِ یورپ نے اس کتاب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اور اس سے متاثر ہوئے ہیں۔

یہاں اس بات کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے، کہ یورپ کی مختلف بانوں میں ضروریاتِ زندگی سے متعلق بہت سے عربی الفاظ تقریباً اپنی اصل شکل میں رائج ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی کاٹن، سفس مسک، لیمن، زیرو، دراصل عربی کے قطن، حریر، مشقی، مسک، لیموں اور صفر ہیں۔ اسی طرح اور بے شمار الفاظ بھی ہیں۔ اس سلسلہ میں تفصیل میں جائے بغیر یہاں مسٹر مائیکل کا قول نقل کر دینا ہی کافی ہے "یورپ اپنے ادب لطیف میں عربی ممالک کا ممنونِ احسان ہے۔ اسی طرح قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں جو روحانی اور فکری انقلاب آیا تھا، اس کی پشت پر جو قوتیں کارفرما

تھیں، انھیں بروئے کار لانے میں بھی عربی اقوام کا بہت بڑا دخل تھا۔"

## ۴۔ قانون سازی :

یورپ کے طلبہ جو اندلس کے اسلامی مدارس میں زیرِ تعلیم تھے، انہوں نے مسلمانوں کے بہت سے فقہی اور تشریعی لٹریچر کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ اس وقت یورپ کے ممالک میں کوئی مستحکم سیاسی نظام نہ تھا اور نہ کسی قسم کے منصفانہ قوانین رائج تھے۔ مصر کو جب نپولین نے فتح کیا تو مالکی فقہ کی مشہور کتابیں فرانسیسی میں ترجمہ کی گئیں۔ سب سے پہلے "کتابِ خلیل" کا ترجمہ ہوا جس نے فرانس کے قانون کے لیے بیج کا کام دیا چنانچہ اس وقت کا فرانسیسی قانون بڑی حد تک فقہ مالکی کے مشابہ تھا۔ سیدیو کہتے ہیں "ہماری نظر خاص طور پر جا کر مذہب مالکی پر ٹھہرتی ہے کیونکہ افریقہ کے ساتھ ہمارے روابط رہے ہیں اور فرانسیسی حکومت نے ڈاکٹروں، پیروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ خلیل بن اسحاق بن یعقوب (المتوفی ۱۴۲۲ء) کی مختصر فقہی کتاب کا ترجمہ فرانسیسی میں کریں۔

## ۵۔ حکومت و سلطنت :

زمانہ قدیم و متوسط میں عوام کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے حکام کے اعمال کا محاسبہ کریں۔ حاکم و محکوم کا تعلق آقا و غلام کی طرح تھا۔ حاکم مطلق العنان ہوتا تھا اور رعایا کے ساتھ جو چاہتا تھا سلوک کرتا تھا۔ مملکت ایک موروثی جائداد سمجھی جاتی تھی جو دوسرے اموال کی طرح ورثہ میں منتقل ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک شہزادی اگر تخت کی وارث ہوتی تھی اور اس کی شادی دوسری مملکت میں ہو جاتی تھی تو دونوں سلطنتوں میں تخت و تاج میں حصہ داری کے مسئلے پر جنگ چھڑ جاتی تھی۔

پھر و فریقین کے درمیان اگر لڑائی ہوتی تھی تو غالب فریق کے لیے مغلوب کی جان و مال، عزت و ناموس اور آزادی ہر شے مباح تھی۔ یہ حالت بدستور ایک مدت تک قائم رہی حتیٰ کہ اسلامی تہذیب کا دور دورہ ہوا، اور اس نے

دُوسرے اصولوں کے ساتھ اس کا بھی اعلان کیا کہ قوم اپنے حکمرانوں کے اعمال پر تنقید و محاسبہ کا حق رکھتی ہے، اور ارباب حکومت محض امین و اجیر ہیں جن کا کام بس یہ ہے کہ وُہ امانت و دیانت کے ساتھ قوم کے مفادات کی نگرانی کریں۔ چنانچہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ یہ صورت پیش آئی کہ محکوم نے حاکم سے برسرِ مجلس یہ پوچھا جو لباس اس نے پہن رکھا ہے وُہ کہاں سے آیا ہے؟ اور حاکم نے اس شخص کو نہ پھانسی کی سزا دی، نہ اسے قید میں ڈالا اور نہ جلا وطن کیا بلکہ حاکم نے اپنی صفائی پیش کی اور پوزیشن واضح ہو جانے پر سائل اور دُوسرے سب لوگ مطمئن[1] ہو گئے۔

تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ واقعہ بھی رُونما ہُوا کہ رعایا کے افراد میں سے ایک نے صدرِ ریاست کو یُوں مخاطب کیا "السلام علیکم، اے اجیر!" اس پر امیر نے تسلیم کیا کہ وُہ اجیر ہے اور ایک اُجرت پر کام کرنے والے کی طرح اخلاص کے ساتھ قوم کی خدمت کرنا اور

---

[1] : اشارہ ہے اس مشہور واقعہ کی طرف کہ ایک دن حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ "لوگو! سنو، جو میں تم سے کہہ رہا ہُوں اور اطاعت کرو" کہ بھرے مجمع میں سے ایک اعرابی اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ "ہم نہ سُنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے تاوقتیکہ آپ اس کا جواب نہ دیں کہ آپ کے بدن پر یہ کُرتا جس کپڑے کا ہے وُہ اتنا تو نہ تھا کہ آپ کے قد کے لحاظ سے اس میں یہ لباس آپ کا بن جاتا۔ کیونکہ یہ وُہ کپڑا ہے جو مالِ غنیمت میں آیا تھا اور ہم سب کو برابر تقسیم ہُوا تھا، اور آپ کے حصہ میں اتنا ہی آیا تھا، جتنا کہ ہم کو ملا تھا، پھر اتنے میں یہ کُرتا کیسے بن گیا؟"

حضرت عمرؓ نے اس کا جواب دینے کے لیے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ کی طرف دیکھا اُنہوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں نے اپنے حصہ کا کپڑا بھی ان (حضرت عمرؓ) کو دے دیا تھا، یُوں دونوں کے حصے ملا کر یہ کُرتا تیار ہُوا ہے۔ جواب سُن کر اس اعرابی نے کہا کہ "ہاں اب فرمائیے ہم سُنیں گے اور اطاعت کریں گے۔"

خیر خواہی کے ساتھ امانت کا حق ادا کرنا اس کا فرض ہے۔ اسلامی تہذیب نے اس اصول کا اعلان کیا اور عملاً اسے نافذ و منطبق کر کے دکھایا۔

یہ حریت فکر و ضمیر کی رُوح تھی جو ان تمام اقوام میں پھونکی گئی جو اسلامی معاشرے کے گرد و نواح میں آباد تھیں۔ ان سب نے آہستہ آہستہ کروٹ لی، متحرک ہوئیں، آمادۂ انقلاب ہوئیں اور آخر کار اپنے بندھنوں سے آزاد ہو کر رہیں۔ پورے یورپ میں یہی کچھ ہو کر رہا۔ صلیبی لڑائیوں کے دوران یورپ کے لوگ بلادِ شام میں داخل ہوئے اس سے پہلے وُہ اندلس کی خلافت میں اس بات کا مشاہدہ کر چکے تھے کہ عوام حکّام پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، اور حکّام کسی غیر کے سامنے نہیں، صرف اپنی قوم کے سامنے جوابدہ ہیں۔ یورپ کے حکمرانوں نے دیکھا کہ مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر دور اور ہر زمانے میں دشمنانِ اسلام اور ان کے حکّام کسی خاص فرد یا طبقے کے ماتحت ہونے کے بجائے پُوری قوم کے سامنے مسئول ہیں اور اس کے برعکس وُہ رومن امپیریہ کے ماتحت ہیں اور جب تک وُہ روم کی دینی سیادت کو تسلیم نہ کریں تو آئے دن انھیں ناکامی و نامرادی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب یہ حکمران اپنے ملکوں میں واپس لوٹے تو انھوں نے رومی اقتدار کے خلاف بغاوت کی حتّٰی کہ اس سے آزاد ہو گئے اور اس کے بعد ان بادشاہوں کے خلاف ان کے اپنے ہم قوموں نے بغاوت کی، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی گردنیں چھڑا لیں۔ انقلابِ فرانس اس کے بعد وقوع پذیر ہوا ہے اور اس نے کسی ایسے نئے اصول کا اعلان نہیں کیا، جس کا اعلان بارہ سو سال پہلے ہماری تہذیب نہ کر چکی ہو۔

ہماری تہذیب نے جنگ کے سلسلے میں جن اصولوں کا اعلان کیا تھا وُہ یہ ہیں کہ عہد و پیمان کا احترام کیا جائے، عقائد میں آزادی دی جائے، عبادت گاہوں کو اہلِ عبادت کے پاس رہنے دیا جائے، لوگوں کی شخصی آزادی اور عزّت و ناموس پر دست درازی نہ کی جائے جس کے نتیجہ میں اسلامی حکومت کے تحت آنے والی اقوام کے اندر عزّت و خود داری کی رُوح پیدا ہوئی اور ان کے اندر

شرافت و انسانیت کا جوہر بیدار ہوا۔ چنانچہ تاریخ نے پہلی مرتبہ یہ منظر دیکھا کہ غیر مسلم رعایا کا ایک فرد رئیسِ مملکت کے پاس جا کر شکایت کرتا ہے کہ آپ کے گورنر کے لڑکے نے میرے لڑکے کے سر پر ناحق کوڑے لگائے ہیں۔ صدرِ مملکت یہ سُن کر غضب ناک ہو جاتے ہیں، گورنر کے بیٹے سے محاسبہ کرتے ہیں اور اس سے قصاص لیتے ہیں۔ پھر گورنر کو سختی سے ڈانٹتے ہیں اور تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا ہے حالانکہ اُن کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا"[۵]

یہ ایک نئی رُوح تھی جو ہماری تہذیب کے طفیل اقوام و افراد میں پھونکی گئی، ورنہ جس والد نے یہ شکایت کی تھی اُسے ہماری حکومت اور تہذیب سے قبل مارا پیٹا جاتا تھا، اس کا مال لُوٹا جاتا تھا اور عقائد کے معاملے میں اس پر زبردستی کی جاتی تھی، مگر بغاوت کرنا تو درکنار وہ احتجاج اور اظہارِ غم و الم بھی نہ کر سکتا تھا، بلکہ عزّتِ نفس کا احساس تک بھی اس کے اندر نہیں پایا جاتا تھا، جب ہماری تہذیب کا آفتاب اس پر طلوع ہوا تو اس کی آواز بلند ہوئی اور اس نے امیر المؤمنین سے مخاطب ہو کر کہا: "میں اللہ سے آپ کے ظلم کے خلاف پناہ طلب کرتا ہوں"۔ یہ ظلم کیا تھا؟ نہ خون ریزی تھی، نہ آبرو ریزی تھی، نہ مذہب کے معاملے میں جبر تھا، نہ جائداد کا غصب تھا، فقط اتنی سی بات تھی کہ ایک لڑکے نے دُوسرے لڑکے کو دو چابک مار دیے تھے۔

اہلِ مغرب کا ہماری تہذیب سے تعارف قرونِ وسطیٰ میں شام اور اندلس کے واسطے سے ہوا۔ اس سے پہلے بادشاہ دینی پیشواؤں کے خلاف اور عوام بادشاہوں کے خلاف دم نہیں مار سکتے تھے۔ انھیں اس امر کا علم و احساس بھی

---

۵: یہ صدرِ مملکت حضرت عمرؓ تھے اور شکایت لے کر پہنچنے والا یہودی تھا اور گورنر کے جس لڑکے کے خلاف اس نے شکایت کی تھی وُہ حضرت عمرو بن العاص گورنر مصر کے صاحبزادے تھے

نہ تھا۔ حاکم کا محاسبہ یا مظلوم کی امداد ان کا ایک بنیادی حق ہے۔ ان کا حال تو یہ تھا کہ مذہب و عقیدہ میں اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کو اس طرح ذبح کر دیتے تھے جس طرح قصاب بکرے کو ذبح کرتا ہے، جب اُنھیں ہم سے واسطہ پڑا تو اُن میں بیداری و حریّت کا جذبہ پیدا ہوا۔ جس نے بالآخر انھیں آزاد کرایا۔ کیا اس کے بعد بھی آزادی و انسانیت اور حریّتِ عمل کے سلسلہ میں ہماری تہذیب نے جو پارٹ ادا کیا ہے اور اس کا انکار ناممکن ہے؟ یہ اگر زندگی کے پانچ مختلف بڑے بڑے شعبوں میں ہماری تہذیب کے چند دائمی آثار ہیں۔ قوموں اور تہذیبوں کی زندگی میں یہ نمایاں ترین مظاہر ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری تہذیب نے جن اقوام میں آزادی کی لہر دوڑائی ہے وہ ہماری ممنونِ احسان ہیں۔ مگر ہم احسان کا بدلہ جھوٹے تفاخر اور باطل تمناؤں کے ذریعے نہیں لینا چاہتے، صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اندر خود شناسی پیدا ہو تاکہ ہم اپنی تہذیب کی قدر و قیمت اور اپنے ورثے کی اہمیت سے آگاہ ہوں اور دوبارہ ہم میں اس "اُمّتِ وسط" بننے کی صلاحیت پیدا ہو، جو دنیا میں شہادتِ حق کا فریضہ سرانجام دے اور اہلِ دُنیا کو بھلائی، سچائی اور شرافت کی راہ دکھائے، اور اللہ نے چاہا، تو توقع ہے کہ ہم ایسا کر سکیں گے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ

# تیسرا باب

# انسان دوستی

# انسان دوستی

ہماری غیر فانی تہذیب اور اس کے آثار پر بحث کرنے والے کسی شخص کے لیے اس تہذیب کی ایک ایسی خصوصیت سے صرف نظر ممکن نہیں، جس میں وہ تمام دوسری تہذیبوں سے ممتاز ہے۔ یہ محبت انسان کی صفت ہے۔ ہماری تہذیب نے نوعِ بشری کو نفرت، کینہ، تفرقہ اور تعصب سے نجات دے کر اسے محبت، فیاضی تعاون اور مساوات کا سبق سکھایا ہے۔ اسلامی قانون اور اسلامی اصولِ معاشرت کے مطابق نسلی، طبقاتی یا قومی بنیادوں پر برتری کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ یہ اصول ہماری تہذیب کے اساسات اور اس کی جزئیات و تفصیلات تک میں نمایاں طور پر کار فرما ہے۔

جہاں تک اسلامی اصول و مبادی کا تعلق ہے تو اسلام نے اعلان کیا ہے کہ تمام انسان ایک ہی جان سے پیدا ہوئے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء: ۱)

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تمہیں ایک ہی جان سے اور پیدا کیا اس سے جوڑا اس کا اور پیدا کیے ان دونوں میں سے بہت سے مرد اور عورتیں۔"

پس تمام بنی نوعِ انسان کی اصل ایک ہی ہے۔ اسی مشترک نسل سے لوگ قوموں قبیلوں، ملکوں اور جنسوں میں بٹے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گھر میں ایک ماں باپ کی اولاد سے مختلف بہن بھائی ہوں۔ لہذا جب حقیقت یہ ہے تو پھر جنسوں اور قوموں کے اس تنوع کا نتیجہ فقط یہ ہونا چاہیے کہ وہ باہمی تعارف اور تعاون علی الخیر کا ایک ذریعہ ہو۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

۷ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات : ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور بنایا تمہیں گروہ اور قبیلے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔"

اس کے بعد زندگی میں بعض افراد آگے بڑھ جاتے ہیں اور بعض پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بعض غنی بن جاتے ہیں اور بعض محتاج ہو جاتے ہیں۔ ایک فرد حکمران بن جاتا ہے اور ایک قوم محکوم ہو جاتی ہے۔ بعض قوموں کا رنگ سفید ہوتا ہے اور بعض قوموں کی کھال سیاہ ہوتی ہے۔

یہ تو قانونِ فطرت ہے اور زندگی کا غیر متبدل نظام ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس طرح کا اونچ نیچ انسانیت پر اثر انداز ہو کر امتیاز و تفرق کا سبب بن جائے! غنی کو فقیر پر، حاکم کو محکوم پر اور سفید فام کو سیاہ فام پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ آدمیت اور انسانیت کے اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ اگر فضیلت ہے تو محض تقوٰی کی بنیاد پر ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (الحجرات : ۱۳)

"تم میں سے سب سے زیادہ صاحبِ عزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ

تقویٰ شعار ہے۔"

دست
سب قانون کی نگاہ میں برابر ہیں اور قانون ان سب پر یکساں حاوی اور بالا ہے۔ ان کے مابین امتیاز محض حق کی بناء پر ہو گا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۔ (الزلزال : ۷-۸)

"پس جو کوئی ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھے گا۔"

ہیئتِ اجتماعی میں سب کا درجہ مساوی ہے۔ ان کا طاقتور ضعیف کو سہارا دیتا ہے اور یوں پورا معاشرہ ایک ایک فرد کی خدمت سرانجام دیتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے :

مثل المؤمنین فی توادھم و تراحمھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منہ عضو تداعی لہ سائر الاعضاء بالحمی والسھر۔

"مسلمانوں کی مثال باہمی محبت و شفقت میں جسدِ واحد کی سی ہے۔ جب اس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو تمام اجزا اس کے ساتھ بخار اور بے خوابی میں شریک ہو جاتے ہیں۔" (مسلم و احمد)

اس طرح اسلام مسلسل اس امر کا اعلان کرتا آرہا ہے کہ انسانیت ایک وحدت ہے اور اس کے افراد گویا ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ انسانی معاشرے کی مثال ایک درخت کی سی ہے کہ جب ہوا چلتی ہے تو اس کی اوپر اور نیچے کی ٹہنیاں سب کی سب بلا تفریق ہلتی ہیں۔ یہیں سے یہ بات بھی بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ قرآن نے جو بکثرت يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ـــــ اور يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ ـــــ جیسے الفاظ سے خطاب کیا ہے وہ اس لیے ہے تاکہ ذہنوں میں وحدتِ انسانیت کا تصور پیدا اور راسخ ہو۔ اسی طرح دینِ اسلام کے پیروؤں کو يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ـــــ اور اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ ـــــ کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ اور ان میں نسلی یا طبقاتی تمیز روا نہیں رکھی

گئی ہے۔

## اسلامی مساوات کی ہمہ گیری:

جہاں تک ہمارے تہذیبی قوانین کا تعلق ہے ان میں مساواتِ انسانی ہر پہلو پر جاری وساری ہے۔ نماز میں سب لوگ خدا کے حضور ایک ہی حیثیت سے کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی بادشاہ، سردار یا عالم کے لیے کوئی جگہ مخصوص نہیں ہے۔ روزوں میں سب لوگ یکساں طور پر بھوکے رہتے ہیں۔ ان میں بھی امیر، غنی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ حج میں سب لوگ ایک ہی لباس پہنتے ہیں اور ایک ہی طرح خدا کے حضور میں کھڑے ہوتے ہیں، ایک ہی طرح مناسکِ حج ادا کرتے ہیں۔ ان میں قریب و بعید، قوی اور ضعیف اور خواص و عوام کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ اس کے بعد اگر ہم دیوانی قوانین کی جانب متوجہ ہوں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ تمام لوگوں کے ساتھ حق و انصاف پر معاملہ کیا جاتا ہے۔ قانون سازی کا اصل مقصد عدل و انصاف ہے۔ قانون ظلم کے دفعیہ کی خاطر جھنڈا اُٹھاتا ہے۔ تاکہ تمام مظلوم و محروم اشخاص اس کے سایہ میں پناہ لیں۔ پھر جب ہم قانون فوجداری کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے لیے یکساں طور پر سزا ہے۔ جو قتل کرتا ہے اُسے قتل کیا جاتا ہے، جو چوری کرتا ہے سزا پاتا ہے، جو زیادتی کرتا ہے اُس کی تادیب ہوتی ہے۔ قاتل خواہ عالم ہو یا جاہل اور مقتول چاہے امیر ہو یا غریب جس پر زیادتی ہوئی ہے وہ خواہ عربی ہو یا عجمی، شرقی ہو یا غربی، سب قانون کی نگاہ میں یکساں ہیں۔"

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۔ (البقرہ: ۸)

"آزاد کا بدلہ آزاد سے غلام کا بدلہ غلام سے اور عورت کا بدلہ عورت سے لیا جائے۔"

## اسلام کی بلند نظری:

اسلام کا قانون اس سے بھی زیادہ بلند نظری سے کام لیتا ہے اور دین، نسل

اور رنگ سے قطع نظر کرتے ہوئے وہ پوری انسانیت کو عزت بخشتا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ آدَمَ۔ (الاسراء : ۷۰)

"یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔"

یہ عزت و تکریم سارے انسانوں کا ایک پیدائشی حق ہے اور عقیدہ اور علم اور زندگی گذارنے کے لحاظ سے تمام انسانوں کو یکساں مواقع عطا کرتی ہے۔ اسلامی ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ بلا استثناء یکساں طور پر ان امور کی کفیل ہو۔ اسلامی تعلیمات انسان کو اس سے بھی زیادہ بلند سطح پر لے جاتی ہے اور کہتی ہے عنداللہ لوگوں کے ثواب و عذاب کا فیصلہ اُن کے ظاہری افعال پر نہیں بلکہ اُن کی نیتوں کے مطابق ہوگا:

انّ اللہ لاینظر الی صورکم و لکن الی قلوبکم (مسلم)

"یقیناً اللہ تمھاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ دلوں کو دیکھتا ہے۔"

جزا و سزا کا اصل انحصار نیّت پر ہے۔ چنانچہ حدیث ذیل کو جملہ آئمہ سنت نے روایت کیا ہے:

انّما الاعمال بالنّیات و انّما لکلّ امرئٍ ما نوی۔

"اعمال کا دارومدار نیّت پر ہے اور ہر شخص کے لیے وُہی کچھ ہے جس کا اُس نے ارادہ کیا۔"

اور ساتھ ہی اسلام نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک مقبول نیّت یہ ہے کہ خیر و نفع رسانی اور اللہ کی رضاجوئی کی نیّت کی جائے اور کوئی مادی یا تجارتی غرض سامنے نہ رکھی جائے۔

وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الحج : ۷۷)

"اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

یہ بھلائی جو محض اللہ کی خاطر سرانجام دی جاتی ہے اس سے مستفید ہونے والے شخص سے کسی اجر یا معاوضے کی توقع رکھنا صحیح نہیں ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا - اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا -

اور وہ کھلاتے ہیں کھانا، اس کی محبت میں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو (اور کہتے ہیں) ہم تو تمہیں اللہ کے لیے کھلاتے ہیں، تم سے کسی جزا یا شکریہ کی خواہش نہیں رکھتے۔ (الدہر: ۸-۹)

## بلند نظری کی وسعت و کمال:

اسلامی قانون سازی اپنی انسان دوستی کو درجۂ کمال تک اس وقت پہنچاتی ہے جب انسان، حیوان، نباتات، جمادات اور زمین و آسمان سب کو اللہ کی عبودیت اور قوانینِ فطرت کی اطاعت کی لڑی میں پرو دیتی ہے۔ قرآن کیسے پیارے انداز میں ہر مسلمان کو نماز کی ہر رکعت میں یاد دلاتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (الفاتحہ)

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہان والوں کا رب ہے، جو بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اور اس طرح وہ ہر مسلمان سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر مسلمان ہر گھڑی اس بات کو پیشِ نظر رکھے کہ وہ اس کائنات کا ایک جزو ہے، جو ایسی ہستی کی مخلوق ہے جو غایت درجہ رحمٰن و رحیم ہے اور جس کی رحمت ہر چیز تک پہنچتی اور سب کو شامل ہے اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ جس کائنات میں رہ رہا ہے اور جس کا وہ محتاج بھی ہے اس کی رحمت کا مظہر بنے جو اللہ کی صفت (رحمٰن و رحیم) ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کا ذرہ بھر محتاج نہیں۔

## کیا یہ اعلانات ہاتھی کے دانت تھے؟:

یہ تو تھے ہماری تہذیب کی انسان دوستی کے مظاہر جو اس کے اساسی تصورات

میں بھی کار فرما ہے اور اس کے قوانین میں بھی ہویدا ہے۔ اس وقت جب لوگوں کے لیے ان کا اعلان کیا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے جب فاتح کی حیثیت حاصل ہوئی اور حکمران کے درجے پر فائز ہوئی تو کیا واقعہ اور نفس الامر میں بھی اس کا سلوک ایسا ہی رہا؟ یا یہ اصول اقوامِ متحدہ کے میثاق حقوقِ انسانی کی طرح کوئی معاہدہ ہو کر رہ گئے جس کے اعلان کے دن دُنیا کی تمام حکومتوں کی طرف سے جشن منایا جاتا ہے لیکن اس دُنیا کی بڑی حکومتیں ہر وقت، ہر دن اور ہر سال کے مہینوں میں سے ہر مہینے میں اس کو دھڑلّے سے پامال کرتی ہیں؟ پھر کیا یہ اصول ان ممالک تک ہی محدود رہے جن میں ان کا اعلان کیا گیا۔ جیسا کہ فرانسیسی انقلاب کے اصول فرانس تک ہی محدود رہے اور فرانس کے زیرِ نگیں ممالک، نوآبادیوں اور زیرِ انتداب علاقوں کے دروازے ان کے لیے بند رہتے۔ نیویارک کے ساحل پر جو مجسمۂ آزادی نصب ہے اور اسے ہر وہ شخص دیکھتا ہے جو اس ملک میں داخل ہوتا ہے۔ کیا دُنیا کے کسی حصے میں بھی اور کوئی ایسا مجسمہ نصب کیا گیا ہے جبکہ امریکہ سے باہر کی دُنیا میں خود امریکیوں کی مسلسل کارروائیاں زبانِ حال سے حریت کا منہ چڑا رہی ہیں اور ان کا مذاق اُڑا رہی ہیں۔ حریت و آزادی کے متوالوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔

نہیں، بلکہ جو کما کر کے دکھایا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم تاریخ سے پُوچھیں کیونکہ تاریخ ہی سچّا گواہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہمیں اپنی تہذیب کی انسان دوستی کے روشن پہلوؤں پر نگاہ ڈالیں اور ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہماری تہذیب کے حکّام اور افراد کے جو طرزِ عمل جریدۂ عالم پر ثبت ہیں اور ان کی جو سرگرمیاں تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں، وُہ پکار پکار کر کن اور کیسے حقائق کا اعلان کر رہی ہیں؟

## پہلی شہادت:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جو قبیلۂ غفار سے تعلق رکھتے تھے کسی بات پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت بلال حبشی پر غصے ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے تھے۔ جھگڑے نے طول کھینچا اور حضرت ابوذرؓ نے فرطِ غضب میں حضرت بلال سے کہا "ابن السوداء[۵۱]" حضرت بلالؓ نے حضورؐ کے پاس شکایت کی، آپ نے حضرت ابوذر سے کہا "کیا تو نے اسے اس کی ماں کا طعنہ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے اندر ابھی کسی قدر جاہلیت موجود ہے" حضرت ابوذرؓ جو یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید جاہلیت کسی جنسی بداخلاقی کو کہتے ہیں اور اس میں تو صرف نوجوان ہی مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے کہا "حضور اس پیرانہ سالی میں؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں یہ تمہارے بھائی ہیں" اس پر حضرت ابوذر پشیمان ہوئے، توبہ کی اور حدِ درجہ اظہارِ ندامت اور کمالِ تواضع کے لیے حضرت بلالؓ سے درخواست کی کہ وہ ان کے چہرے کو اپنے پاؤں سے روند دیں۔

## دوسری شہادت:

عہدِ نبوی کا واقعہ ہے کہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ اسے حضورؐ کے پاس لایا گیا تاکہ اسے سزا دی جائے۔ قریش کو یہ بات شاق گزری چنانچہ انہیں فکر ہوئی کہ حضورؐ کے پاس کوئی اس کی سزا معاف کرانے کی سفارش کرے۔ طے یہ ہوا کہ اُسامہ بن زیدؓ رسولِ خدا کے ہاں زیادہ محبوب ہیں، چنانچہ قریش نے ان کو سفارش کے لیے آمادہ کیا۔ اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور اُسامہ سے کہا "تم حدود اللہ کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟" اس کے بعد لوگوں کو بُلا کر ایک بلیغ خطبہ دیا اور فرمایا کہ "تم سے پہلے کی اقوام کی ہلاکت میں اس رویّہ کا بڑا دخل رہا ہے کہ ان کی نظر میں جو شرفاء تھے ان میں سے اگر کوئی چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی کمزور درجے کا چوری کرتا تو اس پر حد جاری کر دیتے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہ بنتِ محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا

---

۵۱: کالی چمڑی والی حبشن کے بیٹے۔

۵۲: بخاری و مسلم وغیرہ

ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

## تیسری شہادت :

قیس بن مطاطیہ جو ایک منافق تھا، ایک مجلس میں آتا ہے جس میں سلمان فارسی، صہیب رومی اور بلال حبشی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا کہ "اوس اور خزرج نے تو اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں (بلال، صہیب اور سلمان) کو کیا ہو گیا ہے؟" حضرت معاذ بن جبل وہاں موجود تھے وہ اُٹھے اور اس کا گریبان پکڑ کر کھینچتے کھینچتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور آپؐ کو بتایا کہ اس نے یہ باتیں کی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک سُرخ ہو گیا اور چادر کھینچتے ہوئے مسجد نبوی پہنچے۔ اعلان کیا گیا کہ الصلوٰۃ جامعۃ (کسی غیر معمولی اجتماع کے لیے اس طرح کا اعلان کیا جاتا تھا) آپؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا "اے لوگو! یاد رکھو کہ تمہارا رب ایک ہے، تمہارا جدِ اعلیٰ ایک ہے اور دین بھی ایک ہے"[۱]

## چوتھی شہادت :

حضرت عدی بن حاتم طائی اپنے اسلام لانے سے پیشتر مدینہ طیبہ آتے ہیں۔ رسول خدا کے اردگرد صحابہ بیٹھے ہیں، یہ لوگ کسی جنگ سے ابھی ابھی واپس آئے ہیں اور زرہ و خود وغیرہ ابھی نہیں اُتارے۔ ان لوگوں پر نبی کی ہیبت اور ان کی جانب سے رسولِ خدا کا بے حد احترام دیکھ کر عدی بن حاتم بے حد مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اسی اثنا میں مدینہ کی ایک مسکین عورت آپؐ کے پاس آتی ہے اور آپؐ سے کہتی ہے کہ "اے رسولِ خدا میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔" آپ نے فرمایا کہ ہاں ہاں

---

[۱] : ابنِ عساکر نے بواسطہ زہری اس کی روایت کی اور روایت کا بقیہ حصہ یہ ہے کہ عربیت کسی کو باپ کے صلب یا ماں کی کوکھ سے نہیں ملتی، بلکہ یہ تو ایک زبان ہے جو اسے بولے وُہ عربی ہے۔

مدینہ کی جس گلی میں کہو میں چل کر تمہاری بات سننے کو تیار ہوں۔ پھر آپؐ اس کے ساتھ اُٹھے اور تھوڑی دُور جا کر کافی دیر تک اس کی بات سنتے رہے اور پھر واپس آ گئے۔ جب حضرت عدی نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انسان دوستی کے اس ناقابلِ تصور مظاہرے کا ان پر بہت اثر ہوا اور مسلمان ہو گئے۔

## پانچویں شہادت :

جب مسلسل ۲۱ سال کی سخت کشمکش کے بعد، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ فتح کیا اور جن لوگوں نے آپؐ کی تکذیب کی تھی، آپؐ کو گھر سے نکالا تھا اور آپؐ کے ساتھ لڑتے رہے تھے، وُہ مغلوب ہو کر آپؐ کے سامنے آئے، تو اس وقت بھی آپؐ نے انہیں وہی دعوت دی اور وہی اصول پیشِ نظر رکھے جن کا اعلان آپ مکّہ کی وادیوں میں ننگے پاؤں پھر کر کیا کرتے تھے یا بحیثیت ایک حکمران مدینہ طیبہ میں کر رہے تھے، جبکہ آپؐ تاریخ اسلامی میں بالکل ایک نئی تہذیب کی بنیادیں رکھ رہے تھے۔ آج آپؐ نے اُن اصول کے نفاذ کا اعلان کیا جن کی تبلیغ آپؐ اس عرصے میں کرتے رہے جبکہ آپؐ کو آخری فتح حاصل نہ ہوئی تھی۔ آپؐ نے خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا: "اے اہلِ قریش آج اللہ تعالیٰ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور تمہارے آباؤ اجداد کے فخر و مباہات کا قلع قمع کر دیا ہے۔ یاد رکھو! تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے تخلیق پائے تھے۔" قریش جنہیں عرب میں بڑائی حاصل تھی اور معاشرے میں اپنے آپ کو برتر سمجھتے رہے تھے خاموشی سے سر جھکائے سُنتے رہے۔ آپؐ نے اس موقع پر قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی جسے آپ ہمیشہ پڑھا کرتے تھے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (الحجرات: ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور بنایا تمہیں گروہ اور قبیلے تاکہ تم ایک دُوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک تم میں سے

اللہ کے ہاں زیادہ باعزت وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔"

## چھٹی شہادت :

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور آتا ہے تو آپؓ ایسے حکمران کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں جس کا دل اور نفس انسانیت کی ہمدردی سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ خلیفہ وقت ہوتے ہوئے بھی آپؓ محلہ کی ان لڑکیوں کے پاس آتے ہیں جن کے باپ لڑائیوں میں شہید ہو چکے تھے اور ان کی بکریاں دوہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "مجھے اُمید ہے کہ خلافت کی ذمہ داری مجھے اس حسنِ خلق سے نہ روکے گی، جسے میں پہلے سے سرانجام دیا کرتا تھا۔"

## ساتویں شہادت :

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک پُرشوکت خلیفہ کی طرح آتے ہیں۔ ضعیفوں کے ہمدرد ہیں۔ حق پر ڈٹ جاتے ہیں۔ تمام لوگ ان کے نزدیک بالکل برابر ہیں۔ اپنے آپ کو بھوکا رکھتے ہیں تاکہ لوگوں کو سیر کریں، اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں تاکہ لوگوں کو دیں، آپ گھروں اور رہائش گاہوں میں جا کر لوگوں کے حالات معلوم کرتے ہیں اور اس بارے میں ان کے حالات بہت مشہور ہیں۔ مثلاً انہوں نے ایک مرتبہ بازار میں ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو بھیک مانگ رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں بوڑھا ہوں، جزیے کی ادائیگی اور ضروریاتِ زندگی کے لیے یہ بھیک مانگ رہا ہوں، یہ مدینہ کے یہودیوں میں سے تھا۔ دیکھیے عمر! وہ عظیم انسان یہ سن کر کیا کہتا ہے؟ آپؓ اس سے فرماتے ہیں کہ بوڑھے تیرے ساتھ ہم نے انصاف نہیں کیا، جب نوجوان تھا تو ہم نے تجھ سے جزیہ وصول کیا اور بڑھاپے میں تجھے بدحالی میں مبتلا چھوڑا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے گھر لے گئے۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر کے کھلایا اور بیت المال کے خازن کے پاس یہ حکم بھیجا کہ

اس شخص کے لیے اور ایسے تمام لوگوں کے لیے اتنا روزینہ مقرر کر دو، جو ان کے لیے اور ان کے اہل و عیال کے لیے کفایت کرے۔

## آٹھویں شہادت :

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ کی کسی گلی سے گذر رہے تھے کہ انہوں نے ایک دبلی پتلی بچی کو دیکھا، جو گرتی پڑتی جا رہی تھی۔ آپ نے کہا "اسے کس قدر بُری حالت ہے اس کی، یہ کون ہے؟ تم میں سے کوئی اس کو پہچانتا ہے؟" حضرت عبداللہ بن عمرؓ پاس ہی کھڑے تھے فرمایا: "امیرالمؤمنین! آپ اسے نہیں پہچانتے؟" فرمایا "نہیں" انہوں نے کہا یہ تو آپ ہی کی بیٹی ہے۔" انہوں نے دریافت کیا میری کونسی بیٹی ہے یہ؟ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا یہ میری فلاں بیٹی ہے (یعنی آپ کی پوتی) حضرت عمرؓ بولے "تو پھر اس کی یہ حالت کیوں ہو رہی ہے؟" انہوں نے کہا "آپ کے پاس جو کچھ ہے ہمیں اس میں سے کہاں دیتے ہیں؟ اس (ناداری) نے بچی کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا خدا کی قسم میرے پاس تمہارے لیے عام مسلمانوں کے وظیفے سے زائد کچھ نہیں ہے، خواہ تمہاری ضرورت پوری ہو یا نہ ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان فیصل خدا کی کتاب ہے۔"

## نویں شہادت :

ایک دفعہ مدینہ میں تاجروں کا ایک قافلہ آیا، جس میں بچے اور عورتیں بھی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا کیا آپ آج رات ان کی حفاظت کر سکتے ہیں؟ چنانچہ حضرت عمرؓ اور وہ دونوں اس رات کو جاگ کر قافلے کی حفاظت کرنے لگے۔ اسی دوران دونوں نے نماز تہجد بھی پڑھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی بچے کے رونے کی آواز سنی۔ اس کے قریب گئے اور اس کی ماں سے کہا کہ "خدا سے ڈرو اور بچے کی دیکھ بھال کرو۔" اور واپس آ گئے، پھر بار دیگر انہوں نے

اس کے رونے کی آواز سُنی، وُہ پھر اس کی ماں کے پاس گئے اور کہا اللہ سے ڈرو، اور بچے کی دیکھ بھال کرو۔ جب رات کا آخری حصّہ آیا تو بچّہ پھر رو دیا، آپ اس کی ماں کے پاس آئے اور کہا "تجھ پر سخت افسوس ہے تُو تو بہت ہی بُری ماں معلوم ہوتی ہے، کیا وجہ ہے کہ تیرا یہ بچّہ رات بھر آرام سے نہیں سویا۔ اس عورت کو کیا معلوم کہ وُہ امیرالمؤمنین سے بات کر رہی ہے، اُس نے کہا "خدا کے بندے تو رات سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے، میں اس سے زبردستی دُودھ چھڑانا چاہتی ہوں، لیکن وُہ چھوڑتا نہیں۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیوں ؟ اُس نے کہا "اس لیے کہ عمرؓ صرف اس بچّہ کا روزینہ مقرّر کرتے ہیں جس نے دُودھ چھوڑ دیا ہو۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا اس کی عُمر کیا ہے ؟ اُس عورت نے جواب میں کچھ مہینے بتائی، تو آپؓ نے اس عورت سے کہا دُودھ چھڑانے میں اس قدر جلدی نہ کر۔ پھر آپؓ نے لوگوں کو صبح کی نماز اس حال میں پڑھائی کہ شدّتِ گریہ کی وجہ سے لوگ قرأت نہ سُن سکے۔ سلام پھیرنے کے بعد فرمایا: "ہلاکت ہے عمرؓ کی جس نے مسلمانوں کے بچّوں کو قتل کر دیا۔" اس کے بعد منادی کو حکم دیا کہ شہر میں اعلان کر دے کہ محض روزینے کی خاطر بچّوں کا دُودھ جلدی نہ چھڑائیں، اب سے ہم ہر بچّے کا روزینہ مقرّر کریں گے۔ غرض تمام اطرافِ مملکت میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔

## بے مثال :

خدا کی قسم ! پُوری تاریخ انسانی کے اندر ہمیں اس جیسا روشن اور شاندار واقعہ نظر نہیں آتا، دُنیا کی تمام تہذیبوں میں کوئی تہذیب ایسی نہیں ہے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال پیش کر سکتی ہو، وُہ خود تو جاگتے رہے اور قافلے کی حفاظت کرتے رہے اور قافلے والے سوتے رہے حالانکہ وُہ اس وقت امیرالمؤمنین تھے، یعنی وُہ عظیم صاحبِ اقتدار جس نے قیصر و کسریٰ جیسی بڑی بڑی سلطنتوں پر غلبہ پایا، اس کے باوجود انہوں نے وُہ کام کیا جو آج کل کوئی ایسا سپاہی بھی نہ کرے گا جو کسی قافلے کی حفاظت پر مامور ہو، انہوں نے تین مرتبہ بچّے کی والدہ کو متوجہ کیا کہ وُہ بچّے کو آرام سے رکھے

کون ہے ایسا جو مسافروں کے بچّوں کے ساتھ عمرؓ جیسا سلوک کرے ؟ تاریخ انسانی کی عظیم شخصیتوں میں سے کون ہے جو حضرت عمرؓ کے اس عظیم انسانی شعور کی گرد کو بھی پہنچ سکے ؟

## دسویں شہادت :

اور سُنیے ہماری تہذیب میں اس سے بھی شاندار واقعات موجود ہیں ۔حضرت عمرؓ کے خادم اسلم بیان کرتے ہیں کہ میں ایک رات حضرت عمرؓ کے ساتھ نکلا ، ہم مدینہ سے دُور جا نکلے ، ہم دُور دراز کے گھروں کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے ، دُور سے ہم نے آگ جلتی دیکھی حضرت عمرؓ نے کہا " کہ میرا خیال ہے کچھ سواروں کو سردی اور رات نے یہاں روک رکھا ہے ، چلو ہم وہاں چلیں " ہم تیز تیز قدم اُٹھاتے ہُوئے وہاں پہنچے ، ہم نے دیکھا کہ ایک عورت ہے جس کے پاس چند بچّے بیٹھے ہیں اور ہنڈیا چُولھے پر رکھی ہے ، بچّے رو رہے چلاتے ہیں ، حضرت عمرؓ نے سلام کیا اور عورت سے پوچھا کیا حال ہے تمہارا اور یہاں کیا ہو رہا ہے ؟ عورت نے کہا کہ سردی اور رات کی وجہ سے ہم یہاں رُک گئے ہیں ۔حضرت عمرؓ نے پوچھا " یہ بچّے کیوں چلّا رہے ہیں " عورت نے جواب دیا کہ " بھُوک سے " اُنہوں نے دریافت کیا " اس ہنڈیا میں کیا ہے ؟" عورت نے کہا " اس میں محض پانی ہے جو بچّوں کی تسلّی کے لیے چڑھا دیا ہے تاکہ وُہ خاموش ہو جائیں اور سو جائیں اور ہمارے اور عمرؓ کے درمیان فیصلہ اللہ کرے گا " عورت کا مقصد یہ تھا کہ عمرؓ ہمارے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں ۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے کہا :

" خدا کی بندی عمرؓ کو تمہارے بارے میں کیا علم ہے ؟" اس نے کہا تو پھر وُہ خلیفہ وقت کیوں بنا بیٹھا ہے جب ہمارے حال سے وُہ غافل ہے ۔اسلم کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مجھے کہا کہ چلو بھائی ، ہم وہاں سے بڑی تیزی کے ساتھ روانہ ہُوئے ۔آٹے کے گودام میں آئے اور حضرت عمرؓ نے آٹے کی ایک بوری اور چربی کا ایک کُپا بھی لیا اور مجھ سے کہا کہ یہ سامان میرے کاندھے پر رکھ دو ۔میں نے عرض کیا میں اُٹھائے لیتا ہوں تو انہوں

نے غصہ سے جھڑک کر کہا "کیا قیامت کے دن بھی تو میرا بوجھ اُٹھائے گا" چنانچہ میں نے سامان ان کے کاندھے پر رکھ دیا۔ پھر ہم دونوں بڑی تیزی سے چل پڑے انہوں نے سامان عورت کے پاس رکھ دیا، کسی قدر آٹا نکال کر عورت سے کہا کہ اسے گوندھ جب تک میں آگ تیز کرتا ہوں۔ چنانچہ ہنڈیا کے نیچے پھونکنے لگے۔ آپ کی داڑھی گھنی تھی میں نے دیکھا کہ ان کی داڑھی کے بالوں سے دھواں چھن چھن کر نکل رہا ہے۔ یہاں تک کہ کھانا پک گیا، تو حضرت عمرؓ نے اسے اُتار لیا اور عورت سے فرمایا کہ کوئی چیز لاؤ۔ وہ ایک تھال لے آئی تو انہوں نے ہنڈیا کو اس میں انڈیل دیا اور عورت سے کہا کہ تو ان بچوں کو کھلاتی جا اور میں ہوا دے کر اسے ٹھنڈا کرتا جاتا ہوں۔ اسی طرح وہاں بیٹھے رہے تاوقتیکہ سب نے سیر ہو کر کھا پی نہیں لیا۔ جو کچھ باقی بچا اُسے وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ اُٹھے، میں بھی ان کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ عورت کہنے لگی: "اللہ آپ کو جزائے خیر دے امیر المؤمنین سے زیادہ آپ اس منصب کے اہل ہیں" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تم کلمۂ خیر ہی زبان سے نکالو۔ کل جب تم امیر المؤمنین کے پاس آؤ گی تو مجھے انشاء اللہ وہاں موجود پاؤ گی" اس کے بعد حضرت عمرؓ وہاں سے کچھ دُور چلے گئے اور پھر واپس آکر ان کے پڑاؤ کے پاس ہی چھپ کر بیٹھ گئے، میں نے اُن سے کہا کہ آپؓ کے لیے یہ مناسب نہیں ہے، لیکن انہوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم نے دیکھا کہ بچے کھیل رہے ہیں، پھر وہ سو گئے۔ حضرت عمر الحمد للہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور میری طرف متوجہ ہو کر کہا: "اسلم بھوک نے انہیں سنا رکھا تھا وہ رو رہے تھے اور سو نہ سکتے تھے۔ میرے دل کو سکون نہ ملتا جب تک انہیں آرام و سکون کی حالت میں نہ دیکھ لیتا۔ اس لیے میں نے انہیں چھپ کر دیکھا کہ اب اُن کا کیا حال ہے" تم نے بھی دیکھا کہ وہ سب آرام و سکون سے سو گئے۔

## گیارھویں شہادت:

ہمدردی و مساوات کے متعلق تاریخ انسانی کے منفرد واقعات میں ایک واقعہ وہ بھی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو ایک رات پیش آیا۔ آپ کی عادت تھی کہ رات کو

کو گشت کر کے حالات معلوم کیا کرتے تھے، ایک رات وہ مدینہ کی وادیوں میں سے کسی وادی میں جا نکلے اچانک ان کے کان میں رونے کی آواز پڑی، یہ آواز ایک خیمے سے آ رہی تھی۔ جس کے دروازے پر ایک مرد کھڑا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اسے سلام کیا اور پوچھا کہ وہ کون ہے، اس نے کہا کہ میں ایک دیہاتی ہوں اور یہاں امیرالمؤمنین سے امداد مانگنے آیا ہوں، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ آواز کیسی آ رہی ہے، اس نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ بھائی اپنی راہ لیجیے جس چیز سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہے اس میں دلچسپی نہ لیجیے، اُسے کیا معلوم کہ وہ امیرالمؤمنین سے ہم کلام ہے، حضرت عمرؓ نے اصرار کیا تو اس نے بتایا کہ میری بیوی دردِ زِہ میں مبتلا ہے اور اس کے پاس کوئی نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ گھر لوٹے اور اپنی بیوی اُمِّ کلثوم بنتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: "کیا تمہیں اس ثواب سے کوئی دلچسپی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مہیا کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا "وہ کیا ہے؟" اس پر حضرت عمرؓ نے تفصیلات بتائیں اور ان سے کہا کہ وہ اپنے ساتھ نومولود بچے کے لیے کپڑا وغیرہ اور زچہ کی تمام ضروریات لے لیں اور ساتھ ہی کھانے پینے کی چیزیں اور گھی وغیرہ بھی لے لیں۔ وہ یہ چیزیں لے آئیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ سامان اُٹھایا اور اُمِّ کلثوم آپ کے پیچھے ہو لیں۔ یہ دونوں اس خیمے کے سامنے جا پہنچے، حضرت عمرؓ نے اُمِّ کلثوم سے کہا کہ خیمے کے اندر چلی جائیں۔ آپ مرد کے ساتھ باہر بیٹھ گئے اور آگ جلا کر وہ چیزیں پکانے لگے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ابھی تک اس دیہاتی کو معلوم نہیں کہ وہ دنیا کے ایک عظیم انسان کے پہلو میں بیٹھا ہے۔ اس دوران خیمے کے اندر بچے کی ولادت ہوئی۔ اُمِّ کلثوم نے اندر سے آواز دی۔ امیرالمؤمنین! اپنے دوست کو بچے کی ولادت کی خوشخبری دیجیے۔ جب دیہاتی نے اُمِّ کلثوم کے یہ الفاظ سُنے تو اب سمجھا کہ وہ امیرالمؤمنین کے ساتھ اس طرح پیش آیا اور اب آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے، اس پر خوف کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور سنبھل کر حضرت عمرؓ کے پاس سے سرکنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ اسی طرح بے تکلف بیٹھے رہو اور خود ہنڈیا پکائی اور اُمِّ کلثوم سے کہا کہ زچہ کو کھانا کھلائیں، جب وہ کھا چکی تو

بقیہ اس مرد کے سامنے رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لو کھالو، پوری رات جاگتے ہوئے تم نے گزاری اور تکلیف اُٹھائی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ کل ہمارے پاس آجانا، ہم تمہاری ضروریات کی تکمیل کے لیے احکام دے دیں گے جب وُہ صبح آیا تو اس کے بچے کے لیے وظیفہ مقرر کیا گیا اور اسے بھی بخشش سے نوازا گیا۔

## کوئی ایک بھی نظیر پیش کرو:

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میں وثوق سے کہتا ہوں کہ تاریخِ انسانی کے عظیم ترین انسانوں کی سوانح حیات میں مجھے اس جیسا شاندار، نمایاں اور اخوت کے جذبات پر مشتمل کوئی ایک واقعہ بھی نہیں ملا۔ امریکہ کے نجات دہندہ جارج واشنگٹن کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ وُہ ایک دفعہ کسی سڑک سے گزر رہے تھے، اُنہوں نے دیکھا کہ کچھ سپاہی ایک پتھر اُٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اُٹھا نہیں پاتے، ان کا نگران پاس ہی کھڑا ہے اور ان کی مدد نہیں کر رہا ہے، ابراہیم نے اس سے کہا کہ بھائی ان لوگوں کی مدد کرو لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا یہ میری حیثیت سے فروتر ہے۔ واشنگٹن نے اپنی چادر ایک طرف رکھی اور ان کی مدد کی، یہاں تک کہ انہوں نے پتھر اُٹھا لیا اور اس کے بعد ابراہیم نے ان سے کہا کہ جب بھی تمہیں ایسی مشکل درپیش ہو ابراہیم کے گھر کا پتہ دریافت کر لینا۔ بیشک یہ ایک نادر واقعہ ہے جو فی الواقع بلند اخلاقی پر دلالت کرتا ہے لیکن اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا واقعہ سے کیا نسبت ہے ؟ کہ انہوں نے رات کو اپنی نیند اور آرام کو ترک کیا، لوگوں کے حالات دریافت کرنے نکلے، جب انہیں معلوم ہوا کہ ایک حاملہ عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے اور اس کا کوئی معاون نہیں ہے تو گھر واپس آگئے اور بیوی کو ساتھ لیا، خود کھانے پینے کی چیزیں اُٹھائے ہوئے ہیں، بیوی کپڑے اور دُوسری ضروریات لیے ہوئے ہے، یہ لوگ اندھیری رات میں اس شخص کے گھر پہنچتے ہیں، ان کی بیوی جو ہماری اصطلاح میں ملکہ ہے، خادمہ کا کردار ادا کرتی ہے اور وُہ خود باورچی بن جاتے ہیں۔ ہے نفسِ انسانی کی اس بلندی کی کوئی ایک بھی مثال ؟

جس تک پورے کرۂ ارض میں آج تک، کوئی رئیسِ سلطنت نہ پہنچ سکا۔ حضرت عمرؓ کی عظمتوں میں سے یہ ایک عظمت ہے اور یہ ہماری تہذیب کا روشن پہلو بھی ہے کہ عمرؓ جیسے ایک بادیہ نشین انسان کو ایک ایسی شخصیت کی صورت میں ڈھال دیا جو آج بھی تاریخِ انسانی کے عظیم لوگوں میں سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہیں جس طرح ہماری تہذیب کا مقام دنیا کی تمام تہذیبوں میں سرفہرست ہے۔

## قطار اندر قطار:

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کی کوئی واحد شخصیت نہیں ہے جسے ایک کامل اور مشفق انسان کی شکل میں ہماری تہذیب نے پیش کیا ہے بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زندگی، حضرت عثمانؓ کی زندگی اور حضرت علی (رضوان اللہ علیہم) کی زندگی بھی اسی طرح کی رحمت اور شفقت سے معمور، انسانیت کاملہ کے قالب میں ڈھل گئی تھی، نیز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، صلاح الدین ایوبی وغیرہ بڑی بڑی شخصیات، علما فقہاء، فلاسفر اور قائدین کی زندگیوں میں بھی ہمیں بے شمار زندۂ جاوید مثالیں ملتی ہیں، جو ہر پہلو سے ہماری تہذیب کی تابندہ شہادت ہے۔

---

# چوتھا باب

# مساوات

ہماری لازوال تہذیب کی انسان دوستی کا یہ ایک دوسرا پہلو ہے، کہ اس نے انسانوں کے درمیان حقیقی مساوات کی بنیادیں مضبوط کیں بغیر یہ لحاظ کیے کہ کس کا رنگ کیا ہے اور کس کا نسبی تعلق کس سے ہے؟ چنانچہ قرآن مجید کے اس اعلان کے بعد کہ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ "بیشک اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ با عزت وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہو" (حجرات: ۱۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے زمانہ حیات دیار خطبہ میں فرمایا:

الناس من آدم وآدم من تراب، لا فضل لعربی علی اعجمی ولا لابیض علی اسود الا بالتقویٰ۔

"تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کوئی فضیلت نہیں کسی عربی کو کسی عجمی پر اور نہ کسی سفید کو سیاہ پر مگر تقویٰ کے لحاظ سے"

## محض زبانی جمع خرچ نہ تھا:

یہ مساوات کوئی ایسی مساوات نہ تھی جس کا، چند رسمی مواقع پر صرف اعلان کر دیا

جاتا ہو۔ جیسا کہ آج کل عام طور پر مغربی تہذیب کے فرزند کر دیا کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ایک حقیقی اور زندگی کے مختلف حالات پر منطبق ہونے والی مکمل مساوات تھی، جو روزمرہ کے معمولات کی طرح اس طرح کارفرما تھی کہ جس پر نہ کسی کو کوئی تعجب ہوتا تھا، اور نہ اس میں کسی قسم کے تصنع اور بناوٹ کو کوئی دخل تھا۔ چنانچہ اس مساوات نے اس صحنِ مساجد میں قدم رکھا۔ جہاں اللہ کی بندگی اور اس کے سامنے خضوع و خشوع کے لیے لوگ حاضر ہوتے، ان میں ہر رنگ و نسل کے لوگ ہوا کرتے اور سب ایک ہی فرش پر شانہ سے شانہ ملائے اللہ کی بندگی اور اس کے حضور خشوع و خضوع میں مصروف رہتے، اور کوئی سفید رنگ والا، اپنے اندر کسی قسم کی دل گرفتگی نہ پاتا تھا کہ اس کے پہلو میں، ایک سیاہ فام حبشی کیوں کھڑا ہے۔ اس طرح یہ مساوات حج میں بھی سرایت کر گئی۔ جب مختلف انسانی طبقات، خواہ سفید رنگ سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاہ سے، جمع ہوتے ہیں اور ایک ہی جگہ مناسکِ حج ادا کرتے ہیں۔ ایک ہی لباس میں ہوتے ہیں۔ کسی گورے اور کالے کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی گورے کو کالے پر کوئی برتری حاصل ہوتی ہے۔ اور زمانے کی آنکھوں نے اس مساوات کے عروج کا یہ منظر بھی دیکھا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم، فتح مکہ کے موقع پر بلال حبشی کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اعلانِ حق کے لیے کعبہ کے اوپر چڑھ جائیں اور اذان دیں، سوچنے کی بات ہے کہ کعبہ، اللہ کا گھر، جسے جاہلیت میں بھی حرم مقدس ہونے کا مرتبہ حاصل تھا اور اسلام میں بھی قبلہ قرار پانے کا اعلیٰ مقام حاصل ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک حبشی غلام اس کے اوپر چڑھ جاتا ہے اور یہ مقدس مقام اس کے قدموں کے نیچے ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسی مثال ہے جس کے متعلق آج کی مہذب دنیا میں بھی نہیں سوچا جا سکتا، مثلاً امریکہ میں (جہاں گوروں اور کالوں کے گروہ آج بھی علیحدہ علیحدہ ہیں) لیکن اسلام نے آج نہیں، بلکہ آج سے چودہ سو سال قبل، اسے عملاً کر کے دکھایا ہے۔ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا کعبہ پر چڑھنا، درحقیقت اس بات کا اعلانِ عام تھا کہ انسان کو، کائنات کی ہر چیز پر فضیلت حاصل ہے۔ اور انسان اس عزت و تکریم کا مستحق اپنے ایمان، اپنے علم، اپنے

اخلاق اور اپنی عقل کی بنا پر ہوتا ہے نہ کہ اپنے گوشت پوست یا رنگ و نسل کی بنا پر۔ لہذا کسی ایسے انسان کو محض اس کی رنگت آگے نہیں بڑھا سکتی جسے اس کے عمل نے پیچھے پھینک دیا ہو۔ اور نہ یہاں کسی کی سیہ فامی اسے پیچھے دھکیل سکتی ہے۔ اگر اس کی عقل و فراست اور قوتِ اجتہاد نے اسے آگے بڑھایا ہو۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ باوجود کہ ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ لیکن ایک مرتبہ جب غصہ کی حالت میں انہوں نے حضرت بلال کو "او حبشن کے بیٹے" کہہ دیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کو برداشت نہ کیا اور انہیں تنبیہ کی اور فرمایا کہ "تم میں ابھی جاہلیت کی بو باقی ہے، جبھی تو تم نے اس کی ماں کے سیہ فام ہونے کا طعنہ دے کر اسے ذلیل و شرمندہ کرنا چاہا۔"

یہ وہ مقام ہے جو علم اور جہل کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ حقیقی انسانی تہذیب اور جاہلی تہذیب کے درمیان حدِ فاصل ہے۔

## یہ کارنامہ کون انجام دے سکتا ہے؟:

ایسی تہذیب، ایک وسیع النظر اور کریم النفس انسان ہی برپا کر سکتا اور پروان چڑھا سکتا ہے، جس میں کسی نسل کو دوسری نسل پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ کسی رنگ کو دوسرے رنگ پر برتری حاصل نہ ہو اور یہی تہذیب عزت و تکریم والی انسانیت کے لیے سعادت کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اور وہ تہذیب جس میں سفید فام کو برتری حاصل ہو اور سیاہ فام ذلیل و خوار ہو، سفید پوست رکھنے والے عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کے مستحق قرار پائیں، اور سیاہ فام خستہ حال و درماندہ ہوں، ایسی تہذیب جاہلی تہذیب ہے، جو انسانیت کو ہزارہا سال پیچھے کے، قرونِ مظلمہ میں، دھکیل دیتی ہے۔ یہ اندھی، جاہل، متکبر اور احمقانہ تہذیب ہوتی ہے اور کہنے کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ: "انک امرؤ فیک جاھلیۃ" لیکن یہ فقرہ دراصل اس ضمیر کی نشان دہی ہے جس سے ہر وہ جاہلی تہذیب ترکیب پاتی ہے جو انسان اور انسان میں خاک و خون

یا زبان و رنگ کی بنا پر امتیاز و تفریق کرتی ہے۔ ایسی ہی باطل تہذیبوں کا، اسلامی تہذیب نے زندگی کے ہر میدان میں مقابلہ کیا ہے۔ مسجدمیں، عدالتوں میں، قیادت کے میدان میں، دوستوں اور دشمنوں دونوں کے ساتھ اس نے اس معاملہ میں مساویانہ برتاؤ کیا ہے۔

## ایک مثال:

جب مسلمانوں نے مصر پر لشکر کشی کی، اور وہ مصر کے اندر دُور تک بڑھتے گئے یہاں تک کہ وہ قلعۂ بابلیون تک پہنچ گئے، تو مقوقس مصر نے مسلمانوں کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے ایک وفد بھیجا کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ اس نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ مسلمان بھی اپنا ایک وفد بھیجیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص نے، اس کے پاس دس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد بھیجا، جس کا سربراہ حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ عنہٗ کو مقرر کیا اور انہی کو مقوقس سے گفتگو کرنے کا مجاز ٹھہرایا۔ حضرت عبادہ کا رنگ بے حد سیاہ تھا اور وہ طویل القامت تھے، جب یہ وفد مقوقس کی ملاقات کے لیے پہنچا اور حضرت عبادہ آگے بڑھے تو ان کی شکل و شباہت اور قامت دیکھتے ہی مقوقس پر ہیبت طاری ہوگئی، اس نے ارکانِ وفد سے کہا: "خدا کے لیے اس سیاہ فام کو مجھ سے دُور ہی رکھو، اور مجھ سے بات چیت کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص کو سامنے لاؤ۔" ارکانِ وفد نے یک زبان ہو کر کہا: "یہ ہم سے علم و فہم، رائے اور بصیرت ہر لحاظ سے افضل ہیں۔ یہ ہمارے سربراہ ہیں۔ ہم سب ان کی بات اور رائے کی طرف رجوع کرتے ہیں نیز ہمارے امیر نے انھیں کچھ خاص ہدایات دی ہیں اور ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ان کی رائے کی خلاف ورزی نہ کریں۔" اس پر مقوقس نے وفد سے کہا: "تم لوگ اس پر کس طرح راضی ہوگئے کہ ایک سیاہ فام تمہارا سربراہ ہو جائے حالانکہ اسے تمہارا ماتحت ہونا چاہیے تھا۔" اس پر وفد نے جواب دیا: "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟ جبکہ یہ علم و شرف کے لحاظ سے بھی ہم سے فائق ہیں اور رائے و بصیرت کے لحاظ سے بھی ہم سے زیادہ افضل ہیں۔ رہی سیہ فامی، تو یہ

ہمارے ہاں کوئی عیب نہیں ہے۔" اس پر مقوقس نے لاجواب ہو کر حضرت عبادہؓ سے کہا کہ "اے سیہ فام آگے آؤ لیکن، بات ذرا نرمی سے کرنا، اس لیے کہ ایک تو تمہاری سیاہ رنگت سے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو رہی ہے، اور اگر تم کرخت لب و لہجہ میں گفتگو کروگے تو میرے اس خوف میں اور اضافہ ہو جائے گا۔" حضرت عبادہ بن الصامت نے مقوقس کے اس خوف کو دیکھ کر کہا: "بھائی ہماری فوج میں تو ایک ہزار ایسے سیاہ فام موجود ہیں جو مجھ سے بھی زیادہ سیاہ فام ہیں۔"

## یہ کوئی منفرد مثال نہیں ہے :

سوچیے تو سہی کہ اسلامی تہذیب کا یہ پہلو کس قدر روشن ہے اور انسان کا مقام اس تہذیب میں کس قدر بلند ہے۔ لوگ سب کے سب سیاہ فامی کو عیب تصور کرتے تھے (اور آج کے نام نہاد تہذیب یافتہ تو اس کو بیسویں صدی میں بھی ایک عیب ہی سمجھتے ہیں) اور کالوں کو گویا انسانوں میں شمار ہی نہ کرتے تھے، ان کو آگے بڑھانا اور علم و رائے میں ان کو ایک بلند مقام عطا کرنا تو ایک بڑی بات تھی۔ لیکن جب ہماری تہذیب آئی تو اس نے ان سب باطل معیاروں کا قلع قمع کر دیا۔ باطل افکار کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور حالت یہ ہوئی اگر کسی سیاہ فام کو اس کا علم، اس کی رائے اور اس کی جرأت آگے بڑھا سکتی تھی تو اسلامی سوسائٹی نے، اسے بڑھانے میں بخل نہیں برتا۔ حضرت عبادہؓ بن الصامت، کوئی ایک منفرد مثال نہ تھے جس کو اسلامی تہذیب نے قائد اور زعیم کے درجے تک پہنچا دیا بلکہ اس کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

## دُوسری مثال :

عبدالملک بن مروان، موسم حج میں منادی کراتے تھے کہ عطا بن ابی رباح کے علاوہ کوئی اور فتویٰ نہ دے، جو اہلِ مکہ کے امام و عالم اور فقیہ تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں

کہ یہ عطا کس شکل و شباہت کے تھے ؟ ایک سیاہ فام، بھینگے، لنگڑے اور چپٹی ناک اور حلقہ دار بالوں والے ایک انسان تھے جن کے سامنے چند منٹ بیٹھنے سے بھی وحشت ہو۔ اور جب وہ اپنے ہزاروں شاگردوں کے درمیان، حلقۂ درس میں بیٹھے ہوئے ہوتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سیاہ کوا، کپاس کے کھیت میں بیٹھا ہوا ہے لیکن انہی کالے بھینگے اور چپٹی ناک والے کو ہماری تہذیب نے، ایک امام کا درجہ دیا اور لوگ ان کی طرف فتویٰ میں رجوع کرنے لگے، ان کی ذات بجائے خود ایک مدرسۂ فکر بنی۔ جس سے روشن چہرے والے ہزاروں علماء و فضلاء فیض یاب ہو کر نکلے اور وہ ان کے نزدیک ایک باعزت بلند، اور محبت کا مقام رکھتے تھے۔

## زرق تا بہ قدم.........! :

ہماری تہذیب اور معاشرے میں، علم و ادب کے کئی ایسے ماہرین گذرے ہیں۔ جو نسلاً حبشی اور سیاہ فام ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی یہ سیہ فامی ان کو اس بات سے نہ روکتی تھی کہ وہ علم و ادب کے میدان میں ترقی کریں اور ایسے ادیب بن جائیں جن کو وقت کے نازک مزاج خلفاً تک کی ہم نشینی حاصل ہو۔ یا وہ فقیہ بن جائیں اور ایسی کتابیں تصنیف کریں جو اسلامی علوم و ادب میں معتمد ترین مراجع قرار پائیں مثلاً عثمان بن علی زیلعی جنہوں نے فقہ حنفی میں کنز الدقائق پر مستند شرح لکھی یا جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف زیلعی (متوفی ۷۶۲ھ) جنہوں نے نصب الرایہ جیسی مستند اور مشہور کتاب تصنیف کی۔ یہ دونوں حضرات حبشہ کے "مقام زیلع" کے رہنے والے تھے۔ پھر کافور اخشیدی سے بھی کوئی ناواقف نہیں ہے، جو ایک سیاہ فام غلام تھا اور چوتھی صدی ہجری میں مصر کا حکمران رہا اور جس کے نام کو متنبی نے اپنی ہجو اور مدح کے ذریعہ رہتی دنیا تک کے لیے بقا سے ہم کنار کر دیا۔

## عمل کی سیاہی و سفیدی نہ کہ چہرے کی سیاہی و سفیدی :

مختصر یہ کہ ہماری تہذیب نے سیاہ فاموں اور گورے رنگ والوں کے درمیان

کسی قسم کا کوئی طبقاتی فرق یا امتیاز روا نہیں رکھا ورنہ اسلامی تہذیب میں سیاہ فاموں کے لیے کوئی ایسی آبادی قائم کی گئی جو سفید فاموں سے دُور اور الگ تھلگ ہو اور نہ ان کے حقوق میں کوئی ایسی کمی روا رکھی گئی جس کی وجہ سے سفید فاموں کو ان پر بالا دستی حاصل ہو اور وُہ سفید فاموں کے تشدّد اور ان کی زیادتیوں کو جبراً و قہراً گوارا کرنے پر مجبور ہوں۔ بلکہ ہماری تہذیب ایک ایسی حقیقی انسانی تہذیب ہے جس کی نظر میں انسانیت کی قدر و قیمت ہے۔ وُہ تمام انسانوں کو صرف حق اور خیر کے معیار سے دیکھتی ہے اور اس کی نگاہوں میں صرف اعمال کی سیاہی اور سفیدی کا اعتبار ہے، پوست کی سیاہی اور سفیدی معتبر نہیں:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔

"جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وُہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بھر بُرائی کی ہوگی وُہ بھی اُسے دیکھ لے گا" (زلزال: ۷، ۸)

## ترقی یافتہ جاہلیّت کو بھی اس سبق کی ضرورت ہے:

یہ صحیح ہے کہ پچھلے پچاس سالہ دَور کے بعد، اب یہ حقیقت کسی کے لیے ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے کہ سفید و سیاہ نسلوں میں محض رنگ کی بنا پر فرق کرنا ایک احمقانہ حرکت ہے اور کوئی ترقی یافتہ تہذیب، اپنے معاشرے میں اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتی اور ہماری تہذیب سے تو اس کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ جس نے محبت اور مساوات میں دُنیا کی تمام تہذیبوں سے زیادہ شہرت حاصل کی، اس لیے ہمارا اپنی تہذیب کی اس خصوصیت پر گفتگو کرنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ اس دَورِ ترقی کے اندر اور اقوامِ متحدہ کی تشکیل اور بنیادی حقوق کے چارٹر کے اعلان کے باوجود ہمیں ایسے مسائل پر لکھنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے، کیونکہ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی لعنت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم آئے دن اس کے متعلق دلخراش باتیں سنتے رہتے ہیں۔[۱]

---

[۱]: اور اب روڈیشیا میں بھی (مترجم)

کینیا میں استعمار کے خوفناک مظالم دُنیا کے سامنے ہیں، امریکہ میں حبشیوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ جو لوگ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے داعی ہیں اور جو لوگ کینیا کے سیاہ فاموں پر اقتصادی مظالم کر رہے ہیں اور جو امریکہ کے حبشیوں کو سخت ترین عذاب دے رہے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی مشرقی اقوام کا فرد نہیں ہے، تاکہ اسے رجعت پسندی، پسماندگی اور حماقت کا طعنہ دیا جا سکے۔ بلکہ یہ سب لوگ یورپ کی بزعمِ خویش متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کے فرزند ہیں اور جو اقوامِ متحدہ میں شامل اہم ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔ یورپ کے یہ نام نہاد فرزندانِ تہذیب ہمیشہ اہلِ مشرق کو پسماندگی، رجعت پسندی اور تعصب کا طعنہ دیتے رہتے ہیں لیکن وُہ خود اپنے ہاں جو کچھ کر رہے ہیں، وُہ کسی کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ جو حکومتیں یہ مذموم حرکت کر رہی ہیں وُہ اقوامِ متحدہ کے اہم مبصروں میں شمار ہوتی ہیں۔ امریکہ اس وقت پوری اقوامِ متحدہ کو کنٹرول کر رہا ہے، برطانیہ یورپ کی وُہ بڑی حکومت ہے جس کو اپنی جمہوریت پر ناز ہے، جنوبی افریقہ وہاں کی یورپی نوآبادی ہے جو اس خطّہ میں سفید فام یورپ کے استعمار کی ایجنٹ ہے، اور جو اب وہاں حکومت کر رہے ہیں، یہ بھی تہذیبِ دنیا میں اہم ملک شمار ہوتا ہے۔ جنوبی امریکہ بھی اقوامِ متحدہ کا ایک اہم ملک ہے اور اقوامِ متحدہ کے متوسط طبقے کی حکومتوں میں، اس کی بات کافی چلتی ہے۔ تہذیب کی علمبردار یہ وہ حکومتیں ہیں، جو عین بیسویں صدی میں، تاریخِ انسانیت کے اِس بدترین جُرم کا ارتکاب کر رہی ہیں، جس کا تاریخِ انسانیت میں دُور تک پتہ نہیں چلتا۔ یعنی خود انسان کا اپنے بھائی انسان پر ظلم و ستم توڑنا نہ اس لیے کہ وُہ ناتواں اور جاہل ہے بلکہ محض اس لیے کہ وُہ سیاہ فام ہے۔

## آئینہ دیکھیے:

حکومت مغربی افریقہ نے نسلی امتیاز کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے اور اس نے سیاہ و سفید اقوام کے لیے علیحدہ علیحدہ حقوق و فرائض مقرّر کر رکھے ہیں اور اقوامِ متحدہ

کے ایشیائی افریقی گروپ کے مسلسل احتجاج اور پُرجوش مخالفت کے باوجود، وُہ اپنی پالیسی پر مصر ہے۔ برطانیہ، کینیا میں وطن پرست اور حریت پسند تحریک ماؤ ماؤ پر مظالم ڈھارہا ہے اور ان کا اجتماعی قتل ہو رہا ہے۔ وہاں وہ ۱۹۱۵ء کے نافذ شدہ قانون اراضی پر اصرار کر رہا ہے۔ جس کی رُو سے، صرف ۲۹ ہزار سفید فاموں کو چالیس لاکھ پچپن ہزار افریقیوں سے بھی زیادہ زمین کا مالک قرار دے دیا گیا ہے۔ اور ان کی حالت یہ ہے کہ ان بیچاروں پر، ان کے گھروں، زمینوں اور کام کے دوران حملہ کر دیا جاتا ہے حالانکہ وہ ملک کے اصل باشندے ہیں اور ملک کی دولت اور حکومت کے صحیح حقدار وہی ہیں۔ مسٹر "سیرالیوٹ" جو کینیا کے پہلے اور آزاد مندوب تھے، جن کا تقرر ۱۹۵۵ء میں ہوا، اپنے ایک بیان میں کینیا کی حکومت کی پالیسی کی وضاحت یوں کرتے ہیں: "زیر حفاظت کینیا کی اندرونی حالت یہ ہے کہ وہاں تمام زمین سفید فاموں کے لیے ہے اور یہ ایک قسم کی منافقت ہوگی، اگر ہم صاف صاف نہ کہیں کہ کینیا میں سفید فاموں کے مفاد کو غلبہ حاصل ہے۔ کینیا کی سیاست، اس کی پالیسیاں، اس کی قانون سازی سے صاف صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہاں ایک سفید استعمار قائم کیا جا رہا ہے۔ آج تک کینیا کے مغربی حکمران ایسی پالیسی پر گامزن ہیں کہ زمین تمام سفید فاموں کو حاصل ہو جائے۔ اور وہ اس کی پیداوار اور برکات کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔

وہاں کے نرالے قوانینِ اراضی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب زمین کا رقبہ ۵۰۰۰ ایکڑ سے زائد نہ ہو تو حکمرانوں کو یہ اختیار ہے کہ وُہ اسے بالکل ایک معمولی معاوضے کے بدلے، ۹۹۹ سال کے پٹہ پر دے دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہاں یورپین اقوام کے پاس اوسط زمین ۵۰۰ ایکڑ فی کس ہے لیکن اس کے بالمقابل وہاں کے اصل باشندوں کے پاس صرف ۸ ایکڑ فی کس ہے، حالانکہ وُہ اس ملک کے اصل مالک ہیں اس کے علاوہ وہاں سیاہ فاموں اور گوروں کو علیحدہ رکھنے کے لیے، سیاہ فام آبادی کے لیے بالکل جداگانہ رہائشی علاقے متعین کر دیے گئے ہیں اور وُہ کسی

وقت بھی سفید فاموں کے علاقے میں نہیں جا سکتے اور جب ان سفید فاموں کو اس کی اشد ضرورت پڑتی ہے اور وہ ان سیہ فاموں سے محنت و مشقت اور بیگار لینا چاہتے ہیں تو کام ختم ہوتے ہی انھیں سفید فام زمینداروں کے ٹھکانوں سے دُور اپنے علاقوں میں، اپنی جھونپڑیوں کی طرف بھاگنا پڑتا ہے اور یہ بھی اس لیے کہ ان کے کام کی اُجرت بہت ہی کم دی جاتی ہے ورنہ ان کو اس حال میں بھی اجازت نہ دی جاتی۔

## یہ امریکہ ہے:

جب ہم امریکہ کے سیاہ فاموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں دردانگیز مظالم کا پتہ چلتا ہے اور ایک دفعہ تو انسان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ امریکہ ایک نیا برِ اعظم ہے اور مہذب ہونے کا مُدعی ہے۔ امریکہ پہنچتے ہی، ہر آنے والے کو نیویارک کی بندرگاہ میں آزادی کا ایک مجسمہ نظر آتا ہے، جو ہر آنے والے کا استقبال کرتا ہے۔ اس مجسمے کے نیچے یہ لکھا ہے:

> "اپنے بیکس، مصیبت زدہ اور غلام عوام کو ہمارے حوالہ کیجیے تاکہ وہ آزادی کی زندگی بسر کر سکیں۔ تم اپنے گنجان ساحل کی ردی کو میری طرف بھیجو۔ وہ لوگ جن کا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ وطن، بھیجیے میں حاضر ہوں اور سنہری دروازے کے قریب اپنی مشعل لیے کھڑا ہوں"

ہاں انسانی حُریت کے اس دعویدار ملک کے اندر، جس کی تمام بندرگاہوں اور شہروں میں سے، سب سے بڑے شہر میں آزادی کا یہ مجسمہ نصب ہے، سیاہ فاموں پر مظالم ہو رہے ہیں۔ یہ انسانی تاریخ کا بدترین جُرم ہے۔ ہم اس سلسلے میں اپنی جانب سے کچھ کہنا نہیں چاہتے بلکہ اس قوم کو اعتراف ہے کہ وہ یہ سب جو کچھ کر رہی ہے امر واقعہ بھی یہی ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ سوچ سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ جیمز بیرنڈ امریکی سینٹ کے ممبر کہتے ہیں:

"کسی سیاہ فام کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ سیاسی مساوات کے خیالات کو ذہن میں بھی لائے جیسا کہ جنوبی ریاستوں میں ہو رہا ہے۔ یہ ملک سفید فاموں کا ہے اور اسی پوزیشن میں رہے گا۔"

## تن ہمہ داغ دار شُد :

امریکہ میں، حبشیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم مختلف قسم کے ہیں اور یہ مختلف میدانوں میں کیے جاتے ہیں مثلاً ثقافت کے میدان ہی کو دیکھیے کہ امریکہ کی قریباً بیس ریاستوں میں سیاہ آبادی کو اجازت نہیں ہے کہ سفید آبادی کے ساتھ ایک ہی مدرسہ میں یا ایک ہی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر سکے ہسیسپی کے دستور کی دفعہ ۲۰۷ میں یہ صاف صاف لکھا ہے :

"اس میدان ــــ یعنی تربیت و تعلیم کے میدان میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ گوروں کے بچوں اور حبشیوں کے بچوں کی تعلیم کا بند و بست علیحدہ علیحدہ ہو، لہٰذا اس سلسلہ میں دونوں کے مدارس علیحدہ ہوں گے۔"

فلوریڈا کی ریاست نے تو نصابِ تعلیم میں بھی امتیاز ضروری سمجھا ہے اور وہاں گوروں اور کالوں کو پڑھائی جانے والی کتابیں تک علیحدہ ہیں۔ امریکہ کی تمام ریاستوں میں کسی سفید فام کا کسی حبشی عورت سے نکاح نہیں ہو سکتا اور نہ کسی حبشی مرد کا کسی سفید فام عورت سے نکاح ہو سکتا ہے۔ مسیسپی میں یہ نکاح آئینی طور پر باطل ہے، بلکہ وہاں کسی سفید فام کا ایسے فرد سے بھی نکاح نہیں کیا جا سکتا جس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کا ⅛ حصہ بھی کسی سیاہ فام کا ہو۔

مزدوروں کے میدانِ عمل میں جو امتیاز ہے، اس کی حالت یہ ہے کہ کارخانہ میں کسی حبشی کا کسی سفید کے ساتھ ایک ٹیبل پر بیٹھنا تو درکنار، وہ ان دروازوں میں بھی داخل نہیں ہو سکتا جو سفید فاموں کے آنے جانے کے لیے مخصوص ہیں۔

سماجی لحاظ سے نسلی امتیاز کا حال یہ ہے کہ قریباً ۳۰ ریاستوں میں، ریل

کے سفر کے دوران، قانوناً حبشیوں کو گوروں سے علیحدہ بیٹھنا پڑتا ہے۔ ریل گاڑیوں بسوں، ٹیلی فونوں کے کمروں میں حبشیوں کے لیے علیحدہ انتظامات ہوتے ہیں۔ ہسپتالوں میں حبشیوں کے کمرے علیحدہ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ دماغی امراض کے ہسپتالوں میں بھی سفید پاگلوں کو سیاہ فام پاگلوں کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت حاصل اور اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب واقع وہ اعلان ہے جو واشنگٹن کے کتوں کے مقبرے کے انچارج صاحب نے کہا کہ آئندہ وہ اپنے مقبرے میں، ان کتوں کو دفنانے کی اجازت نہ دیں گے جن کے مالک سیاہ فام ہوں گے۔ مالکِ مقبرہ کو یہ اقرار ہے کہ مرنے کے بعد کتوں کو اس بات پر کوئی "اعتراض" نہیں ہوتا کہ ان سب کو پہلو بہ پہلو بلکہ ایک ہی گڑھے میں دفن کر دیا جائے لیکن ان کے مہذب آقاؤں کو یہ کب گوارا ہے کہ ان کے معزز کتے بھی کسی کالے کے کتے کے پہلو میں دفن ہوں اور اس سطح پر بھی مساوات جیسی "قبیح" حرکت سرزد ہو جائے۔

## محض ڈھٹائی:

بعض اوقات امریکہ کے سیاستدان، اس شرمناک صورتِ حال کی یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ نسلی امتیاز کی شدت صرف جنوبی ریاستوں ہی میں پائی جاتی ہے اور جنوبی ریاستیں ابھی ابھی اتنی مہذب نہیں ہیں۔ جس قدر شمالی ریاستیں مہذب ہیں لیکن قطع نظر اس سے کہ یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے، واقعات بھی اسے غلط ٹھہراتے ہیں اور ملک کی صحیح صورتِ حال اس کی تکذیب کرتی ہے۔ امریکہ کے تمام شمالی شہروں میں حبشی آبادی ایسے گندے علاقوں، بالشوں اور تختوں سے بنے ہوئے مکانوں میں رہائش پذیر ہے، جہاں غلاظت کے ڈھیر پڑے ہوتے ہیں، اور مکھیوں اور مچھروں کی بھرمار ہوتی ہے۔ لکڑی کے مکانات میں اکثر آگ لگتی رہتی ہے۔ نیویارک کے محلہ ہارلم میں، جو وہاں کے حبشیوں کا محلہ ہے صرف ایک کمرہ میں قریباً انیس حبشیوں کا رہنا سہنا ہوتا ہے۔ وہاں کا ایک اخبار لکھتا ہے: "اگر ہم محلہ ہارلم کی گنجان آبادی کی

نسبت سے تمام امریکی باشندوں کو بسانا شروع کر دیں تو امریکہ کی تمام آبادی شہر نیویارک کے موجودہ نصف حصّے میں آباد ہو سکتی ہے" واشنگٹن کے وہائٹ ہاؤس کے عین بالمقابل اور ابراہیم لنکن کے مشہور اور خوبصورت مجسمے زیر سایہ ایک ایسا محلہ آباد ہے جس میں ڈھائی لاکھ حبشی رہتے ہیں یعنی دارالخلافہ کی تمام آبادی کا ایک چوتھائی حصّہ اور ان کی زندگی بالکل اسی طرح گذر رہی ہے جس طرح چوپائے اپنے باڑوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اسی دارالخلافہ میں ان کو ان مدارس، ہسپتالوں، سیر گاہوں، ہوٹلوں اور ریستورانوں میں داخلہ کی اجازت نہیں ہے، جو سفید فاموں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہاں تک کہ وُہ سفید فاموں کے مخصوص گرجوں میں بھی داخل نہیں ہو سکتے۔ ایک دفعہ واشنگٹن میں جمہوریہ پاناما کا کوئی حبشی کسی کیتھولک گرجے میں داخل ہو گیا اور عین اس وقت جبکہ وُہ اپنی نماز میں مشغول تھا، اُس کو کسی پادری نے کاغذ کا ایک پرزہ دیا، جس پر واشنگٹن کے اس کیتھولک گرجے کا پتہ درج تھا جو سیاہ فاموں کے لیے مخصوص تھا اور جب اس پادری سے اس حرکت کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا، اس شہر میں حبشی کیتھولک لوگوں کے لیے مخصوص گرجے موجود ہیں۔ یہ حبشی وہاں اپنے رب کی عبادت کر سکتا ہے۔ یہ طرزِ عمل ان لوگوں کا ہے جو انسانیت کو یہ بشارت دیتے پھرتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام تمام عالمِ انسانیت کے نجات دہندہ ہیں۔

ایسی حقارت آمیز فضا میں غربت و بدحالی سے دوچار اور مختلف امراض کا شکار قریباً ڈیڑھ کروڑ حبشی آبادی، ممالک متحدہ امریکہ میں زندگی کے تلخ ایام گذار رہی ہے، جو پوری آبادی کا قریباً دسواں حصّہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود امریکہ اقوام متحدہ میں اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وُہ حُریت اور آزادی کا علمبردار ہے اور تمام قوموں کی سلامتی اور آزادی چاہتا ہے۔

## شھد شاھد من اھلھا:

یہاں بطور شہادت ایک امریکی مصنف ہیری ہاٹی ورڈ کی کتاب "حبشیوں کی

آزادی" سے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں، جو اس حُریت و آزادی کی حقیقت بتا رہے ہیں، جس کا امریکہ بڑے طمطراق سے دعویٰ کرتا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ سوائے جنوبی افریقہ کے، نسلی بنیادوں پر کسی قوم کو اپنا غلام سمجھتے ہوئے ذلیل و خوار نہیں کیا گیا جس قدر ہمارے ملک کے اندر حبشی آبادی کو کیا گیا ہے، اگرچہ غلامی اپنے معروف معنی کے لحاظ سے ختم ہو چکی ہے کہ مالک اپنے غلام کا اس طرح مالک ہو جیسا کہ وہ سامان کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن ایک طبقاتی نظام کی کارفرمائی کی بنا پر غلامی اب بھی موجود ہے اور آج غلام سازی کی شکل یہ ہو گئی ہے کہ گوروں کے لیے تو خوشگوار و خوشحال زندگی بسر کرنے کے سارے لوازم موجود ہوں اور سیاہ فام آبادیوں کو ان سے پست تر درجے کے مقامات میں رکھا جائے اور اس پالیسی کے استحکام کے لیے مختلف ذرائع سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات تو قتل اور ہلاکت کے احکام کی صورت میں، اس پالیسی کا نفاذ ہوتا ہے، جو اقتدار سے بہرہ مند دُنیا حبشی آبادی کے متعلق جاری کرتی رہتی ہے یا ظالمانہ اور غیر منصفانہ قانونی احکام کی شکل میں اور کبھی ایسے رسم و رواج کی شکل میں جس کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں نازل کی ہے۔"

## اور سُنیے گا:

امریکہ کے مشہور ماہر معاشیات "مسٹر نکر ٹبیر لو" کہتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ شمالی ریاستوں کے صنعت کار جنھوں نے امریکہ کی خانہ جنگی کے زمانہ میں فیڈرل گورنمنٹ پر قبضہ کر لیا تھا، حبشی آبادی کو فی الحقیقت آزاد کرنا ہی نہ چاہتے تھے، بلکہ وہ چاہتے تھے کہ امریکہ کی جنوبی ریاستیں جو سیاہ فام غلاموں کی واحد مالک بنی بیٹھی ہیں، اور

ان سے بے انتہا فائدہ حاصل کر رہی ہیں، تنہا یہ استحصال نہ کریں بلکہ وُہ بھی شریک ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈیماکریٹک پارٹی اور فوج نے جنوبی ریاستوں میں یہ سیاسی چال چلی کہ غلاموں کے سابق مالکوں سے گٹھ جوڑ کر کے سیاہ فاموں کو نئے سرے سے غلام بنایا جائے۔"

## یہ بھی دیکھتے جائیے:

یہی مصنف کہتا ہے:

"نسلی امتیاز کا زہر، ملک کے طول وعرض میں بُری طرح پھیل چکا ہے اور امریکی زندگی کے رگ وریشہ میں اس قدر سرایت کر چکا ہے کہ اب جمہور عوام اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ حبشی اقوام اور دُوسری اقلیتوں کی تحقیر و تذلیل کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور اس تحقیر و استخفاف کے لیے نت نئی تعبیریں اور طرح طرح کے اشارے وضع کرتے رہتے ہیں۔"

## دو اور گواہیاں:

مسٹر جاک لیبٹا اور ڈلی موڑ کہتے ہیں۔

"امریکہ کا اقوام عالم میں اس لحاظ سے شہرہ ہے کہ اس کا نشانِ امتیاز "تمثالِ حریت" ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے ملک میں ہر آنے والے اور پناہ لینے والے کو خوش آمدید کہیں، خواہ وُہ ظلم و ستم کی سخت گیریوں سے بھاگ کر آیا ہے یا مظالم و مصائب کی دسترس سے دُور بھاگنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جب سے آزادی کا یہ مجسمہ نصب ہُوا ہے امریکہ سے آزادی اور مساوات کے معنی ہی ختم ہو چکے ہیں۔"

## لرزہ خیز:

سب سے آخر میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں شہر کولمبیا میں، ایک حبشی اور اس کی والدہ اپنے ریڈیو کی کوئی خرابی درست کرانے کے لیے ریڈیو کے پرزوں کی مرمت کرنے والی کسی دوکان پر گئے پھر جب دُکاندار کی مطلوبہ اُجرت ادا کر چکے اور ریڈیو چلانا چاہا تو دیکھا کہ خرابی علیٰ حالہٖ باقی ہے، اور کسی طرح کی کوئی مرمت نہیں کی گئی ہے۔ اس پر حبشی کی والدہ نے کہا کہ تیرہ ڈالر لے لیے اور ریڈیو ہنوز گونگا ہے؟ اس گستاخی پر صاحبِ دُکان نے حکم دیا کہ اسے دُکان سے باہر نکال دیا جائے۔ نوکر نے اس غریب عورت کے ٹھوکر ماری اور وہ منہ کے بل گر پڑی۔ اس پر حبشی کو غصہ آیا اور اس نے نوکر کو مارا اور اُسے زمین پر گرا دیا۔ اب کیا تھا۔ پاس پڑوس کے سفید فاموں نے چیخ و پکار شروع کر دی کہ قتل کر دو اس بدکردار کو، ایک بھیڑ اکٹھی ہوگئی جو چیخ کر کہہ رہی تھی کہ ہم ان دونوں سے بدلہ لے کر رہیں گے۔ یاد رہے کہ امریکیوں کی زبان میں حبشیوں سے بدلہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ بغیر کسی عدالتی کارروائی کے فوراً ان کا سر تن سے جدا کر دیا جائے اور کسی دُوسری سزا کے سوچنے کا سوال ہی نہیں۔ بہر حال ان حملہ آوروں سے انہیں بچا لیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا لیکن سفید فاموں کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا، وُہ حبشیوں کے ایک محلہ پر ٹوٹ پڑے تاکہ کسی حبشی عورت اور اس کے بیٹے سے انتقام لیا جائے اور پولیس اس بدقسمت محلّہ کا محاصرہ کیے رہی اور غریب حبشیوں کو ان کے گھروں سے نکلنے نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بپھرے ہُوئے سفید فاموں کے غول نے توڑ پھوڑ شروع کر دی، ان کے مکانات میں آگ لگا دی اور ان غریب حبشیوں پر گولیاں چلائیں، چنانچہ بہت سے حبشی زخمی اور ہلاک ہُوئے اور یہ سب مظالم محض اس لیے توڑے گئے کہ اس حبشی عورت نے ایک جائز شکایت کا اظہار کیوں کیا کہ اُجرت تو لے لی اور ریڈیو جُوں کا تُوں واپس کر دیا۔ یہ ہے آزادی و مساوات کی وُہ سنہری مثال، جسے بیسویں صدی کی روشن دماغ مغربی تہذیب پیش کر رہی ہے۔

---

## اور یہ ہیں ہماری تہذیبی روایات :

اب اس کے بالمقابل سنہ ۹۹ھ یعنی تیرہ سو سال قبل کا ایک واقعہ سنیے ایک سیاہ فام لڑکی فرقونہ نے، حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کو ایک خط لکھا کہ میرے گھر کی دیوار بہت نیچی ہے، اور لوگ اس سے داخل ہو کر میری مرغیاں چرا کر لے جاتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو اطلاع دی کہ اس کی شکایت کے متعلق والیٔ مصر کو لکھ دیا گیا ہے کہ وہ دیوار کو اونچا کر دے اور گھر کی حالت درست کر دے۔ اور والیٔ مصر کو لکھا گیا کہ خط ملتے ہی وہ بذاتِ خود جا کر اپنی نگرانی میں اس عورت کی دیوار کو بلند کرا دیں۔ اس وقت والیٔ مصر، ایوب بن شرحبیل تھے خط کا متن یہ تھا :

"فرقونہ ذی اصبح کی آزاد کردہ لونڈی نے مجھے لکھا ہے کہ اس کے صحن کی دیوار بہت نیچی ہے اور رات کو چور داخل ہو کر اس کی مرغیاں چرا لیتے ہیں وہ چاہتی ہے کہ اس کو مضبوط کر کے بلند کر دیا جائے۔ لہٰذا میرا یہ مکتوب دیکھتے ہی تم خود سواری کسو اور تم بنفسِ خود روانہ ہو جاؤ اور اپنے سامنے اس کی دیوار بلند اور مضبوط کرا دو۔"

جب ان کو خط ملا تو فرقونہ کے مکان کی تلاش میں گھر سے نکلے۔ معلوم ہوا کہ ایک سیاہ فام غریب عورت ہے۔ گورنر نے اپنی نگرانی میں امیر المؤمنین کے حکم کی تعمیل کی۔

یہ ہے وہ سلوک جو ہم آج سے تیرہ سو سال قبل حبشیوں سے کرتے رہے تھے ہماری تہذیب کی شاندار روایات کی ایک مثال ہے یہ۔

---

# پانچواں باب

# مذہبی رواداری

# مذہبی رواداری

ہماری زندۂ جاوید تہذیب انسانیت پروری کا یہ ایک نیا پہلو ہے۔ اسلامی تہذیب کی یہ خصوصیت عقائد و نظریات کی تاریخ میں بھی نئی ہے اور قدیم تہذیبوں کی تاریخ میں بھی نئی ہے، جو بعض ادیان یا بعض اقوام کی پیدا کردہ تھیں۔ اسلام نے جب ہماری تہذیب کی بنیاد ڈالی تو اس نے سابقہ ادیان کی نسبت تنگ نظری کا رویہ اختیار نہ کیا۔ اور نہ دوسرے مذاہب و افکار کے خلاف کسی قسم کا تعصب پیدا کیا۔ بلکہ اس سلسلہ میں تہذیبِ اسلامی کا شعار یہ رہا: فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ (سورۂ زمر: ۱۷) (سو میرے ان بندوں کو خوشخبری دیجیے جو توجہ سے بات سنتے ہیں۔ پھر اس میں سے اچھی بات پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں)

## مذہبی رواداری کے اصول و مبادی:

چنانچہ مذہبی رواداری کے باب میں ہماری تہذیب کے اصول و مبادی یہ ہیں:

۱۔ قرآن مجید اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ تمام سماوی دین ایک سرچشمہ سے

چھوٹے ہیں۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (الشوریٰ : ۱۳)

"اللہ نے تمہارے لیے وُہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم نوح کو دیا گیا اور جس کا حکم آپ کو بھی دیا گیا۔ اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی دیا کہ قائم کرو دین کو اور اس میں اختلاف نہ کرو۔"

۲۔ یہ کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کا درجہ نفس رسالت کی حیثیت سے مساوی ہے، اور اس باب میں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وُہ تمام انبیاء پر ایمان لائیں۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (البقرہ : ۱۳۶)

"کہو ایمان لائے ہم اللہ پر اور جو کچھ ہماری طرف نازل کیا گیا اس پر ایمان لائے اور جو کچھ اُتارا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر، سب پر ایمان لائے، اور اس پر بھی جو دیے گئے موسیٰ اور عیسیٰ اور جو دُوسرے انبیاء کو، ان کے رب کی جانب سے دیا گیا، ہم (بلحاظِ نبوّت) نبیوں میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں۔"

۳۔ یہ کہ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے بلکہ اس کا اختیار کرنا لوگوں کی رضا و رغبت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے) اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (یونس : ۹۹) کیا آپ

لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مومن ہو جائیں)

۴۔ یہ کہ تمام ادیان کی عبادت گاہیں قابلِ احترام ہیں۔ ان کی حمایت اور مدافعت بھی اس طرح واجب ہے جس طرح مسلمانوں کی عبادت گاہ، مسجد کی واجب ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔ (الحج : ۴۰)

"اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا تو نہ صرف مدرسے اور عبادت خانے گرا دیے جاتے۔ نیز وہ مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بکثرت ہوتا ہے"

۵۔ یہ کہ لوگوں کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ محض مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کو قتل کریں یا ایک دوسرے پر تعدی کریں۔ بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ نیکی کے کاموں کو فروغ دینے اور برائی کو مٹانے میں باہمی تعاون کریں۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔

"نیکی اور پرہیز گاری میں باہمی تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو"

البتہ دینی امور میں جو اختلافات رونما ہو چکے ہیں ان کا فیصلہ خود اللہ جل شانہٗ قیامت کے دن فرمائیں گے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ (بقرہ : ۱۱۳)

"یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی کسی درجے میں بھی نہیں ہیں، حالانکہ وہ کتاب اللہ ہی پڑھتے ہیں۔ ایسی ہی باتیں دوسرے جاہل لوگ بھی کرتے ہیں تو ان کے درمیان ان

اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن خود اللہ ہی کریں گے"۔

۶- یہ کہ دُنیا کی اس زندگی میں لوگوں کو ایک دُوسرے پر فضیلت دیے جانے کا معیار اور خود عنداللہ معیارِ فضیلت یہ ہے کہ کون کتنا تقوٰی شعار ہے اور اس نے دُوسروں کے لیے نیکی اور بھلائی کے کس قدر کام کیے ہیں۔ حضور فرماتے ہیں: الناس کلھم عیال اللہ فاحبھم الیہ انفعھم لعیالہ (تمام لوگ اللہ تعالیٰ کے گویا عیال ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے اسی کو زیادہ محبوب سمجھتے ہیں جو اس کے عیال کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہو) اور ارشادِ الٰہی ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (بیشک تم میں اللہ کے ہاں زیادہ معزز وُہ ہے جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو۔)

۷- یہ کہ دینی اور مذہبی اختلاف کو نیکی، صلہ رحمی اور ضیافت میں حائل نہ ہونا چاہیے۔

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ (المائدہ: ۵)

"آج تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ اور تمہارے لیے مؤمنات میں سے پاکدامن عورتیں اور اہلِ کتاب میں سے پاکدامن عورتیں حلال ہیں (المائدہ: ۵)

۸- یہ کہ اگر لوگوں کے ادیان مختلف ہوں تو وُہ ان کے متعلق ایک دوسرے سے بحث و مباحثہ اور مناظرہ کر سکتے ہیں مگر اچھے انداز سے، وقار و متانت، احترام کی حدُود میں رہ کر، اور معقول دلیل سے، مخاطب کو مطمئن کرنے کی غرض سے، وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَھْلَ الْکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (اور اہلِ کتاب سے بحث و مباحثہ بطریقِ احسن ہی کرو) اسلام نے مخالفین کے ساتھ بدتمیزی کو جائز نہیں رکھا۔ اور نہ ان کے باطل عقائد کی بنا پر

دشنام طرازی کی اجازت دی ہے۔ اگرچہ وہ بُت پرست ہی کیوں نہ ہوں : ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (اور تم سب وشتم نہ کرو ان لوگوں کو جن کو وہ پکارتے ہیں، اللہ کے سوا، کیونکہ پھر وہ اپنی جہالت کے سبب دشمنی کی بنا پر اللہ سے گستاخی کر بیٹھیں گے)

۹۔ ہاں جب اُمّت مسلمہ پر، اس کے عقاید و نظریات کی بنا پر، زیادتی کی جا رہی ہو تو دشمنوں کی فتنہ انگیزی کو ختم کرنے اور اپنے نظریات کو بچانے کے لیے اس تعدی کے خلاف لڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۔

"اور ان سے اس وقت تک لڑو جب تک فتنہ و فساد ختم نہ ہو جائے اور بندگی صرف اللہ کی خالص نہ ہو جائے۔" (البقرہ : ۱۹۳)

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ (الممتحنہ : ۹)

"درحقیقت اللہ تمہیں ان لوگوں سے تعلقات و موالات رکھنے سے منع کرتے ہیں جو تمہارے ساتھ تمہارے دین کے معاملہ میں لڑیں اور جنہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں شریک ہوئے۔"

۱۰۔ لیکن جب اُمّت مسلمہ اس قوم پر غالب آ جائے جس نے اُمّت کے دین یا اس کی آزادی کے حق میں جارحیت اور تعدی کی روش اختیار کر رکھی تھی تو پھر اُمّت کے لیے جائز نہیں رکھا گیا کہ وہ اس مفتوح قوم سے اس طرح انتقام لے کر اسے اپنے دین کو ترک کرنے پر مجبور کرے یا اسے اپنے پسندیدہ عقاید رکھنے کے سبب اس پر سختی اور تشدد کرے، بلکہ یہ کافی ہے کہ وہ مفتوح قوم اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر لے اور خلوص کے ساتھ اس پر قائم رہے۔ تاکہ ان کی پوزیشن یہ ہو جائے کہ "لھم ما لنا وعلیھم ما علینا" (ان کے وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور ان کے وہی فرائض ہیں جو ہمارے ہیں)۔

اسلام میں مذہبی رواداری کے بارے میں یہ وہ اسلامی بنیادیں ہیں جن پر ہماری تہذیب کی عمارت اُٹھی ہے۔ یہ اصول ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء و رسل پر ایمان لائے اور ان تمام کا تذکرہ عظمت و احترام سے کرے۔ ان میں سے کسی نبی کے پیروکاروں پر کوئی زیادتی نہ کرے۔ ان کے ساتھ معاملات اور تعلقات اچھے رکھے، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئے۔ نرمی سے بات کرے، ان کا ایک اچھا پڑوسی ثابت ہو اور ان کی ضیافت قبول کرے، اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح بھی کر سکتا ہے تاکہ خاندانوں کے درمیان تعلقات پیدا ہوں اور خونی رشتے قائم ہوں —— پھر اسلام نے اسلامی حکومت پر یہ بھی فرض کیا ہے کہ وہ ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرے، ان کے عقائد میں مداخلت نہ کرے، کسی مقدمہ کے فیصلے میں ان پر زیادتی نہ کرے اور عام حقوق اور فرائض کے باب میں ان کو مسلمانوں کے مساوی درجہ دے، ان کی زندگی، ان کی آبرو اور ان کے مستقبل کی حفاظت کی اس طرح ضمانت دے جس طرح وہ ایک مسلمان کی زندگی، اس کی آبرو اور اس کے مستقبل کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادیں جن پر اسلامی تہذیب کی تعمیر ہوئی اور دُنیا نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ دین ایک تہذیب کی تخلیق کر رہا ہے، بغیر اس کے کہ وہ دُوسرے ادیان کے خلاف ذرہ بھر تعصب رکھتا ہو۔ اور یہ تہذیب غیر مسلموں کو اجتماعی کام کے میدان سے باہر نکال نہیں پھینکتی ہے۔ نہ وہ غیر مسلموں کو اپنے مقام سے گرانی ہے۔ جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہذیب اسلامی کی بنیاد رکھی، اس کا یہی طرزِ عمل رہا۔ لیکن جب سے مسلمانوں پر زوال آیا ہے انھوں نے اپنے اصولوں کو ترک کر دیا اور وہ خدا اور رسول کے احکام کو بھول بیٹھے اور دین سے نابلد ہوتے گئے تو اس مذہبی رواداری سے بھی غافل ہوتے چلے گئے۔

## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں :

جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی جہاں یہودیوں

کی ایک بڑی تعداد سکونت پذیر تھی تو آپ نے وہاں اسلامی حکومت کی سرنشین کے سلسلہ میں جو پہلا کام کیا وُہ یہ تھا کہ آپ نے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ طے کیا جس کی رُو سے اسلامی حکومت کے لیے یہ ضروری قرار پایا کہ یہودیوں کے عقائد کا احترام کیا جائے گا اور ان کو ہر قسم کی ایذا سے بچایا جائے گا۔ اور یہ کہ مدینہ پر حملہ آور کے مقابلہ میں وُہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ اس معاہدہ کے ذریعہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے مذہبی رواداری کے اصول ومبادی کو اسلامی تہذیب کے ضمیر میں اس کے پہلے دن ہی سے داخل کر دیا۔

بعض اہلِ کتاب حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسی بھی تھے۔ آپ ہمیشہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہتے تھے۔ ان کو ہدیے بھیجتے۔ ان کے ہدیے قبول فرماتے حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل سے ایک یہودی عورت کی "یہودیت" نے اپنی عداوت کو بروئے کار لانا چاہا، چنانچہ اس نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کو ایک دن بکری کی ایک بھُنی ہُوئی ران زہر آلود کر کے بھیجی، کیونکہ وُہ جانتی تھی کہ حضور اس کے یہاں سے آئے ہوئے ہدیے قبول فرمایا کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک اچھے پڑوسی جیسے تعلقات رکھتے ہیں۔ جب حبشہ کے عیسائی مدینہ طیبہ آئے تو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا، اور ان کی مہمان نوازی اور خدمت خود اپنے ذمّہ لی۔ اور اس دن جو کچھ آپ نے فرمایا اس میں سے یہ فقرہ قابلِ غور ہے:

"یہ لوگ ہمارے ساتھیوں کے لیے معزز حیثیت رکھتے تھے اس لیے میں نے پسند کیا کہ میں بذاتِ خود ان کی تعظیم وتکریم کروں۔"

ایک دفعہ نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا۔ اس کو بھی آپ نے مسجد نبوی میں اُتارا اور ان کو اجازت دی کہ وہ اپنی نماز اپنے طریقہ پر مسجد نبوی ہی میں ادا کریں چنانچہ وُہ لوگ مسجد نبوی کی ایک جانب میں اپنی نماز پڑھتے۔ اور رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ دوسری جانب نماز پڑھتے۔ جب ان لوگوں نے اپنے دین

کے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث کی، تو آپ نے نہایت توجہ سے ان کی باتیں سنیں اور بڑی نرمی، احترام اور حسنِ اخلاق سے بحث کا جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس کا ہدیہ قبول فرمایا اور اس کی بھیجی ہوئی لونڈی کو بھی قبول فرمایا اور اس سے زنا شوئی کے تعلقات قائم ہوئے اور اس کے بطن سے آپ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے، جو چند مہینے زندہ رہے اور آپ کی نصیحتوں میں سے ایک یہ بھی ہے "قبطیوں کے خیر خواہ رہو کیونکہ ان میں تمہارے رشتے ہیں۔"

## خلافتِ راشدہ کے دور میں:

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاءؓ نے آپ کے بعد انہی خطوط پر حکمرانی کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بلند پایہ، انسانیت دوستی اور مذہبی رواداری کی پالیسی کو قائم رکھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہ وہاں کے عیسائیوں کی پیش کردہ اس شرط کو قبول فرماتے ہیں کہ وہاں کوئی یہودی نہ رہے گا۔ وہ بیت المقدس کے بڑے گرجے میں ہیں کہ نماز عصر کا وقت ہو جاتا ہے، لیکن وہ گرجے کے اندر نماز محض اس لیے نہیں پڑھتے کہ کہیں اس میں ان کا نماز پڑھنا، مسلمانوں کے اس مطالبہ کا ذریعہ نہ بن جائے کہ یہ مسلمانوں کی مسجد ہو گئی ہے لہٰذا مسلمانوں کے قبضہ میں رہنا چاہیے۔ مصر کی ایک عورت شکایت لاتی ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے اس کا گھر اس کی مرضی کے خلاف مسجد کے اندر شامل کر دیا ہے۔ آپ نے عمرو بن العاص سے جواب طلب کیا تو انہوں نے بتایا کہ مسلمان زیادہ ہو گئے تھے اور مسجد میں نہ سما سکتے تھے۔ مسجد سے ملحق اس عورت کا گھر تھا۔ اس کو مکان کی قیمت پیش کی گئی اور قیمت بھی مکان کی حیثیت سے کہیں زیادہ دی جا رہی تھی۔ لیکن اس نے بیچنے سے بھی انکار کر دیا۔ لہٰذا مجبوراً ہمیں اس کا گھر بزور ڈھانا پڑا اور وہ مسجد میں شامل کر دیا گیا۔ اور اس کی قیمت بیت المال کے اندر جمع کر دی گئی کہ وہ جب چاہے نکال لے ظاہر ہے کہ حضرت عمرو بن العاص کا عذر بالکل معقول تھا، اور ہمارے موجودہ قوانین

بھی اس کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس عذر کو قبول نہ کیا اور حکم دیا کہ مسجد کی وہ جدید عمارت جو اس عورت کے مکان والی زمین پر بنی ہے، ڈھادی جائے، اور اس کا گھر اسی طرح بنا کر دے دیا جائے جس طرح پہلے تھا۔

یہ ہے رواداری کا وہ رنگ جو ہر اس معاشرہ پر طاری رہا ہے، جس پر ہماری تہذیب کے اصول سایہ فگن رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی رواداری کے ایسے مناظر کی مختلف شہادتیں ہمارے سامنے گذرتی ہیں، جن کی کوئی مثال تاریخِ انسانیت میں نہیں ملتی ہے یہاں تک کہ دورِ حاضرہ کی کسی تہذیب میں بھی نظر نہیں آتی۔

## نہ صرف یہ کہ کوئی مداخلت نہیں بلکہ:

ہماری زندۂ جاوید تہذیب میں بارہا دیکھا گیا ہے کہ مسجد اور کنیسہ ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ گرجوں کے مذہبی راہنماؤں کو ان کے ہم مذہبوں کے دینی امور اور کنیسہ سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں مکمل اختیارات حاصل تھے اور اسلامی حکومت ان میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرتی تھی، بلکہ بارہا ایسا ہوا کہ خود وہ اپنے مذہبی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے سے تعدیا دتی کرتے، تو اسلامی حکومت آگے بڑھ کر ان کے درمیان انصاف کرتی اور ان کی مشکلات حل کرنے میں مدد دیتی۔ مثلاً یونانی عیسائیوں کا "ملکی" فرقہ روما کی سلطنت کے عہد میں، مصر کے قبطی عیسائیوں پر ہمیشہ زیادتی کیا کرتا تھا۔ اسی فرقہ کے لوگ مصری قبطیوں کے کینسوں کو لوٹ لیتے تھے۔ جب مسلمانوں نے مصر کو فتح کیا تو انہوں نے قبطیوں کی تمام املاک ان کو لوٹا دیں اور ان کے ساتھ انصاف کیا۔ اس کے بعد مصری قبطیوں نے ملکانیوں کے ساتھ سابقہ مظالم کا انتقام لینا شروع کیا، جو وہ عربوں کی فتح سے پہلے قبطیوں پر کرتے رہے تھے۔ اب کے ملکی فرقہ نے ہارون الرشید کے پاس شکایت کی اور اس نے قبطیوں سے ملکانیوں کی تمام جائدادیں اور گرجے واپس دلا دیے۔ ہارون الرشید نے یہ کارروائی ملکانیوں کے پیٹرآف یارک کے مشورہ کے بعد کی۔

## سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کی فراخ دلی :

اسلامی حکومت میں عیسائیوں کو اپنے مذہبی مراسم کی پوری آزادی تھی اور ان کے رہنماؤں کو اُن کے ہم مذہبوں پر پورے اختیارات حاصل تھے۔ ان کے پرسنل معاملات میں حکومت بالکل دخل نہ دیتی تھی۔ خود عیسائیوں نے اسلام کے نظامِ حکومت کے تحت اس قدر مکمل آزادی کو محسوس کیا، جس کا عشرِ عشیر بھی ان کو سلطنت روما کے عہد میں حاصل نہ تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کی فراخدلی اور رواداری کو زمانہ فراموش نہیں کر سکتا، انہوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس وقت اس شہر کی پوری آبادی عیسائیوں پر مشتمل تھی اور یہ شہر پورے مشرقی کیتھولک عیسائیوں کے لیے پیٹر یارک کا دارالخلافہ تھا۔ سلطان نے پوری آبادی کو امن دیا۔ اور یہ ضمانت دی کہ ان کی جانیں، ان کے اموال، ان کے عقائد، ان کے گرجے اور ان کی صلیبیں سب محفوظ ہوں گے۔ انہیں فوجی بھرتی سے مستثنیٰ قرار دیا۔ ان کے امراء کو یہ اختیارات دیئے کہ وہ خود ان مقدمات کے فیصلے کریں جو ان کے ہم مذہبوں کے درمیان کھڑے ہوں اور اس کے لیے قانون سازی کریں۔ اور اس معاملہ میں حکومت نے کبھی کسی قسم کی مداخلت نہ کی۔ خود وہاں کے عیسائیوں نے سلطان محمد فاتح کے طرزِ عمل اور قسطنطنیہ کے بازنطینی حکمرانوں کے درمیان بہت بڑا فرق محسوس کیا۔ قسطنطنیہ کے بازنطینی حکمران، مذہبی اختلافات میں مداخلت کرتے تھے۔ اور اپنے چرچ کے پیروکاروں کو دُوسرے چرچوں کے پیروکاروں پر فوقیت و فضیلت دیتے تھے۔ چنانچہ عیسائیوں نے جدید نظامِ حکومت کو بیحد پسند کیا اور اس نظام کے اندر مذہبی رواداری کو دیکھ کر بیحد خوش ہوئے جس کی ادنیٰ مثال بھی خود ان کو اپنے مذہبی بھائیوں کے دورِ حکومت میں نہ ملتی تھی۔ روم کے پیٹر یارک کو اس قدر اختیارات دے دیئے گئے تھے کہ اس کی پوزیشن ریاست اندر ریاست کے مشابہ ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ لوگ پانچ سو سال تک اسی حال میں آزادانہ زندگی بسر کرتے رہے اور ان کی یہ آزادی

اس قدر محفوظ و مستحکم تھی کہ ان کو کسی فوج کی ضرورت نہ تھی اور نہ ان کو آزادی کی حفاظت کے لیے کوئی ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا، لیکن یہ کس قدر افسوس ناک (بلکہ شرمناک) حرکت تھی کہ تاریخ میں اپنی نظیر نہ رکھنے والی اس مذہبی رواداری کی بنا پر عیسائیوں کو جو رعائتیں دی گئی تھیں، ان سے انہوں نے نہایت ناجائز فائدہ اٹھایا اور انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدا میں، اہلِ مغرب نے ان بلاد و امصار کے مقامی اقتدار و سیادت کے مظاہر کو ختم کرنے کے لیے خیانت کارانہ چالیں چلیں۔

## کینسہ یوحنا میں ایک منظر:

ہماری تہذیب کی مذہبی رواداری کے مظاہر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب مسلمانوں نے ان ممالک کو فتح کیا، تو اس وقت اکثر گرجوں میں مسلمان اور عیسائی مل کر نماز پڑھتے تھے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، آپ نے نجران کے عیسائیوں کو مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی سہولت دی۔ اور مسجد نبوی کی دُوسری جانب مسلمان اپنی نماز پڑھتے رہے۔ اسی طرح اسلامی فتح کے بعد دمشق کے بڑے کینسہ یوحنا میں ——— وہ جو بعد میں جامع اموی کے نام سے مشہور ہوا ——— مسلمانوں نے عیسائیوں کو اپنے طرز پر عبادت کرنے سے نہیں روکا، بلکہ انہوں نے فراخدلی سے اس میں عیسائیوں کو اپنی نماز ادا کرنے کی اجازت دی، اور عیسائیوں نے خوشی سے اس کا نصف حصّہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا اور مسلمان وہاں عیسائیوں کے ساتھ ساتھ اپنی عبادت کرتے رہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دو مختلف مذاہب کے لوگ اکٹھے ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی اپنی عبادت میں مصروف ہیں۔ مسلمان قبلہ کی طرف رُخ کیے ہوتے ہیں اور وہ لوگ مشرق کی جانب، یہ ایک نادر منظاہرہ تھا جو تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تہذیب اسلامی مذہبی تعصب سے کس قدر پاک رہی اور کس طرح اس میں مذہبی رواداری بدرجۂ کمال پائی جاتی رہی ہے۔

---

## بنو اُمیہ کے دَور میں بلا تفریقِ مذہب مناصب دیے گئے:

اسلامی حکومت کے اندر غایت درجہ کی مذہبی رواداری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اہل ترین افراد کا انتخاب کیا اور اہم عہدے ان کے سپرد کیے اور اس سلسلہ میں انہوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ اس قابل اور اہل آدمی کا مذہب اور عقیدہ کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ خلفائے بنو امیہ اور بنو عباس کے درباروں میں عیسائی اطبّاء بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، اور خلفاء کے ہاں ان کا اُونچا مقام رہا۔ بغداد اور دمشق میں وُہ طبّی مدارس کے، عرصۂ دراز تک انچارج رہے ——— ابن آثال عیسائی حضرت امیر معاویہ کا معالج خاص تھا اور ایک دُوسرا عیسائی سرجون ان کا کاتب تھا۔ مروان نے اثناسیوس کو ایک دُوسرے عیسائی کے ساتھ جس کا نام اسحٰق تھا۔ مصر میں حکومت کے بعض عہدوں پر مقرّر کیا۔ بعد میں وُہ ترقی کرتے کرتے رئیس الدیوان کے اُونچے عہدے پر فائز ہو گئے۔ یہ شخص بڑے رُتبے کا تھا اور دولت مند بھی، اس کے چار ہزار غلام تھے۔ وُہ کئی گاؤں اور باغات کا مالک ہو گیا اور اس کے پاس جس قدر سونا چاندی تھا اس کا تو حساب ہی نہ تھا۔ اس نے الرّہا میں ایک کینسہ تعمیر کرایا۔ یہ کینسہ ان چار سو دوکانوں کے کرایہ سے تعمیر کیا گیا جن کا وُہ مالک تھا اور جس کی شہرت اس درجہ تک پہنچی کہ عبدالملک نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالعزیز کی تعلیم و تربیت کا کام اس کے سپرد کیا۔ یہ عبدالعزیز بعد میں مصر کے گورنر مقرر ہُوئے اور یہ وہی عبدالعزیز ہے جن کے صاحبزادے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز ہیں۔

## بنو عباس کی عہدہ بخشیاں:

جن عیسائی اطبّاء کو خلفاء کے ہاں اُونچے مناصب حاصل ہُوئے ان میں سے ایک جرجیس بن بختیشوع بھی ہے۔ یہ خلیفہ منصور کے مقرّبین میں سے تھا اور منصور کے ہاں اس کا بڑا رُتبہ تھا اور وُہ اس کے آرام، آسائش کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ جرجیس کی ایک

بوڑھی بیوی تھی۔ منصور نے اسے تین خوبصورت لونڈیاں بھیجیں لیکن جرجیس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "میرا دین اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے میں دوسری شادی کروں" اس پر منصور بہت ہی خوش ہوا اور اس کا رتبہ اور بڑھا دیا۔ جب جرجیس بیمار ہوا تو منصور نے اس کو دارالضیافہ میں بلایا اور خود چل کر اس کا حال پوچھنے آیا۔ جرجیس نے منصور سے اپنے وطن جانے کی اجازت چاہی تاکہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ دفن ہو۔ منصور نے اس سے درخواست کی کہ وہ اسلام قبول کر لے تاکہ اس کو جنت نصیب ہو۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہے، خواہ وہ جنت میں ہوں یا دوزخ میں ہوں۔ اس پر منصور ہنسا اور اس کے سفر کی تیاری کا حکم دیا اور دس ہزار اشرفیوں کے ساتھ اس کو اس کے آبائی وطن پہنچوا دیا۔

اس طرح سلمویہ بن بنان عیسائی معتصم کا طبیب خاص تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو معتصم کو بہت ہی دکھ ہوا اور وہ اس کے لیے بہت رویا اور حکم دیا کہ اس کو تمام شاہی اعزازات کے ساتھ، اس کے دین کے مطابق دفن کیا جائے۔ اس طرح بختیشوع بن جبرائیل متوکل کا خاص معالج تھا اور اس کے دربار میں اس کا بہت اونچا مقام تھا، یہ شخص کثرتِ مال اور شاندار لباس اور شان و شوکت کے اظہار میں، خود خلیفہ وقت کا مقابلہ کرتا تھا۔

## غیر مسلم ادباء و شعراء کی عزت افزائیاں:

تقرب اور عزت افزائی کا یہی معاملہ ادباء و شعراء کے ساتھ بھی تھا۔ خلفائے بنو عباس اور خلفائے بنو امیہ اور دوسرے امراء کے درباروں میں تمام ادباء و شعراء بلا امتیاز مذہب و عقیدہ عزت پاتے تھے۔ شرط صرف کمال و مہارت کی تھی۔ چنانچہ ہم سب جانتے ہیں کہ اموی دربار میں اخطل کا کیا مقام تھا۔ اسے بارگاہِ خلافت سے اس بات کی پوری اجازت حاصل تھی۔ کہ وہ جس وقت چاہے بلا روک ٹوک خلیفہ کے پاس پہنچ سکتا تھا، چنانچہ وہ عبدالملک کے پاس دن یا رات کے

جس وقت دل چاہتا، چلا آتا۔ ریشمی قبا پہنے ہوئے ہوتا اور سنہری چین کے ساتھ گلے میں تعویذ نما صلیب لٹکائے ہوئے ہوتا اور اس کی ڈاڑھی پر سے شراب کے قطرات گر رہے ہوتے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے اپنے ایک طویل قصیدے میں انصار مدینہ کی ہجو کی، جس میں وہ کہتا ہے: "واللوم تحت عمائم الانصار" (اور ذلت و ملامت انصار کے عماموں کے نیچے ہے) اس پر انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحد صدمہ ہوا، اور انہوں نے اپنے ایک بزرگ نعمان بن بشیر کو، جنہیں صحابی رسول ہونے کا شرف حاصل تھا، عبدالملک کے پاس بھیجا۔ وہ عبدالملک سے ملے اور اپنی دستار مبارک سر سے اتار کر، اس کا اندرونی حصہ اور اپنا سر عبدالملک کو دکھایا اور پوچھا کہ امیرالمؤمنین بتائیں کہ یہاں "لوم" اور ذلت کہاں ہے؟ عبدالملک نے ندامت کے ساتھ خود معذرت کی اور منت و سماجت سے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ لیکن اخطل کو اس کی اس گستاخی پر کچھ بھی نہ کہا۔

## عام سربرآوردہ مسلمانوں کا اغیار سے سلوک:

اس معاملہ میں مسلم معاشرہ کے سربرآوردہ اشخاص و رجال بھی خلفاء کی طرح وسیع القلب تھے۔ ان کی دوستی اور ان کی ہم مذہبی کا دائرہ بھی صرف اپنے ہم مذہبوں تک محدود نہ تھا۔ مثلاً ابراہیم بن ہلال جو مجوسیوں کے ایک خاص فرقہ صابئہ سے تعلق رکھتا تھا، حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوا اور جس کے یہاں شعراء کی بڑی آؤبھگت تھی، لیکن اس کا اٹھنا بیٹھنا اپنے ہم مذہبوں کے دائرے تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے اور مسلم اہلِ علم و ادب کے درمیان بڑے اچھے مراسم اور گہرے تعلقات تھے جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا ہے تو شریف رضی نے ایک طویل نظم کہی، جو "قصیدہ دالیہ" کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ حالانکہ شریف رضی ہاشمیوں کے سربراہ اور شیعہ کے رہنما تھے، وہ اپنے قصیدے میں کہتے ہیں:

ارأیت من حملوا علی الاعواد ارأیت کیف خبا ضیاء النادی

ماکنت اعلم قبل خطک فی الثری ان الثری یعلوا علی الاطواد

"تم نے دیکھا کہ وہ کیسے لکڑیوں پر اٹھا کے لے گئے ، اور تم نے دیکھا کہ آگ کی روشنی کس طرح بجھ گئی۔"

"میں تیرے دفن ہونے سے پہلے یہ نہ جانتا تھا کہ قبروں میں بڑے بڑے پہاڑ بھی دفن ہو سکتے ہیں۔"

اس کے بعد بھی شریف رضی ان کو یاد کرتے رہے اور ہر مناسب موقعہ پر ان کے مرثیے کہتے رہے۔ ایک دفعہ وہ اس کی قبر (کیا مجوسی پہلے اپنے مردوں کو دفن کیا کرتے تھے؟ یا مجوسیوں کے صرف فرقہ صابئہ کا یہ دستور تھا؟ قابلِ تحقیق بات ہے) کے پاس سے گذرے اور بے اختیار رونے لگے۔ اس موقعہ پر انہوں نے جو مرثیہ کہا اس کے یہ اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں:

اقول لرکب رائحین تعرجوا اریکم بہ فرعًا من المجد ذاویا

رثیتک کی اسلوک فازددت لوعۃ نکان الذی اتی لا تحد المراذیا

واعلم ان لیس البکاء بنافع علیک ولکنی امنی الاَمانیا

"میں گذرنے والے ہم سفروں سے کہتا ہوں کہ اس (قبر) کی طرف آؤ میں تم کو یہاں بزرگی کی ایک گوشہ نشین شاخ کو دکھلاؤں۔"

"میں تم پر رو دیا تاکہ تمہارے بارے میں مجھ کو تسلّی ہو، لیکن سوزش اور بڑھ گئی گویا مرثیے مصائب کو محدود (کم) نہیں کرتے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم پر رونا نفع بخش نہیں ہے، لیکن آرزوؤں نے مجھے آرزومند بنا دیا ہے۔"

## مامون کے علمی حلقہ میں:

خلفاء کی سرپرستی، علمی حلقوں میں ہمیشہ مختلف المذاہب علماء جمع ہوتے تھے چنانچہ مامون الرشید کا ایک خاص علمی حلقہ تھا، جس میں مختلف ادیان کے علماء جمع ہوتے تھے۔

وہ ان سے کہا کرتا تھا کہ آپ بحث کو علم و فن تک محدود رکھیں اور کوئی بھی اپنی مذہبی کتاب سے استدلال نہ کرے کیونکہ اس طرح فرقہ وارانہ مسائل اور مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

## عام بزم آرائیاں :

یہی حالت عام قومی علمی حلقوں کی تھی۔ خلف بن المثنی کہتے ہیں کہ ہم بصرہ میں دس ایسے ارباب کمال پر مشتمل علمی حلقے میں حاضر ہوئے کہ اپنے اپنے مخصوص علوم میں ان کے فضل و کمال کی ٹکر کا کوئی آدمی نہ تھا۔ اور وہ لوگ یہ تھے :

۱ - خلیل بن احمد مشہور نحوی جو سُنی تھے۔

۲ - حمیری شاعر جو شیعہ تھے۔

۳ - صالح بن عبدالقدوس جو زندیق تھے۔

۴ - سفیان بن مجاشع جن کا تعلق خارجیوں کے صفوی فرقہ سے تھا۔

۵ - بشار بن برد۔ جن کا تعلق شعوبی فرقہ سے تھا۔

۶ - حماد عجرد جو ایک قوم پرست زندیق تھا۔

۷ - ابن راس الجالوت مشہور شاعر جو مذہباً یہودی تھا۔

۸ - ابن نظیر فلسفی۔ جو دین کے لحاظ سے عیسائی تھا۔

۹ - عمر بن اخت المویدیہ مجوسی تھا۔

۱۰ - ابن سنان الحرانی شاعر جو صابی المذہب تھا۔

یہ لوگ ایک ہی مجلس میں بیٹھتے مسائل پر بحث ہوتی اشعار پڑھے جاتے اور تاریخی واقعات پر گفتگو ہوتی اور یہ سب کچھ اس قدر دوستانہ ماحول میں ہوتا کہ کسی کو یہ پتہ نہ چلتا کہ ان کے درمیان اس قدر مذہبی اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔

## خاندانوں اور گھروں میں :

یہ رواداری خاندانوں اور گھروں میں بھی عام تھی۔ بارہا ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ

ایک ہی گھر میں چار بھائی رہ رہے ہیں۔ ایک سُنّی ہے، ایک شیعہ ہے، ایک معتزلی ہے اور ایک خارجی ہے اور کامل اتفاق واتحاد اور محبّت و یگانگت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسی طرح یہ صورتِ حال بھی تھی کہ ایک گھر میں دو بھائی رہتے ہیں ایک اپنی عبادت میں مصروف رہتا اور دُوسرا اپنے لہو ولعب میں مشغول رہتا اس سلسلہ میں کتبِ ادب میں مذکور دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک گھر میں دو بھائی رہتے تھے جن میں سے ایک نہایت متّقی تھا جو نچلی منزل میں رہائش پذیر تھا، دُوسرا فاسق و فاجر تھا جو اُوپر کی منزل میں رہتا تھا، ایک دفعہ اس رِندِ مشرب کے کچھ دوست و احباب جمع ہو گئے اور گانے بجاتے رہے اور دیر تک گھر کو اپنے شور و شغب سے سر پر اُٹھائے رکھا۔ اس متّقی کو ساری رات سونے نہ دیا، وُہ نکلا اور اپنے بھائی کو پکارتے ہوئے کہا: افأمن الذین مکروا السیئات ان یخسف اللہ بھم الارض؟ (کیا بدکردار لوگ اس سے بالکل بے فکر بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین کے اندر دھنسا دے؟) اس پر اس کے بھائی نے برجستہ کہا: وما کان اللہ لیعذبھم و انت فیھم[۱] (اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک عذاب نہیں دے گا، جب تک تم ان میں موجود ہو)

## دُوسرے اہلِ مذاہب کے تہواروں میں جوش و خروش کے ساتھ شرکت:

اسی طرح دُوسرے اہلِ مذاہب کے تہواروں پر مُسلمان دُوسرے فرقوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ جیسا کہ اموی عہد کے بعد عیسائی عام شاہراہوں پر اپنے جلسے کرتے اور جلوس نکالتے۔ اس موقع پر کچھ صلیب اُٹھائے ہُوئے آگے آگے چلتے نیز ان کے مذہبی راہنما اپنے مخصوص لباسوں میں ساتھ ساتھ رہتے۔ ایک

---

[۱]: یہاں آیت میں "انت" (تم) کا خطاب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ہے۔ لیکن اس موقع پر اس کا یہ آیت پڑھ دینا، اپنے اندر کتنی معنویت رکھتا ہے، یہ حسنِ ذوق اور ذہانت کے سمجھنے کی بات ہے۔ اور اسی لیے کتبِ ادب میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے۔

دفعہ پیٹریارک مکائیل ایک بہت بڑے اور شاندار جلوس کی قیادت کرتے ہوئے اسکندریہ میں داخل ہوا، اس کے آگے صلیبیں شمعیں اور انجیلیں تھیں اور کاہن یہ نعرے لگا رہے تھے "اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک امن دہندہ راعی بھیجا ہے جو جدید مرقس ہے"۔ یہ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ رشید کے زمانے میں عیسائی ایسٹر کے موقع پر صلیبیں اٹھائے ہوئے، ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں نکلتے تھے۔ المقدسی اپنی کتاب احسن التقاسیم میں ذکر کرتے ہیں کہ عیسائیوں کے تہوار کے موقع پر شیراز کے بازار سجائے جاتے تھے اور دریائے نیل کے چڑھنے کا جب زمانہ آتا اور عیسائی اپنی عیدِ صلیب مناتے تو ان کے ساتھ مصری بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ خوشیاں مناتے۔

مقریزی اپنی کتاب "خطط" میں لکھتے ہیں کہ اخشیدیوں کے زمانہ میں عوام بپتسمہ کے تہوار کے موقع پر بے پناہ خوشیاں مناتے ۳۳۰ھ میں بپتسمہ کا تہوار بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا۔ محمد بن طغج اخشیدی جزیرہ نیل میں اپنے جس مخصوص محل میں تھا، اس کے اردگرد ایک ہزار قندیلیں روشن کی گئیں۔ قوم نے بھی اس کی تقلید کی اور بے شمار مشعلیں اور شمعیں اور قندیلیں روشن ہوگئیں۔ ہزاروں مسلمان اور عیسائی حوضوں پر جمع ہوگئے۔ گھروں کی چھتوں اور نہروں کے کناروں پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ لوگوں نے اپنے بہترین اور خوبصورت ترین لباس پہنے۔ کھانے اور پینے کی رنگارنگ چیزیں سونے اور چاندی کے برتنوں میں لائی گئیں۔ اس رات کو پھاٹک بند نہیں کیے گئے، اور اکثر لوگوں نے تالابوں میں غوطے لگا لگا کر غسل کیے، اسی اعتقاد پر کہ بپتسمہ کی رات کو غسل کرنا بے شمار امراض کے لیے نافع ہے۔

## حیرت انگیز رواداری :

اور اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ رواداری اور محبت کے یہ مظاہر ٹھیک اس زمانے میں بھی جلوہ نما رہے جب صلیبی جنگیں ہو رہی تھیں اور صلیبی جنگوں

کے دوران بھی اس وضع داری میں فرق نہ آیا۔ حالانکہ ان جنگوں میں مغربی طاقتیں صلیب کے نام پر اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور اسلامی ممالک پر چڑھ دوڑی تھیں۔ الرحالہ ابن جبیر کہتے ہیں :

"سب سے زیادہ انوکھی بات یہ ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ دونوں فوجیں ایک دُوسرے کے خلاف صف آرا ہیں لیکن عیسائی اور مُسلم دستوں کے وفود ایک جگہ سے دُوسری جگہ آجا رہے ہیں اور ملاقاتیں ہو رہی ہیں اور اس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہے۔ مصر سے دمشق اور وہاں سے انگریزی ممالک کو برابر قافلے جا رہے ہیں، مسلمان عیسائیوں کو ان کے ممالک میں ٹیکس ادا کر رہے ہیں جو پوری خوشدلی سے دیے جا رہے ہیں اور عیسائی تاجر مسلم ممالک میں اپنے سامانِ تجارت کا ٹیکس ادا کر رہے ہیں اور ان میں پورا پورا عدل و انصاف ملحوظ ہے اور ان کی فوجیں ایک دُوسرے کے خلاف لڑ رہی ہیں لیکن لوگ امن میں ہیں اور دُنیا اُسی کی ہے جو غالب آجائے۔"

## مغربی مُحققین کے اعتراضات :

غرض اسلامی تہذیب و تمدن کے اندر رواداری اس قدر اُونچے معیار کو پہنچی، جس کی کوئی مثال گذشتہ تاریخ کے اندر نہیں پائی جاتی اور خود مغرب کے حق پسند مُصنّفین بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں اور اس کی شہادت دیتے ہیں۔

چنانچہ امریکہ کے مشہور مصنف مسٹر ڈریپر کہتے ہیں کہ :

"خلفاء کے زمانے میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اہل علم کا صرف احترام ہی نہیں کیا گیا بلکہ بڑے بڑے عہدے بھی ان کے سپرد کیے گئے اور ان کو حکومت کے اُونچے مناصب تک ترقی دی گئی۔ ہارون الرشید نے

خابن ماسویہ کو ڈائرکٹر تعلیمات بنا کر تمام اسکولوں اور کالجوں کو اس کی تحویل میں دے دیا تھا۔ وُہ (ہارون) یہ نہ دیکھتا تھا کہ ایک عالم کس ملک کا باشندہ ہے اور نہ یہ دیکھتا تھا کہ وُہ کس عقیدہ و مذہب کا ہے بلکہ وُہ ایک عالم کے صرف علم و فضل کو دیکھتا تھا، اور اس کے سوا کسی اور چیز پر نگاہ نہ ڈالتا تھا۔"

موجودہ (زمانہ حاضرہ کے مشہور مؤرخ مسٹر ولز اسلامی تعلیمات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اسلامی تعلیمات نے دُنیا کے اندر منصفانہ اور شریفانہ طرزِ عمل کے لیے عظیم روایات چھوڑی ہیں اور وُہ لوگوں میں شرافت اور رواداری کی رُوح پھونکتی ہیں۔ یہ تعلیمات بہت اُونچی انسانی تعلیمات ہیں اور قابلِ عمل ہیں ان تعلیمات نے ایک ایسی سوسائٹی کو جنم دیا، جس میں اس کے پیشرو کی ہر سوسائٹی کے مقابلہ میں، سنگ دلی اور اجتماعی ظلم کم سے کم رہا۔"

پھر آگے چل کر رقمطراز ہیں کہ :

"اسلام نرمی، رواداری، خوش اخلاقی اور بھائی چارے سے مملوٌ ہوا ہے۔")

سر مارک سائیکس ہارون الرشید کے زمانہ میں مسلم شہنشاہیت کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :

"عیسائی، بُت پرست، یہودی اور مسلمان اسلامی حکومت کے کارکن کی حیثیت سے مساویانہ طور پر سرگرم عمل تھے۔"

ترنون کہتا ہے :

"مسلمانوں کا دین شعراء اور موسیقی کاروں کے معاملہ میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔"

لیفی برنتسالی اپنی کتاب "دسویں صدی کا سپین" میں لکھتا ہے :

"بارہا ایسا ہوا ہے کہ معاہدے لکھنے والا یہودی ہے یا عیسائی جس طرح کہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر بہت سے یہودی یا عیسائی فائز

تھے، اور وہ حکومت کے انتظامی محکموں حتٰی کہ وہ جنگی امُور میں بھی بااختیار ہوتے تھے اور کئی یہودی ایسے تھے جو یورپین ممالک میں خلفاء کے سفیروں کی حیثیت سے مامور رہے ہیں۔"

مسٹر رینو" فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور بحیرۂ متوسط" کے جزائر میں عربوں کی جنگی تاریخ میں لکھتے ہیں :-

"اندلس کے شہروں میں مسلمانوں کا عیسائیوں کے ساتھ بہترین سلوک تھا اور اسی طرح یہودی اور عیسائی بھی مسلمانوں کے احساسات کا پورا لحاظ رکھتے تھے مثلاً وہ اپنی اولاد کا ختنہ کراتے تھے اور خنزیر کا گوشت نہ کھاتے تھے۔"

## آرنلڈ کی شہادت :

مسٹر آرنلڈ عیسائی فرقوں کے دینی افکار پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"لیکن اسلامی رواداری کے اصول اس طرح کے کاموں[1] کی اجازت ہرگز نہیں دیتے جو ظلم اور عدوان تک جا پہنچیں۔ اس لیے مسلمانوں کا معاملہ دوسرے اہلِ مذاہب کے طرزِ عمل کے بالکل برعکس رہا۔ بلکہ مسلمانوں نے دوسرے مذہب کے فرقوں کے ان مظالم کو روا نہیں رکھا جو انہوں نے آپس میں ایک دوسرے پر باہمی مذہبی تعصب کی بنا پر کیے تھے۔ اس لیے کہ ہمارے سامنے تاریخ کی یہ شہادت ہے کہ مسلمانوں کی رعایا میں جو مختلف عیسائی فرقے تھے ان کے درمیان عدل و انصاف کرنے میں مسلمانوں نے ذرا بھی کوتاہی نہیں کی۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ فتح مصر کے بعد عیسائیوں کے یعقوبی فرقہ نے موقع پاکر سابق بزنطینی سلطنت کے عیسائیوں کے کیے ہوئے ظلم کے انتقام میں ان کے

---

[1] : "اس طرح کے کاموں" سے اشارہ عیسائی فرقوں کے اعمال و کردار کی طرف ہے۔

املاک اور گرجوں پر قبضہ کر لیا، لیکن اسلامی حکومت نے پورا پورا انصاف کیا اور قدامت پرست عیسائیوں کی تمام املاک اور تمام گرجوں کو واپس دلوا دیا، جن جن پر بھی وہ اپنا قانونی حق ثابت کر سکے۔"

پھر مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں:

"ہم جب اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی اپنی عیسائی رعیت کے ساتھ اس قدر انصاف اور عدل اور مذہبی رواداری کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کا تلوار کے زور سے پھیلنے والا پروپیگنڈا ناقابلِ تصدیق اور دور خودِ اعتنا نہیں ہے۔"

## تفصیلی گفتگو کی وجہ:

ہم نے تہذیبِ اسلامی میں مذہبی رواداری اور مذہبی خیالات کی آزادی سے متعلق گفتگو میں تفصیلی دلائل و شواہد سے، اس لیے کام لیا ہے کہ:

مغرب کے متعصّب مؤرخین کے اس الزام کی لغویت پوری طرح واضح ہو جائے کہ: "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، اور یہ کہ مسلمانوں نے جبر و اکراہ سے کام لے کر لوگوں کو اپنے دین میں داخل کیا ہے۔ اور یہ کہ ہم نے (مسلمانوں نے) غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ ذلّت آمیز سلوک کیا ہے۔"

## شرم اُن کو مگر نہیں آتی:

ان مغربی متعصّب مؤرخین کے لیے یہ بہتر تھا کہ وہ اس غوغا آرائی سے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیتے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اُلٹی آنتیں ان کے گلے میں پڑ رہی ہیں؟ کیونکہ یہاں تو دن کی پوری روشنی ہے جس میں اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اس الزام سے ہمارا دامن کتنا پاک ہے، البتہ ان کا کردار اس قدر گھناؤنا ہے کہ مارے شرم کے ان کی پیشانیاں عرق آلود ہو جانی چاہئیں۔ مثلاً صلیبی جنگوں اور اسپین کے المیے

مسلمانوں کے خلاف انہوں نے اپنے مذہبی تعصب کا جیسا کچھ ظالمانہ مظاہرہ کیا اس پر انسانیت کی گردن ندامت سے جھکی ہوئی ہے، بلکہ وہ خود ایک دوسرے پر جو مظالم توڑتے رہے ہیں تاریخ کا کوئی طالب علم اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ پروٹسٹنٹوں نے کیتھولک کو قتل و تباہ کیا خصوصاً "سینٹ بارتلمی" کی خونریزی تو بیحد ہیبت ناک ہے۔ پھر وہ لڑائیاں بھی ان کی شرمندگی اور رسوائی کے لیے کافی ہیں جو پاپائیت کے علمبرداروں اور ان کی مخالف یورپین اقوام کے درمیان ہوئیں۔ اسی طرح قرونِ وسطیٰ میں محکمۂ تفتیش کے افسروں نے عوام پر جو مظالم ڈھائے، وہ بجائے خود انتہائی شرمناک ہیں۔ یہ سارے واقعات اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ یورپین اقوام ہمیشہ سے سخت متعصب اور کینہ پرور رہی ہیں اور انہوں نے کبھی بھی مخالف رائے اور مخالف عقیدے کو برداشت نہیں کیا اگرچہ وہ مخالف ان کے ہم وطن اور ہم نسب ہی کیوں نہ ہوں۔ ان لوگوں کی قدیم تاریخ کے اندر مذہبی رواداری کی کوئی ایک مثال بھی نظر نہیں آتی اور آج بھی یہی مذہبی تعصب اور تنگ نظری ہے جو درحقیقت سیاسی بالادستی اور استعمارانہ پالیسی کے پس منظر میں کام کر رہی ہے۔

## آخری گواہ:

اب اخیر میں، میں چاہتا ہوں کہ مذہبی رواداری کی اسلامی پالیسی پر عیسائیت کے ایک جلیل القدر صاحبِ فضل و کمال اور عظیم راہنما کی شہادت پیش کروں اور وہ ہیں انطاکیہ کے پیٹر یارک میخائیل، جو بارھویں صدی کے نصف آخر میں گذرے ہیں اور یہ وہ زمانہ ہے جب مشرقی کلیسا تقریباً پانچ سو سال تک اسلامی حکم کے تحت رہ چکے تھے یہ (پیٹر یارک میخائیل) مسلمانوں کی مذہبی رواداری اور مشرقی کلیساؤں پر رومی عیسائیوں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہی وہ سبب ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو قوت اور جبروت کا مالک اور جس کی صفات میں سے ایک صفت المنتقم ہے اور جو زمین کی حکمرانی

جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور کبھی ذلیل کو باعزت بنا دیتا ہے۔۔۔۔۔۔

جب رُوم کے شر پسند عیسائیوں کو دیکھا کہ قوت سلطنت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ہمارے (انطاکیہ کے عیسائیوں کے) گرجوں کو تاراج کیا۔ ہمارے گھروں کو لوٹا اور یہ لوٹ کھسوٹ پورے ملک کے اندر وسیع پیمانے پر ہوئی اور انسانی رحم وہمدردی کا جامہ اُتار کر انہوں نے ہمارے ساتھ نہایت اذیت ناک سلوک کیے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے جزیرۃ العرب سے بنو اسماعیل کو بھیجا تاکہ وُہ ہمیں اس دردناک عذاب سے نجات دلائیں جس میں رُوم نے ہمیں مبتلا کر رکھا تھا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے غلبۂ اقتدار سے ہمیں کچھ خسارہ بھی ہُوا کہ کیتھولک عیسائیوں کے کئی گرجے ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے اور اہلِ "خلقیدونیہ" کو مل گئے۔ کیونکہ یہ گرجے ایک طویل عرصے سے ان کے قبضے میں رہ چکے تھے۔ حالانکہ جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہُوئی تو اس نے جس کے قبضے میں جو گرجا تھا اس کو اسی کے پاس رہنے دیا، اور اس وقت ہمارے قبضہ سے "کینسہ کبری" اور حوران کا کینسہ نکل گیا ۔۔۔۔۔ لیکن اس تھوڑے سے خسارے کے مقابلہ میں یہ کتنا عظیم فائدہ ہے کہ ہم رُومی عیسائیوں کے انتقام، تعصب، ان کی ایذارسانی اور ان کے ظلم وعدوان کے چنگل سے آزاد ہوگئے اور امن وسلامتی کے گہوارے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

## لیبان کی انصاف پسندی :

پھر کیا گستاف لیبان کا یہ محاکمہ آپ کے پیشِ نظر ہے کہ :

"تاریخ کسی ایسی قوم سے واقف نہیں ہے جو عرب کی طرح رحم دل و روادار فاتح ہُوئی ہو۔ اور نہ تاریخ میں ان کے دین جیسا کوئی صاف اور سادہ اور بے ضرر دین نظر آتا ہے۔"

مسلمانوں کے حق میں مسٹر لیبان کا یہ منصفانہ قول درحقیقت حق کے ساتھ انصاف ہے۔

---

# چھٹا باب

# ہمارے جنگی اخلاق

# ہمارے جنگی اخلاق

لیجیے! ہماری تہذیب کی انسانیت دوستی کا ایک اور جدید پہلو، اور اس پہلو کے لحاظ سے بھی، اسلامی تہذیب منفرد ہے۔ امن وسلامتی کی حالت میں، حسنِ خلق، نرمی، ضعیفوں سے رحم دلی، اقربا اور پڑوسیوں کے ساتھ رواداری کا مظاہرہ ہر قوم کر سکتی ہے، جبکہ کمزوری اور ناطاقتی کی مجبورانہ زندگی گذار رہی ہو...... لیکن جنگ کی حالت میں لوگوں کے ساتھ منصفانہ معاملہ کرنا، دشمنوں سے نرم سلوک کرنا بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے ساتھ رحم دلی کا مظاہرہ کرنا، مغلوب لوگوں کے ساتھ نرمی اور رواداری کا برتاؤ کرنا، یہ ہر قوم کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ ہر جنرل میں ان اوصاف کا پایا جانا ممکن ہے۔ خون دیکھنے سے خون کھول اٹھتا ہے اور دشمنی، کینہ اور غیظ وغضب کو برانگیختہ کرتی ہے۔ کامیابی کا نشہ ایک فاتح کو مدہوش کر دیتا ہے۔ اور ایسے حالات میں وہ بدترین شقاوتِ قلبی اور انتقام کا مظاہرہ کر جاتا ہے، یہی اقوام کی تاریخ ہے خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، بلکہ پوری انسانیت کی یہی تاریخ ہے، جب سے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کا خون بہایا:

اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ
قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (مائدہ : ۲۷)

"جبکہ دونوں نے، کچھ نیازیں چڑھائیں تو ایک کی نیاز قبول ہو گئی اور دُوسرے کی قبول نہ ہُوئی (قابیل) کہنے لگا میں تجھے قتل کر دوں گا، اس (ہابیل) نے کہا خدا پرہیزگاروں ہی کی نیاز قبول کرتا ہے۔"

اس موقع (قوت و شوکت اور جنگ) پر تاریخ نے زندگی جاریہ کا تاج، صرف ہماری تہذیب کے قائدین کے سر پر رکھا ہے، فوجی ہوں یا شہری اور فاتح ہوں یا حاکم ہوں، کیونکہ تمام تہذیبوں میں ہماری وہ واحد تہذیب ہے جس کے اکابر نے سخت ترین جنگی حالات میں بھی، بلند ترین عادلانہ اور مشفقانہ انسانیت کا مظاہرہ کیا، خصوصًا ایسے مواقع پر جب حالات انسان کو خونریزی، ظلم اور انتقام پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ خدا شاہد ہے کہ مسلمانوں کے یہ جنگی اخلاق، اگر ناقابلِ انکار تاریخی واقعات سے ثابت نہ ہوتے تو میں ان تمام واقعات کو ایک افسانہ سمجھتا جس کی کوئی حقیقت اس زمین پر نہیں ہوا کرتی۔

## تہذیبِ اسلامی کی برکت :

جب اسلام دُنیا میں آیا تو لوگوں کی حالت ایسی تھی جیسی کہ جنگل میں جانوروں کی ہوتی ہے کہ "قوی، بے تکلف، ضعیف کو قتل کر دیتا اور ایک مسلح، بغیر کسی جھجک کے، ایک غیر مسلح آدمی کو لوٹ لیتا ہے۔ تمام ادیان و شرائع اور تمام اقوام، قبائل کے ہاں جنگ گویا زندگی کی روزمرّہ معمولات میں سے تھی، جو کسی قید سے مقید نہ تھی اور نہ کسی حد میں محدُود تھی۔ جائز جنگ اور ناجائز اور ظالمانہ جنگ کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہ تھا جو قوم بھی اس بات کی قدرت پاتی کہ دُوسری قوم سے اس کی زمین چھین لے، اس کی عورتوں کو باندیاں اور اس کے مردوں کو غلام بنا لے اور اس کے اپنے عقاید و خیالات کو ترک کر دینے پر مجبور کرے، وُہ

بغیر کسی جھجک اور احساسِ گناہ کے، یہ سب کچھ کر گذرتی لیکن ہماری تہذیب نے یہ بات گوارا نہ کی کہ دُنیا میں یہ ظالمانہ طرزِ عمل برقرار رہے، جس نے انسانیت کو حیوانیت خالصہ کی سطح تک گرا دیا تھا، بلکہ یہ اعلان کیا کہ اقوام کے درمیان باہمی تعلقات کے باب میں اصل چیز تعارف اور تعاون ہے (نہ کہ نفرت اور حرب) :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔

"لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔" (الحجرات : ۱۳)

اس بنا پر صلح و آشتی اور امن و سلامتی، اقوام کے درمیان تعلق کا ایک طبیعی اور فطری علاقہ ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً۔ (بقرہ : ۲۰۸)

"اے ایمان والو داخل ہو جاؤ، صلح و سلامتی (اسلام) میں پورے کے پورے۔"

## سامانِ طاقت کی فراہمی کس لیے ضروری ہے؟ :

اب جو قوم امن و سلامتی سے رہنا ہی نہ چاہے اور دوسری قوم سے جنگ اور اس پر تعدّی کے بغیر اُسے چین ہی نہ ملتا ہو، اس مقصد کے لیے ہر گھڑی آمادہ پیکار رہتی ہو، تو اس دُوسری قوم کا بھی فرض ہے کہ وہ اس جارحیت کے دفاع کے لیے تیار رہے، کیونکہ اگر کوئی قوم، ہر وقت دفاع کے لیے مستعد اور تیار نہ ہو تو جارحیت پسند قوم حرب و تعدی کا فتحِ باب کرنے میں نہایت تیزی سے کام لیتی ہے :

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ۔ (انفال : ۶۰)

"اور جہاں تک ہو سکے قوت و طاقت فراہم کر کے اور گھوڑوں کی تیاری سے، ان کے لیے مستعد رہو، کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر ہیبت بیٹھی رہے۔"

اب اگر جارحیت پسند قوم اپنے جارحانہ عزائم سے باز آ جاتی ہے، اور "مسلح صلح پسندی" سے ڈر جاتی ہے، تو پہلی قوم کو بھی چاہیے کہ وہ بے تکلف، مصالحانہ ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھائے، بلکہ اسے چاہیے کہ وہ صلح کے لیے بہت زیادہ خواہشمندی کا اظہار کرے:

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (انفال: ۶۱)

"اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور خدا پر بھروسہ رکھو۔"

لیکن جارحیت پسند اگر لڑنا ہی چاہیں تو پھر قوت کا دفاع قوت ہی سے ہو سکتا ہے، لوہا لوہے کو کاٹتا ہے: وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (بقرہ: ۱۹۴) "اور اللہ کے راستے میں، ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے لڑتے ہیں۔"

## جنگ کے مقاصد:

یہ ہے وہ موقف جس کی بنا پر ہماری تہذیب کے اصول و مبادی مالِ غنیمت لوٹ مار اور اقوام کو ذلیل کرنے کی خاطر جنگ کی اجازت ہرگز نہیں دیتے، کیونکہ اس کے اصول ایسی لڑائیوں کو قطعاً حرام قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی نظر میں صرف وہی جنگ جائز ہے، جو ان مقاصد میں سے کسی ایک کے لیے لڑی جائے۔

۱۔ قوم کے اخلاق اور نظریات کے دفاع کی خاطر۔

۲۔ قوم کی حریت، استقلال اور سلامتی کے بچاؤ کے لیے: "وقاتلوا ھم

حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ (حج: ۴۰) "اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔"
اس شکل میں اعلانِ جنگ کرنے والی قوم کے لیے محض اپنے عقیدے کی حریت مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقائد کی حریت و آزادی کی ضمانت بھی دے اور سارے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی بھی ضامن ہو:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا (حج: ۴۰)
"اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو صومعے، گرجے عبادت خانے، مسجدیں جن میں خدا کا بکثرت ذکر کیا جاتا ہے، ڈھائی جا چکی ہوتیں۔"

## ایک اور درخشندہ پہلو:

پھر ہماری تہذیب کے تابناک اصول کا یہ ایک انتہائی درخشندہ پہلو بھی ہے کہ اس نے جس طرح ہم پر یہ فریضہ عائد کیا ہے کہ ہم اپنی عزت و حریت پر کوئی آنچ نہ آنے دیں اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی لازم قرار دیا ہے کہ دوسرے کمزور اور مظلوم گروہوں اور طبقوں کی دستگیری کرتے ہوئے، ان پر کیے جانے والے مظالم کے مقابلہ میں، ان کا دفاع کریں:

وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا۔ (نساء: ۷۵)

"اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں

اور بچوں کو ظلم و تشدد سے نجات دلانے کی خاطر نہیں لڑتے، جو دعائیں
کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار، ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے
ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا
اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما۔"

اِن اخلاقی پابندیوں میں جکڑی ہوئی، جنگ ہی وُہ جنگ ہو سکتی ہے جو عقیدے
اور آزادیٔ فکر و عمل اور امن و سلامتی پر ہونے والے جبر و تشدد کے دفعیہ کے لیے میدان
کا رُخ کرے، اور یہی جنگ اسلام میں جائز ہے اور اس مقصد کے لیے لڑنے والا ہی
اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے اور اسے جنت ملتی ہے۔ اور اسی کے متعلق تہذیبِ اسلامی
نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس کے سوا جس قدر جنگیں ہیں وُہ طغیان
اور فساد فی الارض کے لیے ہوتی ہیں۔ ہماری تہذیب میں مشروع لڑائی اور اقوامِ عالم
کے ہاں معروف لڑائیوں کے درمیان جو فرق ہے اسے اس آیت کے اندر خوبی سے
واضح کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ
فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۔ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ
کَانَ ضَعِیْفًا۔ (النساء: ۷۶)

"جو مومن ہیں وُہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وُہ طاغوت کی راہ میں لڑتے
ہیں، سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو یقین رکھو کہ شیطان کا داؤ
بودا ہوتا ہے۔"

## جنگ کس سے اور کس حد تک؟:

ہماری تہذیب اعلانِ جنگ اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کرتی ہے اور اس
تجویز کردہ نظامِ زندگی کے قیام کے لیے کرتی ہے۔ یہ نظام، نظامِ حق ہے۔ یہی
خیر ہے اور یہی شریفانہ انداز ہے، اس کے بالمقابل دوسرے لوگ اعلانِ جنگ

دُوسروں پر تعدی، شیطنت اور فساد فی الارض کی خاطر کرتے ہیں اور شیطنت نام ہے شر، سرکشی اور فساد کا۔ تو جب ہماری تہذیب کی جنگوں کی یہ غایت اور اس کا یہ مطلوب ہے تو حق کی راہ میں خیر کی خاطر، اس کی جنگ باطل اور شر کا ذریعہ ہرگز نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے باب میں ہماری تہذیب کے اصول و مبادی میں سے ایک یہ ہے کہ صرف اسی سے لڑا جائے جو ہم سے لڑتا ہے اور جو ہم پر زیادتی کرتا ہے: فمن اعتدی علیکم فاعتدوا بمثل ما اعتدی علیکم (بقرہ: ۱۹۴) "پس جو تم پر کوئی زیادتی کرے تو اس کے جواب میں تمہارا ردِ عمل اسی قدر ہونا چاہیے جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہے"۔ لہٰذا اگر ہم ان حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ان لوگوں سے لڑنے لگیں جو لڑنا نہیں چاہتے، اور ان کو ایذا پہنچائیں جو ایذا کے درپے نہیں، تو ہم اس جنگِ انسانیت کو، اس کے اعلیٰ اغراض و مقاصد سے منحرف کر دینے کی بنا پر، زیادتی کرنے والے قرار پائیں گے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (بقرہ: ۱۹۰) "اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو، مگر زیادتی نہ کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا"۔ اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

> وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (شوریٰ: ۴۱-۴۲)
>
> "اور جس پر ظلم ہوا ہو اگر وہ اس کے بعد انتقام لے تو ایسے لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔ الزام تو ان لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

لہٰذا جب جنگ کی آگ بھڑک اُٹھے تو ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے اصولِ جنگ

کو ہر وقت ملحوظِ خاطر رکھیں ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سنگدلی، فساد اور تباہی و بربادی کے باعث بن جائیں ۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے، کیونکہ خالص اللہ کے راستے میں لڑی جانے والی جنگ انسانیت کو، اپنے وسائل و ذرائع کے لحاظ سے بھی، ہمیشہ انسانیت کی حدود کے اندر رہنا چاہیے وُہ جنگ بے انتہا سخت اور شدید کیوں نہ ہو ۔

## جنگ سے متعلق چند ہدایات :

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ کے بارے میں جو ہدایات دی ہیں ایسی ہدایات ہیں جو کسی بھی دُوسری تہذیب کی تاریخ میں نہیں ملتیں ۔ مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جیشِ اسامہ کو یہ ہدایات دیں :

"لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر مثلہ نہ بنانا، چھوٹے بچّوں کو قتل نہ کرنا، ایسے بُوڑھوں کو قتل نہ کرنا جو لڑ نہیں سکتے، عورتوں کو کچھ نہ کہنا، باغات نہ کاٹنا، نہ آگ لگانا، کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، کھانے بھر کی ضرورت سے زائد کسی جانور کو ذبح نہ کرنا، تم لوگوں کا گذر ایسے لوگوں پر ہو گا جنہوں نے اپنے آپ کو گرجوں میں، عبادت کے لیے وقف کر رکھا ہے، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا اور وُہ کام کرنے دینا جس کے لیے وُہ یکسو ہو گئے ہیں ۔"

آپ نے دیکھ لیا کہ خالص "اسلامی جنگ" جو شر و فساد و ظلم کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کے راستے میں لڑی جاتی ہے اس کے کیا خدوخال ہوتے ہیں ۔ اور یہ کہ وُہ ہمیشہ ایسے اصول و مبادی کی پابند رہتی ہے جو انسانیت کے لیے باعثِ رحمت ہیں، یہاں تک کہ وُہ دو نتائج میں سے کسی ایک پہنچ جاتی ہے یا صلح ہو جاتی ہے یا فتح نصیب ہو جاتی ہے، اگر صلح کی جائے تو اس میں معاہدات کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے اور فریقین کے مابین کیے جانے والے معاہدات کو پورا کرتے رہنا لازمی

ہوتا ہے، کیونکہ وُہ دراصل اللہ سے کیا ہوا عہد ہوتا ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا۔ (نحل: ۹۱)

"اور جب خدا سے عہد کرو تو اس کو پُورا کرو، اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو کہ تم تو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو۔"

اور اگر فتح نصیب ہو تو وُہ ایک ایسی جماعت کی فتح ہے، جس نے محض اللہ کے لیے تندہی دکھائی، اس کے افراد اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، ایسی جماعت فتح کے بعد وُہی اقدامات کرتی ہے جن سے زمین میں نظامِ حق کی جڑیں مضبوط ہوں اور لوگوں کے درمیان ہر قسم کے فساد اور تعدّی کا سدِّ باب کرتی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (حج: ۴۱)

"وُہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطاء کریں تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، نیکی کا حکم دیں اور بُرائی سے روکیں اور تمام اُمور کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

یہ ہیں وُہ حدُود جو اسلامی تہذیب نے فتح کے بعد اپنے فاتح کی سرگرمیوں کے لیے مقرّر کیے ہیں یعنی بلند رُوحانیت، اجتماعی انصاف، نیکی اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں باہمی تعاون اور سرزمین پر شر و فساد سے پیہم مقابلہ ـــــــ یہ ہیں ہماری تہذیب کے جنگی اصول و مبادی، اور یہ ہیں ہمارے جنگی اخلاق جنہیں سمیٹ کر صرف تین لفظوں میں پیش کیا جاسکتا ہے "انصاف، رحم اور وفا عہد"۔

## یہ سب محض دعویٰ اور نظریہ نہیں ہے بلکہ عمل کر کے دکھایا ہے:

میرا یہ خیال ہے کہ، دورانِ جنگ، ہماری تہذیب کی صلح جویانہ پالیسی کے

اظہار کے لیے اس قدر بیان کافی نہیں ہے۔ کیونکہ صرف اصول بیان کر دینا ہے اور ان کا اعلان عام کر دینا کسی قوم کے علو شان اور اس کی انسانیت دوستی کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے۔ مدتِ دراز سے، ہم ایسی بے شمار قوموں کو دیکھ رہے ہیں جو آغاز میں بہت اعلیٰ اور ارفع مقاصد لے کر لوگوں کے سامنے آتی ہیں، لیکن دیگر اقوام کے ساتھ ان کا طرزِ عمل نہایت ہی ذلت آمیز، سنگ دلانہ اور رحم و انصاف کے انسانی اصولوں سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ مغربی استعمار نے خود ہمارے ملک کے اندر جو کھیل کھیلا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور نہ اس کے شرمناک اور سنگدلانہ کارناموں کی تاریخ ہم سے دُور ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہماری تہذیب کے عروج کے زمانے میں ان اصولوں کے عملی مظاہر کیا رہے ہیں۔ اس مقام پر آ کر کچھ اقوام کے حصے میں رُوسیاہی آتی ہے اور کچھ کے حصے میں سرخروئی اور یہی وُہ مقام ہے جہاں آ کر ملّتِ اسلامیہ تمام دُوسری ملّتوں سے ممتاز ہو جاتی ہے اور انسانیت دوستی میں نہ کوئی قوم اس کی شریک و سہیم نظر آتی ہے اور نہ کوئی تہذیب۔

## عہدِ نبوی کے شواہد:

ہم سب سے پہلے خود حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے کچھ واقعات پیش کریں گے۔ کیونکہ آپ ہی (اللہ کی ہدایات کے مطابق) ہماری تہذیب اور اس کی اساس کے بانی اور اس کے قواعد و ضوابط کے واضع ہیں۔ اور آپ ہی تہذیبِ اسلامی کے اغراض و مقاصد اور اصول و قواعد کی صحیح تعبیر کر سکتے ہیں۔ انبیاء کرام اور مصلحین کی تاریخ شاہد ہے کہ کسی کو اس کی دعوت کی راہ میں کمیت اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے ویسی اذیتوں اور شدائد کا سامنا نہ کرنا پڑا، جس قدر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ کو کرنا پڑا۔ حضور کی تیرہ سالہ مکّی زندگی آپ کے سامنے ہے۔ اس پورے دور میں آپ اور آپ کی جماعت کو مسلسل مخالفین کے بغض و کینہ، ان کی ایذا رسانی

اور ان کے سب دشمن کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ آپ اور آپ کے اصحاب کی جانوں کو شہید کرنے کے لیے سازشیں کی گئیں۔ اس کے بعد اگر مدینہ کے دس سالہ دَور پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ پُورا عرصہ انتھک جدّوجہد اور پیہم جہاد و مغازی پہ مشتمل ہے، آپ کو اس وقت تک جنگی لباس اُتارنے کا موقع نہ ملا، جب تک کہ آپ کی وفات سے تھوڑا عرصہ قبل، پُورا عرب آپ کے زیرِ نگیں نہ ہوگیا۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس دُنیا میں جو مسلسل عداوتوں، ظلم و ستم اور سازشیوں کا شکار ہوتا رہتا ہے، وُہ منتقم المزاج بن جاتا ہے اور جب میدانِ کارزار میں پہنچتا ہے اور ایک دفعہ تلوار اُٹھا لیتا ہے اور قتل و مقاتلہ کرتا ہے، تو اس کی طبیعت ہی خون آشام بن جاتی ہے۔ لیکن آپ دیکھیں کہ تمام لڑائیوں کے دوران، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے رہے؟ اور آپ نے اسلامی تہذیب کے جن جنگی اصولوں کا اعلان فرمایا تھا ان کو کس طرح عملی جامہ پہنایا؟

اُحد کے موقع پر، جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ہدایات کے خلاف قدم اُٹھا دینے کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہُوئی اور آپ کو دُشمنوں نے گھیر لیا اور وُہ آپ کی زندگی تمام کر دینے کے لیے آپ پر ٹوٹے پڑ رہے تھے اور آپ زخمی ہو گئے، آپ کا دانت مبارک شہید ہو گیا، چہرہ مبارک پر چوٹیں آئیں، خود کے حلقے آپ کے رخسار مبارک میں پھنس گئے آپ کے صحابہؓ نے جان پہ کھیل کر آپ کی مدافعت کی اور دُشمنوں کے نرغے سے آپ کو نکالا، اس وقت بعض صحابہؓ نے درخواست کی کہ آپ ان بدبختوں کے لیے بددُعا کریں۔ آپؐ نے فرمایا: "مجھے اللہ تعالیٰ نے ملامت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا، داعی اور رحمت بنا کر بھیجا ہے" "اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ نہیں جانتے" ——— یہ ہے وُہ حق پسندی جو بعض اوقات جنگ کے لیے مجبور تو ہو جاتی ہے، لیکن خونریزی کی پیاس بُجھانے کے لیے جنگ نہیں کرتی، بلکہ عین میدانِ جنگ میں اتنے سخت حالات سے گذرتے ہُوئے، نبی کی زبان مبارک سے نکلے ہُوئے الفاظ شہادت

ئے رہے ہیں کہ مقصود خون ریزی اور ملک گیری نہیں بلکہ یہ خواہش ہوتی کہ بھٹکی ہوئی انسانیت راہِ ہدایت پائے۔

اُحد کے اس معرکہ ہی میں سید الشہداء حضرت حمزہؓ شہید ہوئے، جو آپ کے چچا تھے اور ان کا شمار عرب کے مشہور شہ سواروں میں ہوتا تھا۔ ان کو وحشی نامی ایک غلام نے قتل کیا۔ اور یہ قتل بھی اتفاقی نہ تھا بلکہ ہند زوجۂ ابوسفیان کی ترغیب و تحریص پر تھا، پھر جب یہ شہ سوار گر پڑا تو شہداء کی لاشوں میں سے ہند نے حضرت حمزہؓ کی لاش کو تلاش کیا اور اس کا دل اور کلیجہ نکال کر دانتوں سے چبایا اور دشمنی اور شقاوت کا عالمی ریکارڈ قائم کر دکھایا۔ انقلابِ زمانہ دیکھیے کہ وحشی اور ہند دونوں مسلمان ہو کر حضور کے سامنے پیش ہوتے ہیں، آپ دونوں کا اسلام قبول کرتے ہیں، ہند کے لیے دُعا استغفار کرتے ہیں اور وحشی کو صرف یہ کہتے ہیں: کہ "تم ہم سے کہیں دور زندگی بسر کرو تو بہتر ہوگا" یہ ہے وُہ طرزِ عمل جو آپ نے اپنے چچا کے قاتل اور ان کے دل و جگر چبانے والی کے ساتھ کیا۔

کسی معرکہ میں آپ نے دُشمن کی کسی عورت کو مقتول پایا۔ آپ سخت ناراض ہُوئے اور مجاہدین کو سخت تنبیہ کرتے ہُوئے فرمایا کہ کیا میں نے تم لوگوں کو عورتوں کو قتل کرنے سے نہیں روکا؟ یہ تو تم سے لڑ نہیں رہی تھی؟ یہ ہے اللہ کا وہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو عین معرکۂ کارزار میں انسانیت کا درس دے رہا ہے اور اپنی جنگی ہدایات کو عملی جامہ پہنا رہا ہے، جبکہ وُہ فوجوں کا سپہ سالارِ اعلیٰ ہے اور مختلف جنگوں میں حصّہ لیتا ہے۔

آپ مکّہ فتح کرتے ہیں، اور دس ہزار جانبازوں کے ساتھ نہایت شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوتے ہیں اور منظر یہ ہے کہ گیارہ سال کے وُہ کینہ پرور قریش جنھوں نے آپ کو ستانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی، آپ کے سامنے شکست خوردہ سر جھکائے کھڑے ہیں اور اپنے متعلق فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر آپؐ نے ان سے صرف ایک سوال کیا: "اے اہلِ قریش! تمہارا کیا خیال

ہے کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں ؟" اُنہوں نے کہا: "ہم بہت اچھے طرزِ عمل کی توقع رکھتے ہیں آپ اچھے بھائی اور ایک شریف بھائی کے لڑکے ہیں۔" تو آپ نے فرمایا: "میں آج تم سے وہی کہوں گا جو یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، اللہ تمھیں معاف کرے وہ نہایت رحم کرنے والا ہے، جاؤ میری طرف سے تم آزاد ہو" ——— یہ ہیں سرورِ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، عالمِ انسانیت کو خیر سکھانے والے، نہ کوئی خونریز جرنل، جو محض اپنے عزت و اقتدار کے لیے لڑتا ہے اور فتح کے نشے میں سرشار ہو جاتا ہے

## خُلفائے راشدین کا طرزِ عمل بھی یہی رہا :

آپ کے بعد آپ کے خلفاء اور صحابہ کا طرزِ عمل بھی تمام جنگوں اور فتوحات کے دوران یہی رہا۔ اُنہوں نے اسی چراغ سے اپنے دیے جلائے۔ اسی راہ پر چلے اور تہذیبِ اسلامی کے اُن اُصول و مبادی کو عملی جامہ پہناتے رہے، سخت سے سخت مرحلہ میں بھی اور مشکل سے مشکل وقت میں بھی اُنہوں نے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھا۔ بڑی سے بڑی فتوحات میں بھی وہ اپنے اصولوں کو نہ بھولے۔

## گورنر کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا :

لبنان کے بعض شرپسندوں نے وہاں کے عامل علی بن عبداللہ بن عباس کے خلاف بغاوت کردی۔ وہ ان سے لڑے اور انہیں شکست دی۔ انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اب ان مفسدہ پردازوں کے لیے یہ موقع نہ رہے کہ وہ پھر ایک جتھہ کی شکل میں منظم ہو کر فتنہ و فساد اور سرکشی کریں، لہذا انہیں منتشر کردیں اور ان میں سے کچھ کو جلاوطن کردیں۔ یہ وہ کم سے کم سزا تھی جو آج کل بھی مہذب سے مہذب ملک کے حکمران نہایت آسانی سے دے سکتے بلکہ دیا کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت کے ایک متقدد عالم دین امام اوزاعی نے انہیں لکھا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کا یہ فعل خلافِ شریعت ہوگا۔

بغاوت میں عملاً حصہ لینے والوں کے ساتھ دُوسرے ذمیوں کو سزا دینا اور انہیں جلا وطن کرنا کسی صُورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ جو مجُرم ثابت ہو جائیں صرف انہیں سزا دی جا سکتی ہے، اُنہوں نے عاملِ لبنان کو جو خط لکھا تھا اس کا یہ حِصّہ قابلِ غور ہے :

"مجھے معلوم ہُوا ہے کہ آپ نے جبلِ لبنان کے اہلِ ذمہ میں سے بعض لوگوں کو قتل کیا ہے اور بعض کو اپنے وطن سے نکال دیا ہے اور ان جلا وطن لوگوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو باغیوں کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کر رہے تھے۔ آپ بتائیں کہ ایک خاص آدمی یا گروہ کے گناہ کے عوض آپ عوام النّاس کو کس اصول کے مطابق سزا دے رہے ہیں ؟ آپ ان لوگوں کو ان کے ملک اور جائدادوں سے نکال رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی" یہ ایک بہترین موقف ہے اور اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ نیز رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی یہ وصیّت ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ من ظلم معاھدًا او کلفه فوق طاقته فانا خصیمه یوم القیامة ۔ جس نے کسی معاہد پر کوئی ظلم کیا یا اس پر ناقابلِ برداشت بار ڈالا تو قیامت کے دن میں اس کا مُدعی ہُوں گا" اب والیٔ لبنان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وُہ ان لوگوں کو، اعزاز واکرام سے اپنے گھروں کو لوٹا دے۔

## اور یہ ہے انگریزوں اور فرانسیسیوں کا طرزِ عمل :

میں اس واقعہ پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا، البتہ اس موقع پر صرف یہ کافی ہے کہ میں لوگوں کو فرانسیسیوں کا وُہ طرزِ عمل یاد دلادوں جو انہوں نے ہماری جنگِ آزادی کے دوران ہم سے روا رکھا، جب یہ لوگ ہمارے ہی ملک پر قابض تھے۔ اور اب آج کل وہ شمالی افریقہ کے عرب عوام سے وہی کچھ کر رہے ہیں۔ انہوں نے وہاں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے اور بیسیوں آباد شہروں

کو اُجاڑ کر چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا ہے اور وُہ ایسے نظر آتے ہیں، گویا یہاں کوئی گھر تھا تو نہیں، نیز فلسطین میں عربوں کی جنگِ آزادی کے دوران انگریزوں نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا وُہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ میں سمجھتا ہُوں کہ فتوحات کے بعد اور لڑائیوں کے دوران، ہماری تہذیب نے انسانوں کے ساتھ جو رحیمانہ برتاؤ کیے ہیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے دورِ حاضر کی مہذب کہلانے والی قوموں کی محض اس روش کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔

## ہے کسی تہذیب میں اس کی کوئی نظیر؟ :

جب حضرت عمر بن عبدالعزیز، مسندِ خلافت پر بیٹھے تو سمرقند کے لوگوں کا ایک وفد ان کے پاس شکایات لے کر آیا کہ وہاں کے اسلامی لشکر کے سپہ سالار قتیبہ نے بغیر کسی جواز کے ان کا شہر لے کر وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کو بسا دیا ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے عاملِ سمرقند کو لکھا کہ وُہ قتیبہ اور سمرقندیوں کے مقدمہ کے لیے وہاں ایک اسپیشل عدالت مقرر کریں۔ اگر جج یہ فیصلہ کرے کہ مسلمانوں کو وہاں سے نکل جانا چاہیے تو وُہ فوراً شہر خالی کر دیں۔ عامل نے جمیع بن حاضر الباجی کو مقرر کیا تاکہ وُہ تحقیقات کریں۔ تحقیقات کے بعد انہوں نے، جو خود بھی مسلمان تھے، مسلمانوں کے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ دیا۔ نیز یہ لکھا کہ اسلامی فوج کے سپہ سالار کو چاہیے تھا کہ پہلے ان کو جنگ کا الٹی میٹم دیتے اور اسلام کے جنگی قانون کے مطابق تمام معاہدے منسوخ کرتے تاکہ اہلِ سمرقند مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے تیاری کر سکتے، ان پر اچانک حملہ نا روا تھا" ——— جب اہلِ سمرقند کو یہ صورتِ حال دیکھ کر یقین ہو گیا کہ تاریخِ انسانیت کے اندر اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی حکومت نے کسی فوج کے کمانڈر انچیف کو اور فوج کو ایسے ضوابط کے اندر کس رکھا ہو تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایسی قوم سے جنگ فضول ہے۔ بلکہ ایسی قوم کی حکمرانی اللہ کی نعمت اور رحمت ہے۔ لہٰذا وہ اسلامی فوج کے رہنے پر رضامند ہو گئے اور فیصلہ کیا کہ مسلمان

ان کے درمیان رہیں۔

غور کیجیے! ایک فوج ایک شہر فتح کر کے اس میں داخل ہو جاتی ہے، لوگ فاتح حکومت سے شکایت کرتے ہیں، حکومت کے جج خود اپنی فاتح فوج کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں اور فوج کے اخراج کا حکم صادر کرتے ہیں اور طے کرتے ہیں کہ لوگوں کی مرضی کے خلاف وُہ وہاں نہیں رہ سکتے۔ کیا انسانیت کی قدیم اور جدید تاریخ میں کوئی شخص کسی ایک جنگ کی نشان دہی کر سکتا ہے، جس کے سپاہی اپنے آپ کو ایسی حدود و قیود کا پابند رکھتے ہوں اور سچائی اور صداقت کے ایسے بلند پایہ اصولوں کی پیروی کرتے ہوں جیسا کہ ہماری تہذیب کے فرزندوں نے کر کے دکھایا؟ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اقوام عالم میں کسی قوم کے اندر بھی، ایسے اخلاق کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔

## یہ ہے پاسِ عہد اور شرافت :

ہماری ظفر مند فوج دمشق، حمص اور شام کے بقیہ شہروں کو فتح کرتی ہے، اور صلح نامہ کے مطابق وہاں کے باشندوں کی جان و مال کی حفاظت اور ملک کے دفاع کے لیے کسی قدر ٹیکس وصول کرتی ہے، لیکن اس کے بعد مسلم قائدین کو خبر ملتی ہے کہ ہرقل نے ایک عظیم فوج تیار کی ہے اور وُہ اسے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کُن معرکہ میں آزمانے والا ہے اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وُہ تمام مفتوحہ شہر خالی کر کے ایک ہی مقام پر جمع ہو جائیں اور ہرقل کی تیار کردہ بھاری فوجی طاقت کا مِل کر مقابلہ کریں۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق ہماری افواج حمص، دمشق اور دوسرے شہروں کو خالی کرنے لگیں۔ حضرت خالدؓ نے اہلِ حمص کو، ابو عبیدہ نے اہلِ دمشق کو اور دُوسرے کمانڈروں نے دُوسرے شہریوں کو جمع کر کے ان سے کہا:

"ہم نے آپ لوگوں سے جو رقوم وصول کی تھیں وُہ اس لیے تھیں کہ ہم تمہاری جان و مال کی حفاظت کریں گے اور بیرونی حملہ آوروں سے تمہارا

بچاؤ کریں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب ہم تم سے جُدا ہو رہے ہیں اور تمہاری حفاظت اور دفاع کی ذمّہ داری ادا نہیں کر سکتے، لہٰذا آپ لوگوں کی رقومات یہ ہیں جو ہم واپس کر رہے ہیں۔"

اس پر اُنہوں نے کہا:

"اللہ آپ لوگوں کو فتح یاب کرے اور یہاں دوبارہ لوٹائے، تمہاری حکومت اور تمہارے عدل و انصاف نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، کیونکہ ہمیں رُومیوں کے ہم مذہب ہونے کے باوجود ان کے جور و ظلم کے بڑے تلخ تجربات ہُوئے ہیں۔ خدا کی قسم اگر تمہاری جگہ وُہ لوگ ہوتے تو وُہ ہم سے لیے ہُوئے اموال میں سے ایک کوڑی بھی نہ لوٹاتے، بلکہ اپنے ساتھ وُہ تمام چیزیں بھی اُٹھا کر لے جاتے جنھیں وُہ اُٹھا سکتے۔"

آج ہمارے اس مہذّب دَور میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر کسی فوج کو کہیں کوئی جگہ خالی کرنی پڑتی ہے تو وُہ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑتی جس سے دُشمن فائدہ اُٹھا سکے، لیکن کیا ہماری تہذیب کی فاتح افواج کے رویّہ جیسی پُوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ہے؟ خدا کی قسم اگر اعلیٰ اقدار پر ایمان نہ رکھنا اور ان کی کامیابی پر یقین نہ رکھنا یا عہدِ حاضر کے سیاستدانوں کی طرح، اخلاق و اصول کو سیاسی مفادات کے تابع نہ رکھنا ضروری سمجھنا، تو میں کہہ دیتا کہ ہماری فوج کے قائدین نے غفلت اور حماقت کی بنا پر اعلیٰ اقدار اور اصول پسندی کو اپنائے رکھا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ لوگ فی الواقع سچے مومن تھے اور یہ پسند نہ کرتے تھے کہ وہ کوئی ایسی بات کہیں جسے وُہ عملاً کر کے نہ دکھائیں۔

## علامہ ابنِ تیمیہ یہودیوں اور عیسائیوں کی رہائی کے لیے آگے بڑھے:

جب تاتاریوں نے شام کے علاقے پر یلغار کی اور بے شمار مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو قید کر لیا تو شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ نے تاتاریوں کے امیر سے قیدیوں

کی رہائی کے سلسلہ میں گفتگو کی ۔ امیر نے کہا کہ وُہ صرف مسلمان قیدیوں کی رہائی کے لیے تیار ہے اور عیسائیوں اور یہودیوں کو نہ چھوڑے گا ۔ لیکن شیخ الاسلام نے اُسے منظور نہیں کیا اور کہا کہ ان سارے عیسائیوں اور یہودیوں کی رہائی بھی ضروری ہے جو ہمارے اہلِ ذمّہ ہیں اور ہماری قید میں ہیں ۔ ہم ایک فرد کو بھی قید میں رہنے نہیں دینا چاہتے خواہ وُہ ہماری مِلّت کا ہو یا ہمارے اہلِ ذمّہ میں سے ہو۔

## عیسائی سُورماؤں کی بربریّت :

اس کے برخلاف کسے نہیں معلوم کہ صلیبی جنگوں کے دوران عیسائی سورما کیا کرتے رہے ہیں ؟ قرونِ وُسطیٰ میں جب یہ جنگیں ہم پر مُسلّط کی گئیں ، تو ہم برابر عہد کی پاسداری کرتے رہے اور وُہ لوگ مسلسل غداری کرتے رہے ، ہم ان سے درگذر کرتے رہے اور اُنہوں نے ہمیشہ انتقام لیا ۔ ہم انسانی جانوں کی حفاظت کرتے رہے اور انہوں نے اس قدر خونریزی کی کہ سڑکوں پہ گھٹنے گھٹنے خون بہ گیا ، لیکن یہ سنگ دل اپنے ان کارناموں پر فخر کرتے رہے ۔ خوشیاں مناتے رہے اور لطف اندوز ہوتے رہے ۔

جب یہ صلیبی سورما اپنے دُوسرے حملے میں معرہ النعمان پہنچے تو اہلِ معرہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہُوئے ، لیکن انہوں نے شہر کو دُشمن کے حوالے کرنے سے پہلے حملہ آوروں کے ذمہ دار قائدین سے اپنی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا پختہ عہد لیا ، لیکن پھر کیا ہُوا ؟ ہُوا یہ کہ ان درندوں نے شہر میں داخل ہوتے ہی ایسے مظالم ڈھائے جن کی ہولناکی سُن کر بچّے مارے دہشت کے بُوڑھے ہو جائیں ۔ خود بعض ایسے انگریز مؤرخین کا بیان ہے ، جو اس جنگ میں شریک تھے ، کہ وہاں کے مقتولین کی تعداد ایک لاکھ تھی جن میں بچّے ، بُوڑھے ، مرد اور عورتیں سب شامل تھے ۔

اس کے بعد دُشمن بیت المقدس کی طرف بڑھا اور وہاں کی آبادی کو محاصرہ میں لے لیا ، لوگ سمجھ گئے کہ وُہ لازماً مغلوب ہوں گے ، اُنہوں نے حملہ آوروں کے سپہ سالار

ٹکڑے سے اپنی جان و مال کی حفاظت کا عہد لیا۔ اس نے ان کو ایک سفید جھنڈا دیا کہ وُہ مسجد اقصیٰ پہ لہرا کر اندر داخل ہو جائیں اور ہر چیز کے بارے میں انہیں امان دے دی گئی ——— اب یہ لوگ شہر میں داخل ہُوئے، لیکن آہ! کہ یہ مقدس شہر کس قدر ہولناک مذبح بنا! آہ، کس قدر ہولناک جرائم کا ارتکاب کیا گیا!

بیت المقدس کے باشندوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی، جس پر انہوں نے ٹنکرڈ کا دیا ہوُا امن کا جھنڈا اس کے حکم کے مطابق لہرا دیا تھا، مسجد مقدس بُوڑھوں، بچوں اور عورتوں سے بھری ہُوئی تھی۔ پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ جان و مال کی حفاظت کا عہد کرنے اور امن کا جھنڈا دینے والے مسجد میں گھُسے اور ان تمام ضعفاء کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا، معبد خون سے بھر گیا اور فوجیوں کے گھٹنوں تک خون جا پہنچا۔ شہر کے تمام باشندوں کو ذبح کر کے بزعمِ خود شہر کو پاک کیا گیا۔ شہر کی سڑکیں انسانی کھوپڑیوں سے اَٹ گئیں۔ ہر طرف کٹے ہُوئے اعضا اور ہاتھ پاؤں اور مسخ شدہ اجسام بکھرے پڑے تھے۔ ہمارے فوجیوں نے بیان کیا ہے کہ صرف مسجد اقصیٰ کے اندر ستّر ہزار نفوس کو ذبح کیا گیا جن میں بچّوں اور عورتوں کے علاوہ بڑے بڑے علماء اور فضلاء، عابدوں اور زاہدوں کی ایک کثیر تعداد بھی تھی۔ خود انگریز مؤرخین نے بھی ان شرمناک واقعات کا انکار نہیں کیا بلکہ وہ ان کارناموں کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کرتے ہیں۔

## صلاح الدّین ایوبی کے رحم دلانہ برتاؤ:

اس سفاکی کے ۹۰ سال بعد صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو فتح کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُنہوں نے وہاں کے باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہاں قریب ایک لاکھ مغربی باشندے آباد تھے۔ اُنہوں نے ان کو جان و مال کی امان دے دی اور ہر شخص سے نہیں بلکہ محض صاحبانِ استطاعت سے ایک معمولی رقم لے کر سب کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ ان کو جانے کی تیاری کے لیے چالیس دن

کی مہلت بھی دی۔ اس طرح وہاں سے ۴۰ ہزار انسانوں کا نہایت اطمینان اور امن و امان کے ساتھ انخلا عمل میں آیا، جو عکا وغیرہ میں اپنے متعلقین کے ہاں پہنچے پھر بہت سے نادار لوگوں کو بغیر کسی فدیہ کے چھوڑ دیا گیا اور ان کے بھائی ملک عادل نے ۲ ہزار آدمیوں کا فدیہ اپنے جیب خاص سے دیا اور عورتوں سے تو انہوں نے ایسا سلوک کیا جو آج کل کے کسی مہذب فاتح سے متوقع تو کجا، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

پھر جب عیسائی پیٹرآف پارک نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا تو سلطان نے اس کو اجازت دے دی۔ اس کے پاس "بیع" "صخرہ" "اقصیٰ" اور "قیامت" کی بے شمار دولت تھی جس کی صحیح مقدار صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ بعض مشیروں نے صلاح الدین کو مشورہ دیا کہ اس کی دولت ضبط کر لی جائے۔ لیکن سلطان نے ان کو یہ جواب دیا "میں کسی حال میں عہد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا" اور اس سے بھی صرف اسی قدر فدیہ وصول کیا جو ایک عام فرد سے لیا گیا تھا۔ لیکن جس چیز نے صلاح الدین کے فتح بیت المقدس کے موقع پر ان کے طرزِ عمل کو چار چاند لگا دیے، وہ یہ تھی کہ انہوں نے قدس کے تمام انخلا کنندہ عیسائیوں کے ساتھ اپنے محافظین بھی بھیجے اور ان کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو صور اور صیدا کی عیسائی آبادیوں تک ان کے عیسائی بھائی بندوں کے پاس حفظ و امان کے ساتھ پہنچا دیں۔ حالانکہ اس وقت پوری عیسائی دنیا مسلمانوں سے برسرپیکار تھی، کیا ایسی باتیں سن کر آپ اپنے کو عالم بیداری میں ہونے کا یقین دلا سکتے ہیں؟

لیکن یہ داستان ابھی ادھوری ہے، آگے سنیے، کئی ایسی عورتیں جنہوں نے جزیہ ادا کر دیا تھا، سلطان کے پاس آئیں اور درخواست کی کہ ان کے شوہر، باپ اور بیٹے جنگ میں مارے جا چکے ہیں یا قید میں ہیں اور نہ ان کی کوئی خبرگیری کرنے والا ہے اور نہ ان کی کوئی جائے پناہ ہے۔ وہ رو رہی تھیں، انہیں اشک بار دیکھ کر رقیق القلب سلطان کا دل بھر آیا اور وہ بھی رونے لگے۔ پھر انہوں نے حکم دیا کہ تحقیقات کر کے ان عورتوں میں سے جن کے شوہر یا بیٹے یا باپ قید میں ہوں ان کو رہا کر دیا جائے، اور جن عورتوں کے اولیاء قتل ہو چکے تھے ان کو کثیر التعداد مال دیا۔ یہ عورتیں جہاں بھی جاتیں سلطان کی مدح

وتعریف میں رطبُ اللسان ہوئیں۔ جب تحقیقات کے بعد وُہ فیدی رہا ہُوئے تو ان کو بھی اجازت دے دی کہ وُہ اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کو ساتھ لے کر صوؔر اور عکّا وغیرہ اپنے بھائی بندوں کے پاس چلے جائیں۔

اب ذرا یہ بھی سُن لیجیے کہ قدس سے جانے والے کچھ عیسائیوں کے ساتھ ان کے بھائی بندوں نے کیا سلوک کیا۔ ان میں سے کچھ لوگ انطاکیہ گئے، مگر وہاں امیر نے ان کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا، یہ بیچارے سرگرداں پھرتے رہے اور بالآخر مسلمانوں ہی نے ان کو پناہ دی۔ ایک گروہ نے طرابلس کا رُخ کیا، جو اس وقت لاطینیوں کے قبضے میں تھا لیکن انھوں نے بھی ان کو قبول نہ کیا اور وہاں سے بھگا دیا اور ان کا وُہ سارا ساز و سامان لُوٹ لیا جو مسلمانوں نے انھیں لے جانے دیا تھا۔

صلیبی جنگوں میں مغربی عیسائیوں کے ساتھ صلاح الدّین کا یہ سلوک بادی النظر میں بالکل افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر خود مغربی مصنّفین کو اسلام کے اس بطلِ جلیل کی شرافتِ نفس اور بلند اخلاقی نے تعجب میں نہ ڈال دیا ہوتا، تو یقیناً آج دُنیا کے لیے یہ گنجائش ہوتی کہ وُہ ہمارے مؤرخین پر مبالغہ آرائی کا الزام لگائے۔ خود اہلِ مغرب اس کا ذکر کرتے ہیں کہ جب صلاح الدّین کو صلیبی حملہ آوروں کے سب سے بڑے اور سب سے بہادر جنرل رچرڈ کی بیماری کی اطلاع مِلی تو انھوں نے علاج کے لیے اپنا طبیب خاص بھیجا اور اس کو ایسے میوہ جات بھی بھیجے جو اُسے، اس وقت ہرگز نہ مل سکتے تھے یہ بات اُن حالات میں ہُوئی جبکہ دونوں کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور دونوں کی فوجیں ایک دُوسرے کے خلاف نبرد آزما تھیں، نیز وُہ (اہلِ مغرب) خود لکھتے ہیں کہ ایک عورت روتی ہُوئی صلاح الدّین کے خیمے تک جا پہنچی اور اس نے داویلا کرتے ہُوئے شکایت کی کہ دو حبشی فوجیوں نے اس کے بچے کو چھین لیا ہے صلاح الدّین خود بھی رو دیے اور اسی وقت ایک تحقیقاتی افسر متعین کیا، جس نے بچے کو تلاش کر کے عیسائی عورت کے حوالے کر دیا۔ اور عورت کو چند سپاہیوں کی حفاظت میں اس کے کیمپ تک پہنچا دیا۔ کیا اس کے باوجود بھی کسی کو یہ کہنے کا مُنہ ہے کہ

ہماری تہذیب کے عسکری اخلاق انسانیت نواز نہیں ہیں ہیں۔

## سلطان محمد ثانی کے فیاضانہ سلوک :

جب سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا تو وہ آیا صوفیہ کے گرجے میں داخل ہوا۔ جہاں تمام پادریوں نے پناہ لی تھی اور ان لوگوں سے نہایت خوش اخلاقی سے ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کی جائز بات کی حمایت کریں گے لہذا خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں، اور جو مسیحی ڈر کے مارے یہاں جمع ہیں، ان کو بے فکر ہو کر نہایت اطمینان سے اپنے اپنے گھروں کو چلے جانا چاہیے۔ اس کے بعد محمد ثانی نے مسیحیوں کے مختلف مسائل کی طرف توجہ کی اور ان کا انتظام کیا۔ ان کو اس بات کی ضمانت دی کہ وہ اپنے شخصی قوانین، دینی فرائض اور اپنے مخصوص کلیساؤں کے مقررہ رسم و رواج کی پوری طرح پابندی کر سکتے ہیں، یہی نہیں بلکہ اس نے قسیسوں کو اختیار دیا کہ وہ اپنے لیے آزادانہ طور پر کسی کو بھی پیٹرآف یارک منتخب کریں چنانچہ انہوں نے جناد یوس کو منتخب کیا، اس موقع پر سلطان نے بھی بڑی شان و شوکت سے وہی تقریب منعقد کی جو عام طور پر عہد بزنطینی میں منعقد ہوتی تھی۔ اس نے پیٹرآف یارک سے کہا آپ ہر وقت اور ہر جگہ بحیثیت پیٹرآف یارک میرے دوست ہیں اور آپ ان تمام حقوق و امتیازات سے فائدہ اٹھائیں جو آپ سے پہلے کے، پیٹرآف یارک کو حاصل تھے" اس کے بعد سلطان نے اسے ایک خوبصورت گھوڑا ہدیتاً عطا کیا اور اس کی حفاظت کے لیے اپنے مخصوص باڈی گارڈوں یعنی انکشاریوں میں سے ایک کو مقرر کیا اور حکومت کے بڑے بڑے آفیسر اس کے ساتھ آپ کے محل تک گئے، جو اس کے لیے سلطان نے تیار کرایا تھا۔ پھر سلطان نے اعلان کیا کہ اس نے آرتھوڈکس کلیسا کے قوانین کو منظور کر لیا ہے، اور ان قوانین کا نگران پیٹرآف یارک ہوگا، فتح کے موقع پر عیسائیوں کا جس قدر سامان آثارِ قدیمہ اور متروکات لوگوں نے اٹھا لیے تھے وہ آپ نے قیمتاً خرید کر کلیساؤں اور متعلقہ اداروں کے حوالہ کر دیے۔

سلطان محمد فاتح نے عیسائیوں کے ساتھ یہ سلوک ان حالات میں کیا جب اس کے اور عیسائیوں کے درمیان قسطنطنیہ کی فتح کے وقت کوئی معاہدہ نہ ہوا تھا، جس کی پابندی آپ پر لازم ہوتی، یہ رعایت اور حمایت اس کا خالص فیاضانہ حسنِ سلوک تھا۔ اس سلوک کی وجہ سے اہلِ قسطنطنیہ یہ محسوس کرتے رہے کہ وہ اپنے سابق بازنطینی حکمرانوں کی بہ نسبت، اس نئی اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ زیادہ پُرامن اور مذہبی آزادی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

## عثمانی حکمرانوں کے سلوک :

اسی طرح عثمانی حکمرانوں نے اپنے قریبی مفتوحہ علاقوں میں عیسائی رعایا کے ساتھ حسنِ سلوک جاری رکھا مثلاً ریاست ہائے بلغاریہ اور یونان میں، جبکہ اس طرح کے سلوک اس وقت خود پورے یورپ میں عیسائیوں کے ساتھ نہیں کیے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہنگری اور ٹرانسلفانیہ میں کلفن کے ساتھیوں اور ٹرانسلفانیہ کے مذہب توحید کے قائل مسیحیوں نے ہیبسبرگ نامی متعصب فرقے کے ظالمانہ اقتدار کی ماتحتی میں جانے کے بجائے، مدتِ دراز تک ترکوں کے زیرِ اقتدار ہی رہنا گوارا کیا۔ سیلزیا کے پروٹسٹنٹ فرقوں کی یہ آرزو رہی کہ وہ مسلمانوں کے تابع رہ کر مذہبی آزادی حاصل کریں۔

## یورپ کے عیسائیوں کا خود اپنے بھائیوں کے ساتھ سلوک :

جس وقت ترکی خلافت کے تحت عیسائیوں کے ساتھ یہ سلوک اور شریفانہ برتاؤ ہو رہا تھا عین اسی زمانے میں یورپ میں مذہبی تعصب شباب پر تھا۔ متعصب حکمران مخالف فرقوں کا ناطقہ بند کر رہے تھے اور عام مذہبی فرقے بھی ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے تھے خون بہہ رہے تھے اور کسی کی جان محفوظ نہ تھی۔ ساتویں صدی میں انطاکیہ کے پیٹر آف بارک مسٹر مفاربوس ان مظالم کے متعلق جو پولینڈ کے رومن کیتھولک فرقوں نے آرتھوڈکس فرقے پر روا رکھے، کہتے ہیں :

"ہم ان ہزاروں شہداء پر خون کے آنسو روتے ہیں جو ان چالیس، پچاس برس کی مدت کے درمیان ان ظالم دشمن کیتھولک زندیقوں اور دین کے دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اور جن مقتولین کی تعداد ستر ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اے غدارو! اور اے ناپاک فساق! اے پتھر کے دل رکھنے والو! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ گرجوں میں عبادت کرنے والی راہب عورتوں کا جرم کیا تھا؟ عام عورتوں سے کیا گناہ سرزد ہوا تھا؟ بچوں، دوشیزاؤں اور چھوٹی بچیوں نے کیا قصور کیا تھا؟ تم نے ان کو کیوں تہ تیغ کر ڈالا؟ میں انہیں کیوں نہ پولینڈ کے ملعون کہوں؟ جبکہ انہوں نے اپنے آپ کو مسیحیوں سے سنگ دلانہ برتاؤ کرنے والے مفسدہ پرداز بت پرستوں سے بھی زیادہ ذلیل اور زیادہ سنگ دل ثابت کیا ہے۔ انہوں نے مسیحیوں پر مظالم کر کے یہ سمجھا کہ اس طرح آرتھوڈکس کلیسا کا نام و نشان تک مٹا دیں گے اللہ تعالیٰ ترک گورنمنٹ کو قیامت تک قائم رکھے جو اپنے واجبات (جزیہ) لیتے ہیں اور جنہیں دوسرے ادیان سے کوئی بیر نہیں خواہ ان کے وہ رعایا مسیحی ہوں یا ناصری، یہودی ہوں یا سامری۔ لیکن پولینڈ والے ملعونوں نے مسیحی بھائیوں سے صرف ٹیکس لینے پر ہی اکتفا نہیں کیا، باوجود اس کے کہ مسیحی بطیب خاطر ان کی خدمت پر آمادہ رہے، بلکہ انہوں نے مسیحیوں کو ظالم یہودیوں کے پنجے میں دے دیا جو حضرت مسیح کے دلی دشمن ہیں، اور جنہوں نے عیسائیوں کو ایک بھی کنیسہ بنانے کی اجازت نہیں دی اور نہ مسیحیوں کے لیے کوئی ایسا پادری چھوڑا جو ان کو ان کے دین کی تعلیمات دیتا۔"

## مسیحیوں کا خود مسیحیوں کے خلاف جنون و درندگی :

یہ تو مختصر سا تذکرہ تھا آیا صوفیا والوں سے سلطان محمد فاتح کے فیاضانہ برتاؤ

کا اور اس امر کا کہ اس نے قسطنطنیہ کے عیسائیوں کے حقوق سے متعلق کتنی فراخ دلی سے کام لیا۔ اب اس کے مقابلہ میں ذرا یورپ کے ان عیسائیوں کے برتاؤ کا حال بھی سن لیجیے کہ وہ جب ۱۲۰۴ء میں قسطنطنیہ پر قابض ہوئے تو انہوں نے خود اپنے بھائی آرتھوڈکس مسیحیوں کے ساتھ کیا کچھ کیا، اور بجائے اس کے کہ میری زبان سے سنیے، انسنٹ سوئم پاپائے روم کی زبان سے سنیے۔ موصوف کہتے ہیں کہ:

"مسیح کے متبعین اور اس کے دین کے حامیوں کا فرض تو یہ تھا کہ وہ اپنی تلواروں کا رخ مسیحیت کے بڑے دشمن (اسلام) کی طرف پھیرتے، لیکن افسوس کہ انہوں نے خود مسیحی خون بہایا جس کا بہانا ان کے لیے مذہباً حرام تھا۔ لیکن انہوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور خون کے دریا بہائے۔ اور نہ دین کا کوئی احترام کیا، نہ عورت اور مرد کا کوئی امتیاز باقی رکھا، اور نہ عمروں (بچے، جوان، بوڑھے) کا کوئی لحاظ رکھا۔ اور دن دہاڑے زنا کاریاں کیں۔ راہب عورتیں، بچوں والی مائیں اور دوشیزائیں ان ہوسناکوں کے سامنے بے بس تھیں اور اس لشکر کے جنسی درندوں نے انہیں جھنجھوڑا۔ ان لوگوں نے بادشاہ اور دوسرے امرا کی مال و دولت لوٹنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ کلیساؤں کی زمینوں اور جائدادوں کو بھی خوب لوٹا۔ انہوں نے کلیساؤں کی بھی بے حرمتی کی۔ ان کی مقدس تصاویر، صلیبوں اور متبرک آثار تک کو لوٹا۔"

اور مشہور مؤرخ شارل ڈیل لکھتے ہیں کہ:

"یہ مدہوش لشکر کنیسہ آیا صوفیہ میں داخل ہوا مقدس کتابوں کو ضائع کر دیا شہداء کی تصویروں کو اپنے پاؤں سے روندا۔ ایک بدکردار عورت وہاں پیٹرآف یارک کی کرسی پر بیٹھی اور اونچی آواز سے گانے لگی، شہر سے علمِ دین کے نشانات مٹا دیے گئے اور سونے چاندی سے بنے ہوئے مجسموں کو توڑا گیا تاکہ سکے ڈھالے جا سکیں۔"

اور ان المناک مناظر کا بچشمِ خود مشاہدہ کرنے والے راہب یوں شہادت دے رہے ہیں کہ :

"حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ کے پیروکاروں نے اس شہر کے ساتھ ویسا سلوک نہ کیا تھا جو خود مسیح کے نام لیوا راہبوں نے کیا۔"

ہاں یقیناً مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا جبکہ انہوں نے اسی شہر کو فتح کیا، جیسا کہ سلطان محمد فاتح کا رویہ سب کے سامنے ہے۔ اور مسلمان جب تک مسلمان ہیں وہ تنگ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ویسے شرمناک مذہبی تعصب کے قریب نہیں پھٹک سکتے، جیسے المناک اور انسانیت سوز سلوک خود مسیح کے پیروکاروں رومن کیتھولک نے مسیح ہی کے پیروکاروں آرتھوڈکس کے ساتھ کیے۔

## اندلس اور اسپین کی ایک حکایت :

میں اس موقع پر اندلس کے مسلمان فاتحین اور وہاں کی اقلیتوں کے ساتھ ان کے حسنِ سلوک، مشفقانہ برتاؤ اور ان کے احساسات کی حد درجہ رعایت کی داستان چھیڑنا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ اس کا مقابلہ اس طرزِ عمل سے کروں جو اہلِ سپین نے مسلمانوں سے روا رکھا، جبکہ انہوں نے مسلمانوں کی آخری ریاست، غرناطہ پر قبضہ کیا تھا اور یہ سب کچھ اُنہوں نے اسی وقت کیا جبکہ وُہ فتح کے وقت مسلمانوں کے ساتھ تقریباً ساٹھ شقوں پر مشتمل معاہدے کر چکے تھے کہ مسلمانوں کے دین، اُن کی مساجد اور ان کی عزت و ناموس اور ان کے اموال کی حفاظت کی جائے گی وغیرہ وغیرہ لیکن اُنہوں نے اپنے کسی عہد کو پُورا نہ کیا۔ اور نہ اپنی کسی ذمہ داری کو ادا کیا۔ بلکہ انہوں نے خون ریزی تک سے گریز نہ کیا اور بے شمار معصوم جانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا اور لوگوں کی جائدادوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر سقوطِ غرناطہ کے صرف بتیس سال کے اندر یورپ نے ۱۵۲۴ء میں اعلان کیا کہ تمام مساجد کو گرجوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کے چار سال کے اندر اندر اسپین کے اندر سے مسلمانوں کا نام و نشان

تک مٹا دیا گیا"۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ ہے عیسائیوں کی "وفائے عہد"۔۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ تھا ہمارا ایفائے عہد۔

## مقتضائے طبیعتش این است :

"نیشِ عقرب" کی فطرت پر کیا حیرت کیجیے؟ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اُن کا یہ سنگدلانہ رویہ اور اُن کی عہد شکنی خود اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ تھی اور یہ زیادتیاں اُن سے کم نہ تھیں جو وُہ مسلمانوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ اُنہوں نے جس ملک کو بھی فتح کیا وہاں اپنی سنگدلی اور ظلم و ستم کا مظاہرہ کیا خواہ وُہ کوئی مشرقی ملک ہو یا مغربی ہمیشہ وُہ ایک بے رحم بھیڑیے کی شکل میں رُونما ہوئے، خواہ ان کا شکار کوئی ضعیف مسلم ہو یا عیسائی۔ ان کے مصنفین خود اپنے اس قومی کردار پر روتے ہیں۔

پادری اوڈو دیلی جو لوئی ہفتم کا خاص درباری تھا، اور بذاتِ خود اس کے ساتھ دوسری صلیبی جنگ میں شریک ہوا تھا، یہ اپنے مشاہدات میں لکھتا ہے :

"جب عیسائی ایشیائے کوچک کے راستے بیت المقدس جا رہے تھے تو ان کو فریجیا کے پہاڑی راستوں میں ترکوں کے ہاتھوں سخت ہزیمت اُٹھانی پڑی اور یہ ۱۱۴۸ء کی بات ہے۔ یہ لوگ بڑی مشکل سے اٹلی کے ساحلی شہر تک پہنچے، یہاں جو لوگ یونانیوں کے بھاری بھرکم مطالبات (جو وُہ فوج کو سمندر پار کرنے کے معاوضے کے سلسلے میں پیش کرتے تھے) کو پورا کر سکتے تھے) وُہ تو ادا کر کے سمندر کے راستے انطاکیہ پہنچے۔ لیکن بیماروں، زخمیوں اور عام لوگوں کو اپنے خیانت کیش یونانی حلیفوں کے پاس ہی چھوڑ دیا، لوئی نے انہیں پانسو مارک دیے کہ وُہ ان لوگوں کی حفاظت کریں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کریں تاکہ وُہ واپس جانے کے قابل ہو جائیں اور اپنے ساتھیوں سے جا ملیں۔ لیکن فوج نے اٹلی کو چھوڑا ہی تھا کہ یونانیوں نے نہتے صلیبیوں کے متعلق ترکوں کو اطلاع دے دی اور بڑی خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے

کہ کس طرح یہ بدبخت لوگ بھوک، بیماری اور پھر دشمن کے نیزوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ ہلاکت اور تباہی ان پر اسی وقت آئی جبکہ وہ اپنی چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں سے چار ہزار آدمیوں کی ایک جماعت نے، مایوس ہو کر بھاگنے کی کوشش کی، ترک جو چھاؤنی تک پہنچ چکے تھے انہوں نے پھر حملہ کر دیا تاکہ فتح مکمل کر لیں، انہوں نے پوری فوج کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس تباہی سے جو لوگ بچ گئے تھے وہ بھی اپنی زندگی سے مایوس ہو رہے تھے لیکن مسلمانوں کا دل ان کی زبوں حالی کو دیکھ کر پسیج گیا اور اب دشمنی کے بجائے ان کے دل میں ان کی شفقت لوٹ آئی۔ انہوں نے مریضوں کی تیمارداری کی، بھوکوں اور ناداروں کی امداد کی، جو ہلاکت کے قریب تھے، مسلمانوں نے کھلے دل سے سخاوت اور داد و دہش کا مظاہرہ کیا۔ بعض نے تو فرانسیسی نقود یونانیوں سے قیمتاً لے کر ان مسافروں کو دیے جو یونانیوں نے جبراً یا دھوکہ دے کر ان سے ہتھیا لی تھیں۔ ان مسافروں کے ساتھ خود ان کے مسیحی یونانی بھائیوں کے ظالمانہ اور بہیمانہ سلوک اور کافروں (مسلمانوں) کے عادلانہ اور رحیمانہ سلوک میں ایک عظیم فرق تھا۔

یونانیوں نے ان کے ساتھ مزاح کیا، ان کو پیٹا اور ان کے لیے لوگی نے جو تھوڑا بہت چھوڑا تھا وہ لوٹ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بعض اپنے ان نجات دہندوں کے دین میں خوشی سے داخل ہو گئے۔ جیسا کہ ہمارے ایک قدیم مؤرخ کہتے ہیں: "ان کے اپنے سنگدل بھائیوں نے ان پر ظلم کیا لیکن کفار (مسلمانوں) کے ہاں ان کو امن ملا جنھوں نے ان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا۔" ـــــ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ واپس لوٹے ان میں سے تین ہزار سے زیادہ ترکوں

سے جا ملے۔ ہائے! یہ مہربانی اور رحمت غداری سے بھی زیادہ ناگوار ہے۔ اُنھوں نے ان مسافروں کو روٹی تو دی لیکن ان کا ایمان لے لیا اگرچہ یہ درست ہے کہ اُنھوں نے کسی کو اپنا دین چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ صرف اُن کی خدمت کرنے اور ان پر احسان کرنے پر ہی اکتفا کیا۔"

## حال کی تابناکی میں دیکھیے :

دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے، گذشتہ دو عالمگیر جنگوں میں مغربی اقوام کی سنگدلی کے آثار اور اسلامی مشرقِ وسطیٰ میں ان کے اخلاق و اعمال واضح شہادت دے رہے ہیں کہ حکمرانی اور جنگ کے میدان میں ان لوگوں کا کردار حد درجہ ظالمانہ اور بربریت کا نمونہ رہا ہے۔ ان لوگوں کی یہ منافقانہ پالیسی اب کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ وُہ بین الاقوامی مجالس میں تو اپنی تہذیب و تمدن، انسانیت دوستی اور محبت و شفقت کا یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں لیکن اپنی لڑائیوں میں، اپنے مقبوضات میں اور اپنی کالونیوں میں وُہ کھلے بندوں اپنے وحشی پن اور خون آشامی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بعض لوگ مغربی اقوام کے اس طرزِ عمل کے لیے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ قرونِ متوسط میں یہ لوگ اس قدر مہذب اور متمدن نہ تھے کہ ان سے کسی دُوسرے طرزِ عمل کی توقع رکھی جاتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب تو وُہ مہذب ہیں بلکہ تہذیب کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، اور تمام دُنیا کو علوم و فنون اور نئی ایجادات سے بہرہ مند کر رہے ہیں؟ اصل صورتِ حال یہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان اقوام کا اصل مزاج کیا ہے؟ جو ہر بناوٹ اور تصنّع پر بالآخر غالب آ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی ممالک کے اندر وُہ خصائل و عادات اب بھی بتمامہا موجود ہیں، جو ان میں اس وقت موجود تھیں جب وُہ وحشی اور بُت پرست تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں ان خصائل نے دینی تعصب کا رُوپ دھار لیا، لہٰذا ان کے وحشی پن کا بوجھ دین کو اُٹھانا پڑا اور آج ان کے وُہی سنگ دلانہ اور

وحشیانہ خصائل، تہذیب کا لباس پہن کر کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا امن و سلامتی اور تہذیب و تمدن کو ان کی سنگدلی اور انسانیت دشمنی کا بوجھ اُٹھانا پڑ رہا ہے۔ دراصل ہر زمانہ میں یہ اقوام مفسد، خون ریز، قوت پرست اور متعصب وحشی رہی ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ آخر کس مُنہ سے اسلامی فتوحات کے ذیل میں ہماری سنگدلی کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ (قطع نظر اس کے کہ وُہ جھُوٹ کا پلندہ ہے) اور اپنے قابلِ نفرت استعمار کو رحمت و شفقت کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اور جہاں تک حقیقتِ حال کا تعلق ہے، تو ہماری اور ان کی پوزیشن کسی شاعر کے بقول یہ ہے کہ :

ملکنا فکان العفو منا سجیۃ　　　فلما ملکتم سال بالدم ابطح[۱]

وما عجب هذا التفاوت بیننا　　　فکل اناء بالذی فیہ ینضح[۲]

۱۱

---

[۱] : ہم حکمران ہُوئے تو عفو و درگذر ہماری خاص جانی عادات تھیں، لیکن جب تم حکمران ہوئے تو تم نے خون کے دریا بہا دیے۔

[۲] : ہمارے اور آپ کے درمیان یہ فرق ہرگز موجبِ تعجب نہیں کیونکہ برتن سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو اس کے اندر ہوتی ہے۔

# ساتواں باب

# حیوانات پر رحم و شفقت

ہماری تہذیب کے دلکش پہلوؤں کے سلسلہ کا یہ ایک عجیب و غریب موضوعِ گفتگو ہے۔ اگرچہ ہمارے موجودہ زمانے میں یہ بہت زیادہ انوکھا معلوم نہ ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ زمانہ قریب تک دنیا اس کا تصور بھی نہ کرتی تھی حیوانات بھی رحم و انصاف کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ اور بعض اقوام کے ہاں تو اب تک یہ رواج ہے کہ ورزش، خوشی اور قومی تہواروں کے مواقع پر قتل حیوانات ان کی تفریح کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن یہاں بھی ہماری تہذیب، اپنے اصولوں اور طرزِ عمل کے لحاظ سے، ایسے لطیف انسانی شعور کی پیامبر بن کر اور ایسے رحیمانہ روپ میں سامنے آئی جو نہ کسی گذشتہ تہذیب کو نصیب ہوا اور نہ اسلامی تہذیب کے بعد آج تک کسی قوم کو میسّر آیا۔ یعنی حیوانات سے رحمت و شفقت کا سلوک اور یہ سلوک اس قدر غیر معمولی رہا ہے کہ اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہر آدمی کے لیے اس قدر باعثِ کشش ہے کہ اسے دیکھ کر انسان انگشت بدندان رہ جاتا ہے۔ اب اس کے متعلق کچھ باتیں سنیے :

## عالمِ حیوانات بھی ایک عالم ہے :

ہماری تہذیب کے اصول و مبادی نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ عالمِ حیوانات بھی، عالمِ انسان کی طرح کا ایک عالم ہے، جس کے کچھ خصائص ہیں، جس کا ایک خاص مزاج ہے۔ اور جو خاص نوعیّت کے شعور رکھتا ہے :

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ۔ (انعام : ۳۸)

"زمین میں جو چلنے پھرنے والا یا دو پروں سے اُڑنے والا جانور ہے، ان کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں۔"

## حیوانات بھی رحم و شفقت کے مستحق ہیں :

لہٰذا وُہ بھی رحم و شفقت کا اسی طرح مستحق ہے، جس طرح ایک انسان اس کا مستحق ہے :

الرّاحمون یرحمہم الرّحمٰن[1] و من اعطی الرفق فقد اعطی حظّہ من خیر الدّنیا و الآخرۃ

"رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، جسے نرم خوئی دی گئی، اُسے دُنیا و آخرت کی بھلائی کا ایک حصّہ دیا گیا۔"

## جزا و سزا :

بلکہ حیوان پر شفقت بعض اوقات ایک انسان کے لیے جنّت کا ذریعہ بن جاتی ہے :

بینما رجلٌ یمشی بطریق اذا اشتد علیہ العطش فوجد بئرًا فنزل

---

[1] : مسند امام احمد بن حنبل - ابو داؤد - ترمذی - حاکم

فیها فشرب ثم خرج فاذا کلب یلهث یأکل الثری من العطش فقال الرجل لقد بلغ ھذا الکلب من العطش مثل الذی کان بلغ منی فنزل البئر فملأ خفه ماء ثم امسکه بفیه حتی رقی فسقی الکلب فشکر اللہ تعالٰی له فغفرلهٗ۔ قالوا یا رسول اللہ ان لنا فی البھائم لاجرا۔ فقال فی کل ذات کبد رطبة اجر (بخاری۔ مسلم۔ مالک۔ احمد۔ ابوداؤد)

"ایک آدمی کہیں جا رہا تھا۔ اسے سخت پیاس لگی۔ اسے ایک کنواں ملا۔ وُہ اس میں اُترا اور پانی پی کر باہر نکل آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور پیاس کی شدت سے مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس آدمی نے دل میں کہا کہ یہ کتا بھی پیاس کی شدت سے اسی طرح بیتاب ہو رہا ہے جس طرح کہ میں بیتاب ہو رہا تھا، وُہ دوبارہ کنوئیں میں اُترا اور اپنے چمڑے کے موزے کو پانی سے بھرا اور منہ میں پکڑ کر اوپر چڑھ آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالٰی نے اس کی اس نیکی کو پسند فرمایا اور اس کی مغفرت فرمائی۔ حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا؟ یا رسُول اللہ ان بہائم سے حسنِ سلوک پر بھی ہمیں اجر ملے گا" آپ نے فرمایا: "ہر جگر دار اور چارہ کھانے والے حیوان سے حسنِ سلوک پر اجر ملے گا۔"

اس کے برعکس بعض اوقات حیوانات کے ساتھ سنگدلانہ برتاؤ کی وجہ سے ایک آدمی جہنم میں بھی داخل ہو سکتا ہے:

دخلت امراۃ النار فی هرۃ ربطتھا فلم تطعمھا ولم تدعھا تأکل من خشاش الارض۔ (بخاری)

"ایک عورت محض ایک بلی کی وجہ سے جہنم کی سزاوار ہوئی کہ اس نے اس کو باندھ رکھا تھا نہ کچھ کھانے کو دیا اور نہ آزاد چھوڑا تاکہ وُہ زمین پر رینگنے والی چیزیں کھا لیتی۔"

صرف ترغیب و ترہیب پر اکتفا نہیں کی گئی، بلکہ حیوان پر رحم و شفقت کے بارے میں قانون سازی تک کی گئی ہے، چنانچہ یہ ناجائز قرار دیا گیا ہے کہ کوئی کسی سواری کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا کسی سے باتیں وغیرہ کرنے کے لیے اس جانور کو دیر تک کھڑا کیے رہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "لا تتخذوا ظهور دوابکم کراسی" (رواہ احمد والحاکم) (اپنے حیوانات کی پیٹھوں کو کرسی نہ بنالو) اسی طرح حیوان کا بھوکا رکھنا اور اس کو کمزور اور نحیف و نزار رکھنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ایک دفعہ آپ ایک ایسے اونٹ کے پاس سے گذرے جس کا پیٹ (بھوک کے سبب) پیٹھ سے لگا تھا۔ اس پر حضور نے فرمایا:

اتقوا الله فی هذه البهائم المعجمة فارکبوها صالحة واترکوها صالحة (ابوداؤد)

"ان حیوانات کے معاملے میں اللہ کا خوف کرو جو بول نہیں سکتے۔ ان پر سواری کرو جبکہ وہ اس کے قابل ہوں اور انھیں چھوڑ دو جبکہ وہ اچھی حالت میں ہوں"۔

## حیوانات سے اُن کی طاقتِ برداشت سے زیادہ کام لینا جائز نہیں:

اسی طرح کسی حیوان سے اس قدر کام لینا بھی جائز نہیں ہے جس کا وہ متحمل نہ ہو سکتا ہو۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے، وہاں آپ نے ایک اونٹ دیکھا۔ جب اس اونٹ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بلبلانے لگا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ آپ اس اونٹ کے پاس آئے اور اس کے آنسو پونچھے، اور فرمایا: "اس اونٹ کا مالک کون ہے؟" اس کے مالک نے کہا: "میں ہوں اے اللہ کے رسول!" آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "کیا تمہیں اس حیوان کے معاملے میں اللہ کا خوف نہیں ہے؟ جس کو اللہ نے تیری ملکیت میں دیا ہے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس سے

کام تو لینے ہو، لیکن اسے بھوکا رکھتے ہوئے۔ (روایت امام احمد) اسی طرح بلا ضرورت، محض بطور تفریح حیوانات کا شکار کھیلنا بھی حرام قرار دیا گیا ہے، آپ فرماتے ہیں :

من قتل عصفورًا عبثًا عج الی اللہ یوم القیامۃ یقول یا رب
ان فلانًا قتلنی عبثًا ولم یقتلنی منفعۃ۔ (نسائی۔ ابن حبان)

"جس کسی نے ایک چڑیا کو بھی کھیل کے طور پر قتل کیا تو وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے فریاد کرے گی کہ اے اللہ اس نے مجھے کھیل کے طور پر قتل کیا تھا۔ اور کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے مجھے قتل نہیں کیا گیا۔"

اِسی طرح حیوانات کو نشانہ بازی کی مشق کے لیے استعمال کرنا بھی ممنوع ہے آپ کا ارشاد ہے :

لعن رسول اللہ من اتخذ شیئا فیہ الروح غرضا۔
(بخاری۔ و مسلم)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت بھیجی ہے جو کسی ذی رُوح کو بطور نشانہ استعمال کرتا ہے۔"

## یہ باتیں ممنوع ہیں :

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے حیوانات کو باہمی لڑانے سے منع فرمایا ہے[1]، اور نشان زدہ کرنے کے لیے ان کے چہروں کو آگ سے جھلسانے یا گرم سلاخوں وغیرہ سے داغنے سے بھی منع فرمایا (نشانات اس لیے کہ وہ دُوسرے حیوانات سے ممتاز ہو جائیں) رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے گدھے کے پاس سے گذرے، جس کے چہرے پر داغ لگائے گئے تھے تو آپ نے فرمایا "اس آدمی پر اللہ کی لعنت جس نے یہ کام کیا" اگر حیوان ایسا ہو جس کا گوشت کھایا جاتا ہے

---

[1] : جیسے مینڈھے یا مُرغ لڑائے جاتے ہیں یا بٹیریں لڑائی جاتی ہیں۔

تو اس پر شفقت یہ ہے کہ ذبح کرنے سے پہلے چھری کو خوب تیز کر دیا جائے، اسے پانی پلایا جائے اور کھال اُتارنے سے پہلے اسے ٹھنڈا ہونے دیا جائے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ:

"اللہ نے ہر چیز کے ساتھ احسان ضروری قرار دیا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو قتل کرنا پڑے تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور اگر ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو، ذبح کرنے والا اپنی چھری کو تیز کرے اور ذبیحہ کو ٹھنڈا ہونے دے۔" (روایت مسلم)

## بے نظیر تعلیمات:

بلکہ اس بارے میں اس قدر احتیاط کی گئی ہے کہ چھری تیز کرنے سے پہلے ہی حیوان کو گرا دینا بھی نہایت بے رحمی اور سنگدلی ہے۔ ایک آدمی نے اپنی بکری کو پچھاڑ رکھا تھا اور وہ چھری تیز کر رہا تھا، تو آپؐ نے فرمایا: "اتریدان تمیتها موتات" (کیا تم اسے مُردار کرنا چاہتے ہو؟) اور اس کے بعد فرمایا: "تم نے اس کو گرانے سے پہلے ہی چھری کیوں نہ تیز کر لی تھی۔" نیز مزید تنبیہ کہ حیوانات کے ساتھ رحیمانہ سلوک کے باب میں یہ واقعہ کتنا اثر انگیز ہے اور ہماری تہذیب کی رُوح کو کس قدر اُجاگر کرنے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی سفر میں تھے۔ ایک جگہ ہم نے ایک حمرہ (چڑیا جیسا ایک چھوٹا سا پرندہ) دیکھا جس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ہم نے ان دونوں کو پکڑ لیا، حمرہ آکر ہمارے سروں پر منڈلانے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک آئے، آپؐ نے فرمایا: "اس کے بچے چھین کر اس کو کس نے دکھ پہنچایا ہے؟ اس کے بچے اس کو واپس کر دو۔" اور اسی سفر کا یہ واقعہ ہے کہ حضورؐ نے دیکھا کہ چیونٹیوں کا گھر جلا دیا گیا ہے، تو آپؐ نے فرمایا: "یہ کس نے

جلایا ہے ؟ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ہم لوگوں نے جواب دیا
کہ" ہم نے"۔ تو آپؐ نے فرمایا ؟ اللہ کے سوا کسی کو یہ حق نہیں کہ وُہ
کسی کو آگ میں جلانے کی سزا دے"۔ (ابُو داوٗد)

## چند فقہی احکام:

اِن تعلیمات کی روشنی میں فقہائے اسلام نے حیوانات کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ کے ایسے احکام مقرر کیے ہیں جن کا کوئی تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ مثلاً وُہ فرماتے ہیں کہ مالک پر یہ لازم ہے کہ وُہ حیوانات کی ضروریات فراہم کرے۔ لیکن اگر وُہ ضروریات فراہم نہیں کر سکتا تو اسے قانوناً مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وُہ اس کی دیکھ بھال اور اس کی ضروریات فراہم کرے یا پھر اس حیوان کو فروخت کر دے یا پھر اسے جنگلات میں کھُلا چھوڑ دے جہاں اسے چارہ اور جائے پناہ مل سکے، اگر وُہ حلال جانور ہے، جس کا گوشت کھایا جاتا ہے تو اسے ذبح کر دیا جائے بعض لوگوں نے تو اس سے بھی سخت رائے اختیار کی ہے۔ وُہ کہتے ہیں" اگر ایک اندھی بلّی کسی کے گھر چلی جائے اور اِدھر اُدھر نہ جا سکے تو اس پر اس کی خوراک واجب ہو جاتی ہے"۔ نیز فقہاء نے حیوانات پر اُن کی قوّت برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے بھی منع کیا ہے۔ اس اصول سے اُنھوں نے کئی قانونی حقوق کا استخراج کیا ہے کہ اگر کوئی کسی حیوان کو کرایہ پر لیتا ہے اور اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادتا ہے، جس کی وجہ سے وُہ مر جاتا ہے، تو اس شخص پر اس کا ضمان لازم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح فقہائے اسلام نے بوجھ کی مقدار بھی متعیّن کر دی ہے جو خچر اور گدھے پر لادی جا سکتی ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایک فقیہ نے گدھے اور خچّر کے لیے ایک مقدار مقرر کی لیکن دُوسرے فقیہ نے ان کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور کہا؟ یہ مقدار معتدّ کر کے خچّر سے تو انصاف کیا گیا ہے لیکن گدھے

بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔"

ہاں حیوان اگر دُوسرے حیوان کو ستائے تو وُہ "لغو" ہے، لہٰذا کسی "مجرم" حیوان کو اس جُرم کی سزا نہ دی جائے گی، ہاں اس کے مالک کو سزا دی جا سکتی ہے اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ اس نے اس کے باندھنے اور حفاظت کرنے میں بے پروائی کی ہے۔ یہ ہیں چند وُہ زرّیں اصول جو ہماری تہذیب اور ہماری شریعت نے حیوانات کے متعلق وضع کیے ہیں سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ان اصولوں کے عملی نفاذ کی کیفیت کیا رہی؟

## حسنِ سلوک کی چند اور مثالیں:

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں جا رہے تھے کہ انصار کی کسی عورت نے اونٹنی کو کہا "تجھ پر لعنت" جبکہ وہ اس پر سوار بھی تھی۔ حضور کے کانوں میں جب اس عورت کے لعنت بھیجنے کی آواز پڑی تو آپ اس پر بہت ناراض ہُوئے اور حکم دیا: "اس اونٹنی پر جو کچھ ہے اسے لے لو اور اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ "ملعونہ" ہے۔ چنانچہ فوراً اُونٹنی کو چھوڑ دیا گیا وُہ کھلے طور پر لوگوں میں پھرتی تھی کوئی اسے نہ چھیڑتا تھا۔" (مسلم)

"حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وُہ بکری کی ٹانگ پکڑ کر زمین پر گھسیٹ رہا ہے تاکہ اسے ذبح کرے۔ آپ نے اس سے کہا "ستیاناس ہو تیرا، اسے موت کی طرف تو اچھے طریقے سے لے جا۔"

یہ تھا وُہ حسنِ سلوک اور نرم دلی کا رنگ جو اسلامی تہذیب میں اسلامی حکومت اور دُوسرے اجتماعی اداروں کی جانب سے حیوانات کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

## اسلامی حکومت کی ذمّہ داریاں:

اسلامی حکومت حیوانات کے ساتھ اچھے سلوک کو کس قدر اہمیت دیتی تھی؟ اس

کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ خلفاء وقتاً فوقتاً عوام الناس کو عمومی ہدایات جاری کرتے رہتے، جن میں کہا جاتا کہ حیوانات کو دُکھ اور تکلیف نہ دی جائے اور ان کے ساتھ نرم روی اختیار کی جائے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز اپنے ایک خط میں گورنروں کو ہدایات بھیجتے ہیں کہ وُہ لوگوں کو اس بات سے منع کرتے ہیں کہ گھوڑوں کو بیجا نہ ماریں اور نہ کچوکے لگائیں، اُنہوں نے "صاحبِ سکک" (ٹریفک اور گشتی پولیس کے مشابہ عہدہ) کو لکھا کہ وہ کسی شخص کو گھوڑے کے مُنہ میں بھاری لگام ڈالنے کی اجازت نہ دیں اور نہ ایسا کوڑا استعمال کرنے کی اجازت دیں جس کے سرے پہ لوہا لگا ہُوا ہو۔ نیز آپ کے زمانہ میں محتسب کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ وُہ لوگوں کو جانور پر حد سے زیادہ بوجھ لادنے سے منع کریں، نیز ان کو جانوروں کو بیجا سزا دینے اور اثناء سفر میں حد سے زیادہ مارنے سے بھی منع کریں۔ جو محتسب کسی کو ایسا کرتے دیکھے اس کا فرض ہے کہ وُہ اسے راہِ راست پر لائے اور سزا بھی دے۔ اس سلسلہ میں قانون یہ ہے:

> "محتسب کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وُہ انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرے۔ کیونکہ اس میں مصلحت عامہ پوشیدہ ہے۔ لوگوں کو اس بات کی اجازت ہرگز نہیں ہے کہ وُہ جانوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادیں نہ ان کو یہ اجازت ہے کہ جانور کو بہت تیز چلائیں جبکہ ان پہ بوجھ لدا ہُوا ہو۔ نہ ان کو اجازت ہے کہ وُہ جانوروں کو سخت سزا دیں نیز ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وُہ بوجھ سے لدے ہُوئے جانوروں کو عام بازاروں میں کھڑا کریں۔ یہ سب کام شریعتِ اسلامیہ کے بالکل خلاف ہیں مالکان کا فرض ہے کہ وہ مویشیوں کے چارہ کے معاملہ میں خدا کا خوف رکھیں۔ چارہ اس قدر ہونا چاہیے جس سے جانور سیر ہو جائے۔ نیز چارہ خراب اور تھوڑا نہیں ہونا چاہیے۔"

## حیوانات کی پرداخت کے لیے اوقاف :

یہ ہے حیوانات کے لیے اجتماعی ادارے، تو وُہ بھی خاص مقدار میں موجود تھے۔ اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ قدیم اوقاف کی دستاویزوں میں ہمیں ایسے اوقاف کا سراغ ملتا ہے جو بیمار حیوانوں کے علاج کے لیے مخصوص تھے۔ نیز ایسے اوقاف بھی تھے جو بوڑھے جانوروں کے چرنے کے لیے مخصوص تھے۔ انہی اوقاف میں سے دمشق کی "مرج احضر" ہے جہاں آج کل بلدیہ نے کھیلوں کا میدان قائم کیا ہے۔ یہ چراگاہ ان بوڑھے گھوڑوں کے لیے وقف تھی جن کو ان کے مالکوں نے ازکار رفتہ سمجھ کر ان کی دیکھ بھال کرنا ترک کر دیا تھا۔ یہ گھوڑے وہاں چرتے رہتے تھے یہاں تک کہ مر جاتے، دمشق کے اوقاف میں سے ایک وقف بلیوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ بلیاں وہاں کھاتی پیتی رہتی تھیں اور وہیں سو جاتیں۔ اس طرح وہاں سینکڑوں موٹی تازی بلیاں، اپنے مخصوص گھر میں جمع ہو گئی تھیں ان کو ہر روز وہاں کھانا دیا جاتا اور وُہ بھی اُچھل کُود اور سیر و تفریح کے سوا کسی اور کام کے لیے وہاں سے حرکت تک نہ کرتیں۔

یہ سب کچھ اس قوم کی رُوح کو ظاہر کر رہا ہے جس نے حیوانات پر رحم اور رحیمانہ سلوک کی وُہ مثال قائم کی ہے جس کی ہمیں پُوری انسانیت میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

## رحیمانہ برتاؤ کی عجیب و بے نظیر مثالیں :

حیوانات کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ کی ایک دلکش مثال وُہ ہے جو ایک جلیل القدر صحابی (حضرت ابُو الدرداء) نے پیش کی۔ اُنہوں نے مرتے وقت اپنے اُونٹ سے مخاطب ہو کر کہا: "اے اُونٹ قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے مجھ سے نہ جھگڑنا کیونکہ میں نے تیری طاقت سے زیادہ کبھی بھی تجھ پر بوجھ نہیں ڈالا۔" نیز ایک دُوسرے صحابی حضرت عدی بن حاتم چیونٹیوں کے لیے روٹی کا چُورا بناتے اور کہتے

"یہ ہماری پڑوسن ہیں۔ لہٰذا ہم پہ ان کا بھی حق ہے"۔۔۔۔۔۔ امام کبیر ابو اسحاق شیرازی ایک دن اپنے رفقاء کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ ان کے سامنے ایک کتا آگیا۔ اس کے مالک نے اسے دھتکارا، تو امام نے اسے فوراً ٹوکا اور کہا: "کیا تجھے علم نہیں کہ راستہ ہمارے اور کتوں کے درمیان مشترک ہے"

## ازمنۂ قدیمہ میں حیوانات کے ساتھ سلوک:

تہذیبِ اسلامی کے اس نمایاں ترین پہلو اور حیوانات کے ساتھ اس کے مشفقانہ طرزِ عمل کی ہم صحیح قدر اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ ازمنۂ قدیمہ اور قرونِ وسطیٰ میں، حیوانات کے ساتھ کیسے سلوک کیے جاتے اور یہ کہ حیوانات کی تعذیب اور ان کو دکھ پہنچانے کے معاملہ میں دوسری اقوام کا رویّہ کیا تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو چیز قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ دوسری اقوام کی تعلیمات کے اندر ہمیں سرے سے ایسی ہدایت نہیں ملتی جس میں حیوانات کے ساتھ نرم روی کا حکم دیا گیا ہو یا ان پہ رحم کرنا ضروری قرار دیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان اقوام کے ہاں حیوانات کے مالک کے ذمہ ان کا نفقہ اور ان کی دیکھ بھال سے متعلق کچھ فرائض کا پتہ نہیں ملتا۔

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ عجیب و غریب صورتِ حال آتی ہے جو قرونِ وسطیٰ، حتّٰی کہ انیسویں صدی تک جاری رہی، جس میں ایک حیوان کو اس کے اپنے جرم یا اس کے مالک کے جرم کے بدلے مستوجبِ سزا ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا جیسا کہ ایک عاقل اور صاحبِ فکر انسان کے ساتھ کیا جاتا ہے ایک حیوان کے خلاف ایسے ہی فیصلے صادر کیے جاتے تھے جیسے انسان کے خلاف ہوتے ہیں۔ اسے قید کیا جاتا تھا۔ بھگا دیا جاتا تھا، حتّٰی کہ اسے سزائے موت تک دی جاتی تھی جیسا کہ ایک مجرم انسان کو دی جاتی ہے۔

## یہودی شریعت کی بعض دفعات:

یہودی شریعت میں درجِ ذیل دفعات پائی جاتی ہیں: "اگر ایک بیل کسی مرد یا

عورت کو سینگ مارے اور وہ مر جائے تو اس صورت میں اس بیل کا رجم کرنا لازم ہے۔ اگر اس جانور کی عادت سینگ مارنے کی نہ ہو اور اتفاقاً اس نے سینگ مار دیا اور آدمی مر گیا، تو مالک کو کچھ بھی نہ کہا جائے گا۔ لیکن اگر اس کی عادت سینگ مارنے کی تھی اور لوگوں نے اسے تنبیہ بھی کر دی تھی کہ اس کا جانور سینگ مارتا ہے اور اس کے بعد بھی اس نے اس کی مناسب نگرانی نہ کی اور وہ کسی مرد یا عورت کی موت کا سبب بنا تو اس صورت میں جانور کو رجم کیا جائے گا اور مالک کو سزائے موت دی جائے گی۔

ایک دوسری صورت بھی ہے جہاں یہودی شریعت کے مطابق حیوان کو سزا دی جاتی ہے مثلاً کوئی کسی حیوان کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کرے تو اس صورت میں اس شخص اور مذکورہ حیوان دونوں کا قتل واجب ہو جاتا ہے۔

## قدیم یونان میں:

قدیم یونانیوں کے ہاں ایک خاص محکمہ تھا جس میں ایسے جرائم پیشہ حیوانات کے فیصلے ہوتے تھے، جو کسی انسان کی ہلاکت کا باعث ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ایسے جمادات کے لیے بھی فیصلے ہوتے، جن سے کوئی انسانی ہلاکت ہو جاتی۔ اس محکمے نام "بریتانیون" تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ان "مجرمین" کی بابت فیصلوں کے لیے اجلاس ہوتے تھے۔

افلاطون نے اپنی کتاب قانون میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی حیوان کسی انسان کو قتل کرتا تو مقتول کے خاندان والوں کو اس حیوان کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کرنے کا حق ہوتا تھا۔ اور مقتول کے اولیاء کو زمینداروں میں سے قاضی چننے کا اختیار ہوتا تھا۔ جرم ثابت ہونے کی صورت میں اس کا قتل واجب ہوتا تھا اور اس کے جسم کو ملک سے باہر پھینکا جاتا تھا۔ لیکن اس قانون سے وہ حیوانات مستثنیٰ تھے جن کو انسان کے مقابلے کے لیے پالا جاتا تھا اور کھیلوں اور تہواروں کے مواقع پر ان میں اور انسانوں میں مقابلہ ہوتا تھا۔ اس صورت میں اگر حیوان انسان کو قتل کر دیتا تو مجرم نہ ٹھہرایا جاتا۔ اگر کوئی جامد چیز انسان پر گر جاتی اور وہ مر جاتا تو مقتول

کے پڑوسی رشتہ داروں میں سے قریب ترین آدمی کو فیصلہ کنندہ مقرر کیا جاتا۔ وہ فیصلہ دیتا کہ اس "جماد" کو حدودِ ملک سے باہر پھینک دیا جائے۔ حیوان صرف بصورت قتل ہی ماخوذ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ قتل سے کم درجہ کے تمام جرائم پر بھی ماخوذ تھا۔ مثلاً اگر ایک کتا انسان کو کاٹ لے تو اس کے مالک پر فرض ہوتا تھا کہ وہ اسے ایک مجرم کی طرح رسیوں میں جکڑ کر لائے اور کاٹے ہوئے آدمی کے سامنے پیش کرے اور اسے اختیار کامل ہوتا تھا کہ جس طرح چاہے بدلہ لے خواہ اسے قتل کرے، سزا دے یا کوئی اور سلوک کرے۔

اسی طرح بعض اوقات ایک حیوان کو بھی اس کے مالک کے خاندان کے کسی فرد کے جرم کی بنا پر سزا دی جاتی تھی۔ مثلاً جو آدمی مذہب یا حکومت کے خلاف کوئی سخت جرم کا مرتکب ہو جاتا اور اسے سزائے موت دی جاتی تو اس کے حیوانات جائداد اور غلاموں کو بھی قتل کرنے، جلانے اور ملک بدر کر دینے کی سزائیں دی جاتیں۔

## قدیم رومیوں کا قانون:

قدیم رومیوں کے قانون میں یہ دفعہ موجود تھی کہ اگر کسی کاشت کار کا بیل، کاشت کے دوران کھیتوں کے اندر زیرِ کاشت حصہ اور اس کے متصل، اس کے پڑوسی کے کھیت کی درمیانی حد سے گذر جاتا تو اسے اور اس کے مالک دونوں کو سزائے موت دی جاتی۔ وہ کتا جو کسی انسان کو کاٹ لیتا تھا اس کے لیے کم ترین سزا یہ تھی کہ اسے اس انسان کے حوالے کر دیا جاتا، وہ اس کے ساتھ جو چاہتا کرتا۔ اسی طرح اگر کوئی حیوان، اپنے مالک کے سوا، کسی اور کی مملوکہ جھاڑی چر لیتا تو اسے بھی اس مالک شخص کے حوالے کر دیا جاتا۔

قدیم جرمنوں کے ہاں بھی حیوانات کے متعلق ایسے ہی قوانین جاری تھے جو رومیوں اور یونانیوں کے ہاں تھے۔

## قدیم فارس میں :

اور قدیم فارسیوں کے ہاں معاملہ اس سے بھی انوکھا اور عجیب تر تھا۔ اگر باؤلا کُتا کسی بکری کے بچّے کو کاٹ لیتا اور وُہ مر جاتا یا کسی انسان کو کاٹ لیتا اور وُہ زخمی ہو جاتا تو اس کُتّے کا دایاں کان کاٹ لیا جاتا، اگر وُہ دوبارہ ایسا کرتا تو اس کا بایاں کان کاٹ لیا جاتا۔ تیسری دفعہ ایسا فعل کرنے سے اس کا دایاں پاؤں اور چوتھی دفعہ کے ارتکاب سے اس کا بایاں پاؤں کاٹا جاتا اور اگر وُہ پانچویں دفعہ ایسی حرکت کرتا تو اس کی دُم کو جڑ سے نکال دیا جاتا۔

## یورپین اقوام کے تخیّلات :

ازمنۂ وسطیٰ میں، یورپین اقوام میں سے فرانس پہلا ملک ہے، جس نے تیرھویں صدی میں حیوان کو بھی اپنے کیے کا جوابدہ قرار دیا۔ اور اس پر منظّم عدالتوں میں اس طرح مقدمہ چلایا جاتا جس طرح ایک انسان پر چلایا جاتا ہے، اور یہ مقدمہ اسی قانون کے تحت قائم ہوتا جس کے تحت انسانوں پر مقدمات چلائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد چودھویں صدی کے آخر میں سردینیا نے بھی اپنے ہاں یہ قانون رائج کر دیا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں بلجیم نے یہ قانون اپنے ہاں نافذ کیا، سولھویں صدی کے نصف میں ہالینڈ، جرمنی، اٹلی اور سویڈن نے بھی یہی قانون اپنے ہاں جاری کیا۔ صقلیہ کی بعض اقوام کے ہاں تو انیسویں صدی تک یہی قانون چلتا رہا۔

حیوانات پر مقدمہ یا تو اس شخص کی درخواست پر قائم کیا جاتا تھا جس کے ساتھ زیادتی ہُوئی ہوتی تھی یا خود حکومت یہ مقدمات قائم کرتی تھی۔ پھر مجرم حیوان کی جانب سے وکیل پیش ہوتے جو اس کی طرف سے دفاع کرتے۔ بعض اوقات عدالت بطورِ احتیاط حیوان کو حوالات بھیج دیتی۔ اس کے بعد حکم صادر ہوتا اور وُہ تمام لوگوں کی موجودگی میں نافذ کیا جاتا جیسا کہ انسانوں پر نافذ ہوتا ہے بعض اوقات

حیوان کو سنگسار کر کے مار ڈالنے کی غرض سے سزا دی جاتی یا سر کاٹ دیا جاتا اور یا جلا دیا جاتا۔ یا قتل سے پہلے اس کے بعض اعضا کاٹے جاتے تھے۔ قارئین یہ نہ سمجھیں کہ یہ مقدمات محض بطور تفریح یا صرف تسلی کے لیے قائم کیے جاتے تھے بلکہ یہ پوری سنجیدگی سے قائم کیے جاتے تھے۔ کیونکہ فیصلے اور قانونی احکام کی ورڈنگ بتا رہی ہے کہ وہ اس معاملہ میں سنجیدہ تھے، فیصلے کا مثلاً یہ جملہ کہ "حیوان کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں" یا "اسے سولی پر چڑھایا جاتا ہے اس لیے کہ اس نے نہایت وحشیانہ اور قبیح قسم کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔"

## بعض کوائف:

اس سلسلہ کی عجیب ترین روایات وہ ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ حیوانات کے خلاف اس جرم میں بھی مقدمات اس لیے چلاتے تھے کہ ان حیوانوں نے ان کے خیالات کے مطابق "قانونِ فطرت" اور "اصولِ طبیعیہ" کے اندر خلل اندازی کی ہے۔ یہ لوگ حیوانات پر جادوگری کا الزام بھی لگاتے تھے۔ ان کے ہاں جادو ایسا جرم تھا جس کے مرتکب کو جلانے کی سزا دی جاتی تھی۔ حیوانات کو سزا دیتے وقت بڑی بڑی تقریبیں منعقد کرتے تھے۔ جلاد لکڑیوں کے ٹکڑے لے کر آتے تھے اور ان کو میدان کے درمیان رکھا جاتا تھا۔ ان بلیوں کو حاضر کیا جاتا تھا جن کے خلاف فیصلے ہوئے ہوتے تھے۔ ایک بلی لوہے کے پنجرے میں ہوتی تھی۔ جب سزا نافذ کرنے کا وقت آ جاتا تھا تو بعض راہب آتے تھے اور ان کے ساتھ بعض حکام بھی ہوتے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں دو شعلے ہوتے تاکہ لکڑیوں کو آگ لگائی جا سکے۔ اس کے بعد حکام آرڈر دیتے تھے کہ بلیوں کو آگ میں پھینکا جائے تاکہ وہ راکھ بن جائیں کیونکہ انہوں نے جادوگری جیسے بُرے فعل کا ارتکاب کیا ہے۔

## چند مقدمات کی رودادیں:

اب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قارئین کے سامنے قرونِ وسطیٰ کے بعض

ان مشہور مقدمات کی روئیداد پیش کی جائے، جو حیوانات کے خلاف قائم کیے گئے۔ ان میں سے مشہور مقدمہ فرانس کے شہر اوٹون میں چوہوں کے خلاف قائم کیا گیا۔ یہ پندرہویں صدی کا واقعہ ہے۔ چوہوں پر الزام لگایا گیا کہ وہ بڑی کثرت سے، خوفناک شکل میں گلی کوچوں میں جمع ہو جاتے ہیں، جس سے لوگوں کے آرام و سکون میں خلل اندازی ہوتی ہے۔ ان کے دفاع کے لیے، فرانس کا مشہور وکیل شاسانیہ میدان میں آیا۔ اس نے عدالت سے مہلت مانگی کیونکہ چوہے اس وقت عدالت میں حاضر نہ ہو سکے تھے۔ کیونکہ ان میں سے بچے، بوڑھے اور بیمار تھے اور اگر ان کو عدالت میں حاضر ہونے کے لیے مہلت دی جائے تو وہ حاضر ہو سکتے ہیں، اس لیے عدالت نے ایک معین وقت تک مہلت دے دی۔ لیکن جب وقت آیا تو چوہے عدالت میں حاضر نہ ہوئے۔ اس پر صفائی کے وکیل نے کہا کہ چوہے اگرچہ معزز عدالت کے احکام کی تعمیل کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر وہ یہاں آئیں تو، انہیں بلیوں کی جانب سے ایذا رسانی کا خوف ہے۔ لہٰذا چیف جسٹس نے کہا کہ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ملزموں کو امن و سلامتی سے عدالت میں حاضر ہونے کے مواقع فراہم کریں اور وکیل صفائی نے درخواست کی کہ عدالت حکم دے کہ جب چوہے عدالت میں حاضری کے لیے آ رہے ہوں تو تمام بلیوں کو بند کر دیا جائے تاکہ ان کو جان کا کوئی خطرہ نہ رہے چنانچہ عدالت نے درخواست منظور کر لی۔ اس طرح حکم دیا گیا کہ تمام بلیاں اور کتے عام سڑکوں پر نہ چلیں تاکہ چوہوں کو عدالت میں حاضر ہوتے وقت کوئی ڈر نہ رہے لیکن شہریوں نے ان احکام کی تعمیل نہ کی (یعنی وہ بلیوں اور کتوں کو سڑکوں سے نہ ہٹا سکے) لہٰذا عدالت نے فیصلہ دیا کہ چوہوں کو بری کیا جاتا ہے کیونکہ ہر کس کو قانوناً اپنی صفائی پیش کرنے کی سہولتیں حاصل ہونی چاہییں۔ چونکہ چوہے اس سہولت سے محروم ہیں لہٰذا وہ بری الذمہ ہیں اس وکیل کو، مقدمہ کی اس انوکھی پیروی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل ہوئی، البتہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے چوہوں سے اپنی ان کوششوں کی فیس بھی حاصل کی یا نہیں؟ ممکن ہے کہ اس کے بعد چوہوں نے اس کی کتابوں اور دوسرے کاغذات کو کترنا بند کر دیا ہو۔

اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب مقدمہ انڈا دینے والے مرغ کا ہے یہ مقدمہ بھی ازمنہ وسطیٰ کا عجیب و غریب واقعہ ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں ۱۴۷۴ء میں یہ مقدمہ پیش ہوا۔ الزام یہ تھا کہ مرغے نے انڈا دے دیا ہے اور یہ اس لیے جرم تھا کہ ان کے خیال میں جادوگر مرغے کے انڈے کی تلاش میں رہتے تھے، جسے وہ اپنی شیطانی اغراض کی خاطر، جادوگری کے کام میں استعمال کرتے تھے۔ مرغا عدالت میں پیش کیا گیا[1]۔ صفائی کے وکیل نے کہا کہ مرغا اس معاملہ میں مجبور تھا۔ اس کے بس میں ایسے وسائل نہ تھے جس سے وہ اس برے فعل سے بچ سکتا۔ لیکن عدالت نے اس صفائی کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور مرغے کو سزائے موت دے دی۔ اور فیصلہ میں لکھا کہ اس سزا کو دوسرے مرغوں کے لیے نمونۂ عبرت ہونا چاہیے۔

حیوانات کے عجیب مقدمات میں سے ایک مقدمہ، ۱۴۹۴ء میں، فرانس میں وقوع پذیر ہوا۔ صوبہ سان جولیاں میں، انگوروں کے باغبانوں نے کیڑوں مکوڑوں کے خلاف مقدمہ دائر کیا کہ انہوں نے انگوروں کے پھل اور شاخوں کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ اور اس سے ان کی صنعت و تجارت کو بے حد نقصان پہنچا ہے۔ اس مقدمہ میں دو ماہرین قانون نے بطور وکیل صفائی کام کیا۔ یہ مقدمہ تقریباً چالیس سال تک چلتا رہا۔ فیصلہ کی غیر معمولی تاخیر سے مدعیان چونکہ بے حد تنگ آ گئے تھے، اس لیے انہوں نے اس فیصلے سے اتفاق کیا کہ کیڑوں مکوڑوں کے لیے ایک خاص قطعۂ زمین مختص کر دیا جائے جہاں وہ جو چاہیں کریں اور جو درخت اور فصل چاہیں کھائیں[2]۔

---

[1] آپ حیرت و تعجب نہ کریں کہ مرغ نے انڈا کس طرح دیا، کیونکہ جب ہمارے یہاں بھینس کا انڈا ہو سکتا ہے تو سوئٹزرلینڈ میں مرغ انڈا کیوں نہیں دے سکتا۔ بات کچھ نہیں ہے، کسی جادوگر صاحب کے جادو کے لیے مرغ کا انڈا ضروری ہوگا، تاکہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی، ادھر یاروں نے اڑا دیا کہ فلاں مرغ نے انڈا دیا ہے، انڈا دیتے ہوئے کسی نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو غریب مرغ پھنس گیا۔

## حرفِ آخر:

مَیں نے آپ کے سامنے حیوانوں کے متعلق تہذیبِ اسلامی اور دوسری اقوام کی تہذیبوں کے نقطہائے نظر کے درمیان لطیف موازنے پیش کیے ہیں ان سے معلوم ہوجاتا ہے کہ امتِ مسلمہ قدیم امم اور جدید اقوام کے مقابلے میں دو باتوں میں ممتاز ہے جن کی ان کے ہاں کوئی نظیر نہیں پائی جاتی۔

✓ اوّل یہ کہ سب سے پہلے اجتماعی ادارے قائم کر کے مسلمانوں نے حیوانات کی کمزوری، بڑھاپے اور مرض کے وقت دیکھ بھال کا بندوبست کیا اور ان اداروں کے ذریعہ ان کی معیشت کا خاطر خواہ انتظام کیا۔

✓ دوئم یہ کہ آج سے قریباً چودہ سو سال پہلے اسلام نے حیوانات سے جرائم کی جوابدہی موقوف کردی۔ جس کا دعویٰ تہذیبِ جدید آج کر رہی ہے۔ اسی لیے ہماری تہذیب وتمدن کی تاریخ حیوانات کے مقدمات سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی تہذیب نے حیوانات کو باہمی لڑانے کے ظالمانہ کھیل کو بھی موقوف کردیا۔ حالانکہ یونانیوں اور رومیوں کے ہاں یہ قانوناً جائز تھا اور ہسپانیہ میں تو آج بھی یہ قانوناً جائز اور مرغوب فعل ہے، جہاں بڑی بڑی تقریبات منعقد ہوتی ہیں، جن میں بیلوں کا باہمی مقابلہ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مغربی اقوام کے پرانے اور قرونِ وسطیٰ کے وحشی پنے کا نمونہ باقی رہ گیا ہے اور اس سے ہماری تہذیب پاک وصاف رہی ہے۔

# آٹھواں باب

# رفاہِ عامہ کے ادارے

# رفاہِ عامہ کے ادارے

کسی قوم کے زندہ قوم کہلانے اور ارتقائی مراحل پر اس کے رواں دواں ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ سمجھی جاتی ہے، کہ اس کے افراد کے قلوب انسان دوستی کے بلند ترین جذبات سے معمور ہیں اور اس کے یہی جذبات اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی قوی ترین دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ قوم عالمی قیادت کی مستحق ہے۔

ایسے جذبات جو نہ صرف یہ کہ معاشرے پر خیر و برکت اور رحمت کی بارش کر دیں بلکہ تمام انسان اور حیوان، جو اس کرۂ ارض پر زندگی گذار رہے ہیں، ان سے فیض یاب ہوں، اسی معیار کے مطابق اقوام کی تہذیبیں زندگی و دوام پاتی ہیں اور ان کی تہذیبوں اور تمدنوں کے درمیان برتری کا فیصلہ بھی انہی آثار کے مطابق ہوتا ہے جو وہ اس میدان میں چھوڑتی ہیں۔

## یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا:

اُمتِ مسلمہ اس میدان میں اس بلندی تک جا پہنچی جہاں تک اس سے پہلی اقوام

میں سے علی الاطلاق کوئی نہ پہنچ سکا اور نہ اس کے بعد آج تک کوئی قوم پہنچ سکی ہے۔ پہلی اقوام اور تہذیبوں کے ہاں نیکی کا میدان عبادت گاہوں اور مدارس کے محدود دائرے تک ہی محدود تھا۔ رہا موجودہ دور تو بیشک اس میں مغربی اقوام، اجتماعی اداروں کے ذریعہ اجتماعی ضروریات پوری کرنے کے معاملے میں، بلندیوں تک جا پہنچی ہیں، لیکن وہ خالص رضائے الٰہی کی خاطر، انسانی ہمدردی کے اس اونچے مقام تک نہیں پہنچ سکیں، جس تک اپنے دورِ عروج اور شوکت میں اُمتِ مسلمہ جا پہنچی تھی۔ بلکہ مغربی اقوام تو انسانی ہمدردی کا وہ مقام بھی حاصل نہیں کر سکی ہیں، جو اپنے دورِ اضمحلال و انحطاط میں امتِ مسلمہ کو حاصل تھا۔ مغربی اقوام کے کارہائے خیر کے پیچھے ہمیشہ طلبِ جاہ، شہرت، پروپیگنڈا اور نام و نمود کے جذبات کام کرتے رہے ہیں جنہوں نے انہیں انسانی رفاہِ عامہ کے مختلف کاموں کی طرف مائل کیا، لیکن اُمتِ مسلمہ کے پیشِ نظر بھلائی اور خیر کے تمام کاموں میں صرف ایک ہی مقصد رہا ہے۔ یعنی حصولِ رضائے الٰہی۔ خواہ یہ بھلائی کا کام لوگوں کے علم میں آئے یا نہ آئے۔ اس بارے میں صلاح الدین ایوبی کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے، جس نے اپنی تمام دولت کو رفاہِ عامہ کے کاموں میں خرچ کر دیا اور موجودہ مصر اور شام کے علاقوں کو رفاہِ عامہ کے اداروں، مساجد، مدارس اور سراؤں وغیرہ سے بھر دیا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے نام سے موسوم نہ کیا، وہ ایسے اداروں کو اپنے فوجی افسروں، وزیروں، مددگاروں اور دوستوں کے نام سے موسوم کرتا تھا۔ کارہائے خیر کے سلسلے میں خالص رضائے الٰہی کا یہ وہ اونچا معیار ہے جس میں حظِ نفس کا شائبہ تک نہیں ہے۔

## ایک اور مابہ الامتیاز پہلو:

ایک دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ مغربی ممالک میں قائم ہونے والے اداروں سے استفادہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اسی ملک کے باشندے یا شہری ہوں یا اس علاقے میں رہتے ہوں لیکن مسلمانوں نے جو ادارے قائم کیے تھے ان کے دروازے

ہر ایک کے لیے کھلے تھے قطع نظر اس سے کہ اس کی قومیت کیا ہے، اس کی زبان کیا ہے یا اس کا مذہب کیا ہے؟ نیز یہ کہ ہم نے اجتماعی ادارے بھلائی اور اجتماعی کفالت کے ان وجوہ و اسباب کے پیشِ نظر قائم کیے جن سے آج بھی مغربی اقوام واقف نہیں ہیں۔ اور یہ اسباب ہیں بھی ایسے جنہیں سُن کر آج بھی انسان حیران رہ جاتا ہے اور ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے ہاں انسان دوستی کا تصوّر دوسری اقوام کے مقابلے میں زیادہ وسیع، زیادہ صاف، اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔

## رفاہِ عامہ سے متعلق اسلامی تہذیب کے بنیادی تصوّرات :

اس سے پہلے کہ ہم رفاہِ عامہ کے مختلف اور متنوع اقسام سے بحث کریں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رفاہِ عامہ کے بارے میں اسلامی تہذیب کے بنیادی تصوّرات اور اصولوں کی وضاحت کر دی جائے، در اصل یہی افکار اور اصول تھے جنھوں نے اُمتِ مسلمہ کے نفوس پر حیرت انگیز اثرات ڈالے اور اس کے نتیجے میں ہر ادارے عالمِ وجود میں آئے جن کی کوئی مثال تاریخِ انسانیت میں نہیں ملتی۔

اسلام خیر کی طرف اس طرح دعوت دیتا ہے، کہ انسانی نفس میں بخل، تنگ دلی اور فقر و مسکنت کے خوف جیسے شیطانی وسوسوں کا گذر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انفاق فی سبیل اللہ پر برانگیختہ کرنے کے بعد قرآن مجید کہتا ہے :

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ (بقرہ : ۲۶۸)

"شیطان تمھیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے اور خدا تم سے اپنی بخشش اور رحمت کا وعدہ کرتا ہے اور خدا بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اسلام ہر مستطیع اور قدرت رکھنے والے ہر شخص، بلکہ ہر انسان کو خیر کی دعوت دیتا ہے، خواہ وہ فقیر ہو یا غنی، غنی تو بھلائی کا کام اپنی دولت اور اپنے مرتبے کے ذریعہ

کرے گا، رہا فقیر تو اسے چاہیے کہ وہ یہ کام اپنے ہاتھ، اپنے دل اور اپنی زبان سے کرے۔ اسلام میں ایسا کوئی انسان نہیں پایا جاتا جو کسی نہ کسی طریقے سے بھلائی کا کام نہ کر سکتا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض فقرا نے آپ سے شکایت کی کہ مال دار لوگ نیکی کے میدان میں ان سے آگے بڑھ گئے ہیں کیونکہ وہ اپنی دولت کو رفاہِ عامہ اور نیکی کے کاموں میں خرچ کر رہے ہیں اور نفقدار کے پاس کوئی چیز نہیں ہے جو وہ صدقہ میں دیں۔ ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی وضاحت کی کہ نیکی کے کام کا ذریعہ صرف مال ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ کام بھلائی کا کام اور صدقہ ہے، جس سے انسانوں کو فائدہ پہنچے آپ نے فرمایا: "تم جو ایک دفعہ اللہ کی تسبیح کرتے ہو یہ بھی صدقہ ہے، کسی کو بھلائی کا حکم دینا بھی صدقہ ہے، برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے، راستے سے کانٹے وغیرہ اذیت پہنچانے والی چیز کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، دو آدمیوں کے درمیان باہمی صلح کرا دینا بھی صدقہ ہے اور اگر تم کسی شخص کو اس کی سواری پر چڑھانے میں مدد دو، تاکہ وہ سہولت سے چڑھ جائے تو یہ بھی صدقہ ہے[۱]۔"

اس طرح اسلام خیر کے دروازے تمام لوگوں کے لیے کھول دیتا ہے اور ایک عام مزدور، تاجر، زمیندار، شاگرد، استاد، عورت، عاجز، بوڑھا، اندھا اور ناتواں بھی نیکی کا کام کر سکتا ہے اور اس کے اقتصادی حالات معاشرہ میں نیکی اور بھلائی کے کام کرنے کے سلسلے میں اس کے لیے سنگِ راہ نہیں بنتے۔ اس سے بھی آگے اسلام نفسِ انسانی کو انسان دوستی کے اس اونچے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں سے خیر و نیکی کے فیوض تمام انسانی برادری کے لیے عام ہو جاتے ہیں اگرچہ ان کا مذہب، ان کی زبان، ان کا ملک اور ان کی قومیت ایک دوسرے سے مختلف ہو۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں: "الخلق عیال اللہ فاحبھم الیہ انفعھم

---

[۱]: روایت بخاری و مسلم۔

لعیالہ" (لوگ اللہ کے عیال ہیں۔ اللہ کے نزدیک محبوب وہ ہے جو اس کے عیال کے لیے زیادہ سے زیادہ نفع رساں ہو) اس کے بعد اسلام نفسِ انسانی کو نیکی اور بھلائی کی طرف مائل کرتے ہوئے یوں خطاب کرتا ہے کہ نیکی اور بھلائی کے کام سے اس کا ذاتی فائدہ ہے اور یہ کہ جو انسان نیکی کا کوئی کام کرے گا اس کا فائدہ سب سے پہلے خود اس کی ذات کو پہنچے گا۔ دنیا میں محبوبیت حاصل ہوگی، اس کی تعریف کی جائے گی اور اس کا ہمیشہ ذکر کیا جائے گا اور آخرت میں ثواب اور جزائے خیر ملے گی: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (تم جو چیز بھی خرچ کروگے وہ تمہارے نفس ہی کے لیے ہے) من عمل صالحا فلنفسه (جو بھی نیکی کا کام کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے کرتا ہے)۔

## اس تعلیم کا نتیجہ اور اثر:

انسان میں جب تک انفرادیت کا جذبہ ہے وہ سب سے پہلے خود اپنی ذات کے لیے بھلائی سوچتا ہے، اس طرزِ فکر کا نفسِ انسانی پر خاص اثر ہوا، بخیل سخی بن گیا اور کنجوس نے داد و دہش شروع کر دی، اور اپنی دولت کو لوگوں پر خرچ کرنے لگا، حالانکہ اولاد اور اقربا کا خیال دامن گیر ہو سکتا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ اَضْعَافًا (بقرہ: ۲۴۵)

"کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے، تاکہ اللہ کئی گنا کر دے"

تو ایک صحابی، جن کا نام "ابو دحداح" تھا کہنے لگے: "رسول اللہؐ! کیا اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں سے قرض مانگتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں" انہوں نے حضورؐ سے کہا کہ آپ اپنے ہاتھ بڑھائیں اور گواہی دیں کہ میں نے اپنا فلاں باغ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا جس کا میں مالک ہوں اور میرے ساتھ اس میں کوئی شریک نہیں ہے۔ یاد رہے کہ اس باغ میں کھجوروں کے سات سو پھلدار درخت تھے۔ اس کے بعد یہ صحابی اپنے گھر گئے۔ ان کی بیوی اور بچے اس باغ میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو اپنے

اقدام سے مطلع کیا، چنانچہ وُہ ان کی اہلیہ اور ان کی اولاد) وُہ باغ خالی کرنے لگے اور اللہ کی وُہ بندی کہتی جاتی:" ابوالدحداح! آپ کا یہ سودا آپ کے لیے بہت سُود مند رہا۔"

## اسلام میں پہلا وقف :

جب آیت "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" نازل ہوئی تو ابو طلحہؓ انصاری نے کہا "حضورؐ بیرحا"[۱] میری تمام جائداد میں سے مجھے محبوب ہے۔ میں اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اللہ سے اس کے اجر کا طلب گار ہوں، آپ جس طرح چاہیں اس میں تصرّف کریں۔" حضورؐ نے فرمایا؟ "ہنس نہیں یہ نفع بخش مال ہے، یہ نفع بخش مال ہے۔ اصل (باغ) اپنی نگرانی و تولیت میں رکھو اور پیداوار صدقہ کرو۔" یہ صدقہ اسلام میں پہلا وقف تھا۔ اور پھر اس کے بعد وقف کا سِلسلہ چل پڑا اور وقف دراصل وُہ بڑا ذریعہ ثابت ہوا جس سے اجتماعی ادارے مالی امداد حاصل کر کے اپنے اغراض و مقاصد کو بحسن وخوبی سرانجام دیتے رہے بلکہ وقف نے ہماری تہذیب کی تاریخ میں سنگِ میل کا کام دیا جس پر تمام اجتماعی اور رفاہِ عامہ کے ادارے قائم ہوئے۔

## وقف کی بہتات :

اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کے لیے اعلیٰ مثال قائم کی۔ آپؐ نے باغ وقف فرمائے جن کے بارے میں کسی یہودی نے یہ وصیّت کی تھی کہ ان کا اختیار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ آپ جس طرح چاہیں ان میں تصرّف کریں۔ آپؐ نے انہیں فقراء، مساکین، صاحبِ ضرورت غازیوں اور دُوسرے محتاجوں کے لیے وقف کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی خیبر والی زمین وقف کی۔ اور دُوسرے

---

[۱] : یہ نہایت شیریں اور لطیف پانی کا ایک کنواں تھا جو ان کے ایک گھنے باغ میں تھا اور پورا باغ اسی نام سے مشہور تھا۔

صحابہ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاذؓ وغیرہ نے اپنی جائدادیں وقف کیں یہاں تک کہ تمام صحابہ کرام نے کچھ نہ کچھ ضرور وقف کیا۔ یہ کام حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں نئے سرے سے پھر شروع ہوا۔ جب انھوں نے اپنی ایک زمین کو اللہ کی راہ میں وقف کیا۔ اس موقع پر آپ نے مہاجرین اور انصار کے چیدہ چیدہ افراد کو بلایا اور انہیں اس پر گواہ ٹھہرایا۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں: "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے جس شخص کو بھی میں جانتا ہوں اس نے اپنی جائداد میں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور اللہ کے راستے میں صدقہ کی ہے۔ جسے نہ خریدا جا سکتا ہے، نہ بخشا جا سکتا ہے اور نہ وہ وراثت میں منتقل ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد نسلاً بعد نسلٍ مسلمانوں نے وقف کے سلسلے کو جاری رکھا اور وہ اراضی، باغات، مکانات اور غلے کی پیداوار کو رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کرتے رہے، جن کی اسلامی معاشرہ کو ضرورت ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں اس قدر زیادہ ادارے قائم ہوئے جو حدِ اسباب سے باہر ہیں۔"

## دو قسم کے وقف:

یہ ادارے دو قسم کے ہوا کرتے تھے۔ بعض تو ایسے تھے جنہیں حکومت قائم کرتی تھی، اور ان کی مالیات کے لیے وسیع اوقاف قائم کرتی تھی اور دوسری قسم وہ ہے جنہیں اُمرا، فوجی سپہ سالار، اغنیا اور اُمت کے دوسرے صاحبِ ثروت افراد قائم کرتے تھے۔

## رفاہِ عامہ کے چند ادارے:

ہمارے لیے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہم رفاہِ عامہ کے اداروں کی تمام اقسام کا ذکر یہاں کر سکیں البتہ درجِ ذیل اہم چیزوں کا ذکر کافی ہے:

۱۔ رفاہِ عامہ کے اداروں میں سے پہلا ادارہ مسجد ہے۔ لوگ حصولِ رضائے الٰہی کے لیے مساجد کے قیام کی خاطر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش

یہاں تک کہ سلاطین بھی اس سلسلے میں اپنی تعمیر شدہ مساجد کی وسعت اور عظمت میں ایک دُوسرے کا مقابلہ کرتے تھے۔ ولید بن عبدالملک نے دمشق کی جامع اموی پر جس قدر رقم صرف کی، اور انسانوں کی جتنی بڑی تعداد نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا عقل اس کی تصدیق کرنے سے قاصر ہے۔

۲ - اس کے بعد رفاہِ عامہ کے اداروں میں اہم ترین ادارے مدارس اور شفاخانے تھے، جن پر ہم انشاء اللہ آگے کسی موقعہ پر مستقل طور سے گفتگو کریں گے۔

۳ - مسافروں کے لیے، جو قافلے سے بچھڑ گئے ہوں، سرائے اور طعام گاہ بنانا جن میں یہ لوگ اور دوسرے حاجت مند رہ سکیں۔

۴ - تکیے اور زاویے۔ جہاں بہت سے لوگ آبادی کے ہنگاموں سے الگ تھلگ عبادتِ الٰہی میں مشغول رہا کرتے۔

۵ - ایسے فقراء اور مساکین کے لیے مکانات تعمیر کرا دینا، جو اپنے لیے گھر تعمیر نہیں کر سکتے یا کرایہ پر نہیں لے سکتے۔

۶ - راستوں میں، عام لوگوں کو پانی پلانے کے لیے سبیلیں لگانا۔

۷ - بے روزگاروں کے لیے طعام گاہیں بنانا جن سے روٹی، گوشت اور شوربا اور حلوہ تقسیم ہوتا ہو۔ دمشق میں، تکیہ سلطان سلیم اور تکیہ شیخ محی الدین کی طعام گاہوں کے نمونے ہمارے زمانے تک موجود رہے ہیں۔

۸ - مکّہ مکرمہ میں حاجیوں کے لیے مکانات تعمیر کرنا جن میں وہ آکر اُتریں۔ یہ مکانات اس کثرت سے تعمیر ہوئے تھے کہ مکّہ کی پُوری سرزمین پر پھیل گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فقہا نے مکّہ کے مکانات کو کرایہ پر دینے کے عدمِ جواز کا فتوی دے دیا کیونکہ ان کے نزدیک یہ سب مکانات اصلاً حاجیوں کے لیے وقف ہیں۔

۹ - گھاٹیوں میں کنوئیں کھودنا تاکہ مویشیوں، زراعت اور مسافروں کے کام آسکیں۔ یہ کنوئیں بغداد اور مکّہ کے درمیان تھے نیز دمشق اور مدینہ کے درمیان نہایت کثرت سے تھے۔ ان کے علاوہ اسلامی سلطنتوں کے صدر مقامات اور دُوسرے شہروں

اور درگاہوں کے درمیان بھی، یہ اس کثرت سے تھے کہ ان دنوں کسی مسافر کے لیے حالتِ سفر میں تشنگی سے دوچار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

۱۰۔ سرحدوں پر محافظوں کے لیے چوکیاں تعمیر کرنا، تاکہ کوئی اجنبی دشمن سرحدی آبادیوں پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ اس قسم کے کئی ایسے ادارے تھے جو ان سرحدی محافظین کے لیے مخصوص تھے، ان اداروں میں یہ سرحدی محافظ پوری فارغ البالی کے ساتھ رہا کرتے اور تمام ضروریاتِ زندگی بسہولت پاتے تھے۔ مثلاً کھانا، کپڑا، اسلحہ کا ذخیرہ اور دوسری ضروریاتِ زندگی۔ ایسے اداروں کے قیام کا اثر یہ ہوا کہ عیسائیوں کے دور میں سرحدوں پر رومیوں کی جھڑپیں بالکل ختم ہو گئیں، اسی طرح شام اور مصر پر مغربی ممالک کے صلیبی حملوں کا سدِّباب ہوا۔

۱۱۔ اس کے بعد گھوڑوں، تلواروں، نیزوں اور دوسرے آلاتِ جنگ کے اوقاف کا نمبر آتا ہے جن سے مجاہدین کو یہ چیزیں فراہم ہوتی تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ اسلامی ممالک میں جنگی صنعت کو بہت بڑی ترقی نصیب ہو گئی تھی۔ اور ہمارے شہروں میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے۔ مغربی ممالک کے صلیبی جنگجو بھی صلح کے ایام میں ہمارے ملک میں پھیل جاتے اور یہاں سے اسلحہ خریدتے تھے۔ اسی لیے ہمارے علماء کو یہ فتوٰی دینا پڑتا تھا کہ دشمن کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا ممنوع ہے۔

یہاں ہمیں ذرا رُک کر یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اس دور میں صورتِ حال نے کس طرح پلٹا کھایا ہے۔ اب ہم مغربی ممالک سے اسلحہ کی بھیک مانگ رہے ہیں اور وہ ہمیں یہ اسلحہ ایسی شرائط کے تحت دیتے ہیں جو ہماری خودداری اور آزادی کے سراسر خلاف ہے۔

۱۲۔ کچھ اوقاف ایسے بھی تھے جن کی آمدنی جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلنے کا ارادہ کرنے والوں اور ان فوجی افراد کے لیے مخصوص تھی جو برسرِپیکار ہوتے تھے اور حکومت ان سب کے اخراجات سے قاصر تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو شخص

بھی اللہ کی راہ میں فریضۂ جہاد ادا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا بے فکر ہو کر نکلتا اور اسے جہاد کی ضروریات بہ سہولت میسر آ جاتی تھیں۔ اور اسی طرح وہ اس دُنیا کے مقابلے میں اس جنّت کا حق دار ہو جاتا تھا جس کی وسعتیں زمین و آسمان سے زیادہ ہیں۔ لیکن اب ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہم ہفتۂ اسلحہ منا رہے ہیں اور اس میں چندے جمع کر رہے ہیں تاکہ اس سے فوج کو مسلّح کیا جا سکے، اگر ہمارے اندر اجتماعی فہم و بصیرت اور سچا ایمان ہوتا تو ہم ایک ہفتہ نہیں بلکہ ہر دن اپنے اموال میں سے کچھ نہ کچھ اس غرض کے لیے نکالتے اور فوج کے لیے جنگی سامان فراہم کرنے کے لیے بڑے بڑے کارخانے قائم کرتے تاکہ ہماری فوج ملک کے دفاع کے لیے قوی ترین فوجوں میں شمار ہو سکے اور حملہ آوروں کے دفاع اور ملک کی حفاظت میں سینہ سپر ہو سکے۔

۱۳۔ ایسے اوقاف کی آمدنی، راستوں، پُلوں، گذرگاہوں کی حفاظت اور تعمیر و مرمّت کے لیے وقف ہوتی تھی۔

۱۴۔ کچھ اوقاف مقبروں کے لیے ہوتے تھے۔ اور لوگ اپنی وسیع زمین کو قبرستان کے لیے وقف کرتے۔

۱۵۔ فقراء کی تجہیز و تکفین کے اخراجات کے لیے وقف ہوتے۔

۱۶۔ اجتماعی کفالت کے ادارے تو تھے ہی بیحد و حساب۔ مزید برآں لاوارث بچوں یتیموں اور ان کے ختنوں اور حفاظت کے لیے بھی اوقاف مخصوص تھے۔

۱۷۔ ناکارہ، اندھوں اور عاجزوں کی نگہداشت کے لیے ادارے جن میں ان کی تمام ضروریات فراہم کی گئی ہوئی تھیں مثلاً خوراک، لباس اور اقامت گاہ اور تعلیم کا بندوبست، اور وہ باعزّت طریقے سے زندگی بسر کرتے۔

۱۸۔ قیدیوں کی حالت بہتر بنانے، ان کی زندگی کی سطح بلند کرنے، ان کے لیے غذا فراہم کرنے اور ان کی صحت کی حفاظت کرنے کے لیے اداروں کا قیام۔

۱۹۔ ایسے اداروں کا قیام جن کی آمدنی ان لوگوں پر خرچ ہو جو اندھوں اور اپاہجوں

کی خدمت کرتے ۔

۲۰۔ ایسے نوجوان لڑکوں اور کنواری لڑکیوں کی شادیوں کا بندوبست کرنے کے لیے اوقاف جن کے سرپرستوں کے لیے شادی کے اخراجات اور مہر کی رقم ادا کرنا مشکل ہو۔ کس قدر رحیمانہ تھا یہ جذبہ اور آج ہم اس کے کس قدر محتاج ہیں ۔

۲۱۔ ایسے ادارے جو ماؤں کی امداد کے لیے قائم کیے گئے تھے ۔ یہ ادارے ماؤں کو دودھ اور شکر فراہم کرتے تھے ۔ آج کل ہمارے ہاں جو جمعیت "نقطۃ الحلیب" کے نام سے قائم ہے، ہمارے ادارے اس سے بہت پہلے قائم ہوئے تھے اور ان کی بنیاد تقرب الی اللہ کے جذبہ پر تھی ۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے جو اچھے کام کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس نے اپنے قلعے کے دروازے کے پاس، جو آج بھی دمشق میں موجود ہے، دو چشمے بنا رکھے تھے ۔ ایک سے دودھ بہتا تھا اور دوسرے سے میٹھا پانی ۔ چھوٹے بچوں کی مائیں ہفتے میں دو بار یہاں آتیں اور اپنے بچوں کے لیے بقدرِ ضرورت دودھ اور شکر لے جاتیں۔

۲۲۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ بعض ادارے صرف اس مقصد کے لیے بنائے گئے تھے جو ان بچوں اور غلاموں کو کونڈے (مٹی کے برتن) فراہم کرتے تھے جو ان سے گھر جاتے وقت راستوں میں ٹوٹ جاتے تھے ۔ یہ لوگ ایسے اداروں میں آتے اور ٹوٹے ہوئے کونڈوں کے بدلے نئے لے جاتے اور گھر والوں کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ انھوں نے کوئی غلطی کی ہے ۔

۲۳۔ سب سے آخری قسم ان اداروں اور اوقاف کی وہ ہے جو بیمار حیوانات کے علاج، ان کے لیے چارہ فراہم کرنے اور ناتوانی کے وقت ان کے چرنے کے لیے قائم کیے جاتے تھے ۔ مرج الاخضر کا رقبہ جہاں آج کل بلدیہ کے کھیلوں کا میدان واقع ہے، ایسے ہی اوقاف میں سے تھا ۔ یہ گھوڑوں اور عمر رسیدہ جانوروں کے لیے ضروری تھا تاکہ وہ آخر دم تک یہاں عافیت سے رہیں ۔ غرض ہماری تہذیب میں جو ادارے رفاہِ عامہ کی غرض سے قائم کیے گئے ان

کی کم و بیش تئیس اقسام ہیں اور یہ بھی بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ کیا آپ اس کی کوئی مثال سابقہ اُمم کی کسی تہذیب میں پاتے ہیں؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں جن کی مثال مغربی تمدن میں بھی نہیں پائی جاتی جس کے رفاہی کاموں کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔

اللہ شاہد ہے کہ یہ زندگی دوام کا وہ راستہ ہے جس پر ہم اکیلے ہی چلتے رہے جبکہ پوری دنیا غفلت، جہالت اور پسماندگی اور گھٹاٹوپ اندھیروں میں سرگرداں تھی۔ بخدا یہ زندگی جاوید کا وہ راستہ ہے جس پر چل کر کسی وقت ہم نے عذاب میں مبتلا انسانیت کو اس کے مصائب اور آلام سے نجات دی تھی۔

لیکن افسوس صد افسوس! آج ہم کس راستے پر گامزن ہیں۔ کہاں گئے وہ ہاتھ جو یتیموں کے آنسو پونچھتے تھے، زخمی دلوں پر مرہم لگاتے اور جنہوں نے ہمارے معاشرے کو ایک ایسا معاشرہ بنا دیا تھا جس میں تمام لوگ امن و سلامتی، عزت اور عافیت سے خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے۔

# نواں باب

# مدارس اور علمی ادارے

# مدارس اور علمی ادارے

پچھلی گفتگو میں ہم نے، اسلامی تہذیب میں رفاہِ عامہ کے اداروں اور ان کی حیرت افزا اور فورع بنوع انواع کے متعلق ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اُمتِ اسلامیہ کی انسان دوستی، اس بارے میں ملت کی رُوح پر کس طرح اثر انداز رہی - وہاں پر نئے مدارس اور ہسپتالوں کے متعلق مستقل طور پر تفصیلی گفتگو کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ اب ہم اس سلسلہ میں سے پہلے اسلامی مدارس کو لیتے ہیں -

## اسلامی مدارس :

اسلامی مدارس بڑی بڑی وقف جائدادوں کی آمدنی سے قائم کیے گئے تھے - یہ اوقاف مختلف اوقات میں مختلف اُمرا اور قائدین، علماء، تجار اور بادشاہوں کی جانب سے قائم کیے گئے تھے اور یہ مدارس اس کثرت سے تھے کہ مملکتِ اسلامی کے حدُود میں کوئی ایسا قابلِ ذکر قصبہ یا گاؤں نہ تھا جہاں مدرسہ قائم نہ ہو اور اس میں بیسیوں مدرسین تعلیم و تدریس میں مشغول نہ ہوں۔

ہماری تہذیب میں مسجد وہ ابتدائی حلقہ تھا جس سے مدرسہ کی نشو ونما شروع ہوئی۔ اُس وقت مسجد صرف عبادت خانہ ہی نہ تھا بلکہ صحنِ مسجد میں مسلم بچے قرأت، کتابت علومِ قرآن، فقہ و شریعت، لغت و ادب اور دُوسرے علوم بھی حاصل کرتے تھے۔

## مکاتب :

پھر رفتہ رفتہ مسجدوں سے ملحق مکاتب بھی قائم ہو گئے جہاں قرأت، کتابت اور قرآن مجید کے علاوہ علومِ عربیہ اور علمِ ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ مکاتب ہمارے زمانے کے ابتدائی مدارس کے مشابہ ہوتے تھے اور یہ اس قدر کثرت سے تھے کہ ابنِ حوقل کی گنتی کے مطابق صرف صقلیہ کے ایک معمولی شہر میں قریبًا چھ سو مکتب تھے، اور وسیع اس قدر تھے کہ بعض اوقات ایک ایک مدرسہ میں سینکڑوں اور ہزاروں طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ابوالقاسم بلخی اپنی تاریخ میں خود اپنے مکتب کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں تین ہزار طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے اور اس کا مکتب اس قدر وسیع تھا کہ اس کے طویل و عریض احاطہ میں طلبہ کی نگرانی اور ان کے حالات و ضروریات سے واقفیت کے لیے سواری استعمال کرنا پڑتی تھی۔

## مدارس :

پھر مکتب سے آگے بڑھ کر مساجد کے ساتھ "مدرسہ" قائم ہوا اور یہ مدرسہ دورِ حاضر کی ثانوی اور اعلیٰ درسگاہوں کے مشابہ تھا۔ ان مدارس میں تعلیم بالکل مُفت دی جاتی تھی اور ہر طبقے کے لوگ داخل ہوتے تھے اور آج کل کے ہمارے ثانوی اور اعلیٰ مدارس کی طرح وہاں کسی قسم کی تعلیمی فیس وغیرہ ادا کرنی پڑتی تھی۔ ان میں تعلیم کسی خاص گروہ کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ سب کے لیے یکساں مواقع تھے، جو آتا تھا داخلہ لے سکتا تھا وہاں فقراء اور اغنیاء کے درمیان امتیاز نہ تھا، وہ ایک جگہ شانہ بشانہ بیٹھتے تھے۔ اُمراء تجار، کسان اور صنعت کار ایک ہی صف میں ہوتے تھے۔ ان مدارس میں تعلیم و تدریس

کی تھی۔ داخلی اور خارجی۔ داخلی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اکثر غربا ہوتے تھے جن کے والدین اور سرپرستوں کی معاشی حالت ان کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی متحمل نہیں ہوتی تھی اور دُوسری قسم خارجی طلبہ کی تھی، جو دن کو تعلیم حاصل کر کے رات کو اپنے گھروں یا رشتہ داروں کے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ تعلیم تو سب کے لیے مُفت تھی، مگر داخلی طلبہ کو تمام سہولتیں مفت فراہم کی جاتی تھیں۔ ان کے کھانے پینے، سونے اور عبادت کے لیے تمام انتظامات کیے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسجد میں مدرسہ درسگاہیں، طلبہ کے سونے اور رہائش کے لیے کمرے، کتب خانے، مطبخ اور حمام ضرور ہُوا کرتے تھے۔ بعض مدارس میں کُھلی فضا میں، کھیل کے میدان بھی تھے، جہاں طلبہ جسمانی ریاضت کرتے۔ آج تک عالمِ اسلامی میں بعض جگہوں پر ایسے مدارس کے نمونے موجود ہیں جن سے اس وقت تمام اسلامی دُنیا بھری پڑی تھی۔

## قیاس کُن ز گلستانِ من بہار مرا :

"دمشق میں آج بھی مدرسہ نوریہ موجود ہے۔ جسے امام نورالدین شہید مرحوم نے قائم کیا تھا۔ آج بھی وُہ "سوق الخیاطین" میں عظمتِ رفتہ کی داستان سُنا رہا ہے اور اسلامی تہذیب کے عروج کے زمانے میں مدارس کے عام نقشوں کی ایک جھلک دکھا رہا ہے۔ مشہور سیاح ابنِ جبیب نے ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں جب اس مدرسے کو دیکھا تو وُہ متعجب ہو کر اس کے متعلق لکھتا ہے کہ :

> "نورالدین رحمۃ اللہ علیہ کا مدرسہ دُنیا کے خوبصورت ترین مدارس میں شمار کیا جاتا ہے، مدرسہ کیا ہے ایک خوبصورت محل ہے، جس میں پانی کے لیے ایک بڑی نہر لائی گئی ہے، جس کے وسط میں ایک فوارہ نصب کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ گرنے والا پانی دو شاخوں میں بٹ جاتا، اور پھر ان دو شاخوں کے ذریعہ جا کر ایک بڑے حوض میں گرتا ہے جو اس محل کے وسط میں واقع تھا۔ اس منظر کے حسن کو دیکھ کر آنکھیں حیران رہ جاتی ہیں۔"

باوجودیکہ زمانے کی چیرہ دستیوں نے اس ادارے پر بڑے ستم ڈھائے، اور اس سے اس کے کئی حصے چھین لیے گئے، تاہم ابھی تک اس کی عمارت، درسگاہیں، مسجد اور مدرسین کی رہائش اور ان کے آرام کے کمرے موجود ہیں۔ یہ کمرہ آج کل کے کالجوں کے اسٹاف رُوم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایک خاص مکان بھی موجود ہے جو صدر مدرس کی رہائش گاہ کا کام دیتا تھا۔ جس میں وُہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے تھے۔ طلبہ کی رہائش گاہیں اور خُدامِ مدرسہ کی رہائش گاہیں، یہ سب آج بھی موجود ہیں۔ آج کل اس مدرسہ کے پڑوسیوں نے مدرسہ کے مطبخ، کھانا کھانے کے بڑے ہال، سبزیوں اور غلّہ کے گودام پر قبضہ کر لیا ہے۔ مدرسہ کی یہ عمارت مسلمانوں کے زمانہ قدیم کے مدارس کا زندہ نمونہ ہے۔

اسی طرح حلب میں قومی، شاہی اور عثمانی مدارس آج بھی موجود ہیں، جہاں آج بھی طلبہ کی رہائش کے کمرے اور درسگاہیں علیحدہ علیحدہ موجود ہیں۔ پہلے ان مدارس میں طلبہ کے لیے کھانے پینے کا بھی بندوبست تھا لیکن بعد میں یہ انتظام ہوا کہ ہر ماہ کے آخر میں مدرسہ میں داخل طلبہ کو نقد ادائیگی کا سلسلہ جاری کر دیا گیا۔

نیز ان مدارس کی ایک زندہ مثال جامع ازہر بھی ہے، جو درحقیقت ایک مسجد ہے، جس کے مختلف حصوں میں درس کے حلقے قائم ہوتے ہیں۔ مسجد کے چاروں طرف کمرے ہیں جہاں طلبہ رہتے ہیں جنہیں "رواق" کہا جاتا ہے جس میں ہر ملک کے طلبہ علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں، مثلاً شامیوں، ترکوں، سوڈانیوں اور عراقیوں کے علیحدہ علیحدہ "رواق" ہیں۔ آج بھی ازہر کے طلبہ مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ ازہر کے لیے وقف کردہ جائداد کی آمدنی سے ماہوار وظیفہ بھی باقاعدہ حاصل کرتے ہیں۔

## مدرسین کے حالات اور ان کی تنخواہیں:

اسلامی مدارس کے بیان کے ذیل میں ہمارے لیے یہ مناسب ہے کہ ہم مدرسین کے حالات اور ان کی تنخواہوں وغیرہ کا ذکر بھی کر دیں۔ صدر المدرسین ہمیشہ بہت بڑے

فاضل ہوا کرتے تھے۔ جو اپنے فن میں نہایت مشہور ہوتے تھے۔ مشہور علماء کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ کہاں کہاں پڑھاتے رہے۔ مثلاً امام نووی، ابن الصلاح ابو شامہ تقی الدین سبکی اور عماد الدین دارالحدیث دمشق میں پڑھاتے تھے۔ غزالی، شیرازی، امام الحرمین علامہ شاسی، خطیب تبریزی، قزوینی اور فیروز آبادی وغیرہ مدرسہ نظامیہ بغداد میں مدرس رہے ہیں۔ ابتدائی ادوار میں مدرسین درس و تدریس کے کام پر کوئی اُجرت نہ لیتے تھے لیکن جب تہذیب اسلامی عروج کو پہنچی، بڑے بڑے مدارس تعمیر ہوئے اور ان کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف ہوئیں تو مدرسین کے لیے بھی ماہوار مشاہرے مقرر ہوئے۔

اس سلسلہ میں علمائے ماوراء النہر کی دقیق النظری اور دور بینی پر دلالت کرنے والے اس واقعہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب نظام الملک (طوسی) نے ماوراء النہر کے علاقوں میں، اپنے مشہور مدارس تعمیر کیے اور ان میں مدرسین کے لیے معقول ماہوار تنخواہیں مقرر ہوئیں تو علماء نے جمع ہو کر اس کے اس فعل پر سخت ملامت کی۔ اور بڑا ماتم کیا اور کہا کہ اب علم کی فضیلت اور قدر و برکت جاتی رہی۔ پہلے پاک نفوس اور اُولوالعزم لوگ علم حاصل کرتے تھے اور وہ علم کو محض اس کے مجد و شرف اور حصولِ کمال کی خاطر حاصل کرتے تھے، لیکن اب جبکہ علم کے ساتھ دنیاوی مفاد وابستہ کیا کیا جا رہا ہے تو پھر دنیوی اغراض اور ذاتی مفاد کے حریص لوگ علم کی جانب توجہ کریں گے، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ علم بجائے خود قدر و قیمت والا باقی نہ رہے گا اور اس میں ضعف بھی پیدا ہو جائے گا اور اس کی اہانت بھی ہو گی۔ لیکن ان لوگوں کا نقطہ نظر زندگی کے بدلتے ہوئے حالات اور تمدن کی نت نئی ضروریات کی بناء پر قبول نہیں کیا گیا اور بالآخر مدرسین کی تنخواہیں مقرر ہو گئیں جو علاقوں، مدارس اور اوقات کے لحاظ سے کہیں کم اور کہیں زیادہ تھیں لیکن بہر حال معاوضہ اس قدر ضرور ہوتا تھا کہ ایک مدرس اس سے نہایت آرام سے زندگی بسر کر سکے۔ تدریس کی تنخواہ ان معاشی ضروریات کی کفالت کے علاوہ ہوتی تھی جو مدرسین کے لیے فراہم کی جاتیں۔ شیخ نجم الدین جبوشانی

کو، جنہیں سلطان صلاح الدین نے اپنے مدرسہ صلاحیہ کا مدرس مقرر کیا تھا، چالیس پونڈ ماہوار تدریس کی تنخواہ، دس پونڈ مدرسہ کے اوقاف کی نگرانی کا معاوضہ اور روزانہ ساٹھ مصری رطل روٹی اور نیل کے پانی کی دو مشکیں دی جاتی تھیں۔ شیخ الازہر کے الاؤنسوں میں "سواری الاؤنس" بھی شامل تھا جو وہ ازہر کے اس خاص وقف سے لیتے تھے جو بحیثیت عہدہ شیخ الازہر کے گھوڑے کے لیے مقرر تھا۔ اور یہ قریبی زمانوں میں تقریباً سو پونڈ ماہوار ہوتا تھا، جسے آخر میں شیخ الازہر کی تنخواہ میں ضم کر دیا گیا۔

## فرائضِ تدریس کیسے لوگ انجام دیتے ہیں؟

تدریس کے فرائض صرف وہی لوگ سرانجام دے سکتے تھے جن کے متعلق ماہرین یہ تصدیق کرتے کہ وہ اس کے لیے مکمل طور پر اہلیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی ادوار میں تو یہ طریقہ تھا کہ اُستاد خود قابل شاگرد کو اجازت دے دیتے تھے کہ وہ اگر چاہے تو اُستاد کے حلقے سے علیحدہ ہو جائے اور خود اپنا مستقل علمی حلقۂ درس شروع کر دے یا پھر اُستاد کی وفات کے بعد اس کے شاگردوں میں سب سے قابل ترین شخص کو مسندِ درس کے لیے منتخب کیا جاتا، اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرتا تو قابلِ ملامت ہوتا اور اس پر شدید اعتراضات کیے جاتے تھے۔ قاضی ابُو یوسف کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ امام ابُوحنیفہ کے عزیز شاگرد تھے اور ہارون الرشید کے دور میں قاضی القضاۃ تھے۔ امام ابُوحنیفہ کی زندگی میں یہ سخت بیمار ہو گئے۔ امام صاحب عیادت کو آئے تو کہا تمہاری شدید علالت سے میں بہت متفکر ہُوں کیونکہ تمہارے متعلق میرا خیال ہے کہ میرے بعد تم ہی مسلمانوں کی توقعات پوری کرو گے۔ خدا نے امام ابُو یوسف کو شفا عطا فرمائی اور امام ابُوحنیفہ جیسی شخصیت کے اس حوصلہ افزا ریمارک کو ہضم نہ کر سکے اور اپنا ایک علیحدہ حلقۂ درس شروع کر دیا۔ امام ابوحنیفہ کو معلوم تھا کہ وہ ابھی پوری طرح پختگی کو نہیں پہنچے۔ چنانچہ پانچ ایسے دقیق اور مشکل سوال جن کے جواب میں تفصیلی وضاحت درکار تھی، کسی کے ہاتھ ان کے پاس بھیجے کہ وہ ان کے جواب دیں۔ جب امام یوسف

نے جواب غلط دیا اور محسوس کیا کہ اُستاد سے علیحدہ ہو کر اُنہوں نے غلطی کی ہے تو فوراً دوبارہ اُستاد کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ امام ابُو حنیفہ نے فرمایا: "تو پختگی سے پہلے خشک ہو گیا ہے۔ اور جو یہ سمجھے کہ وُہ حصولِ علم سے مستغنی ہو گیا ہے اسے چاہیے کہ اپنی ذہنیت پر ماتم کرے۔" یہ تو تھے ابتدائی حالات لیکن جب مدارس بنے تو وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو سندیں دینے کا رواج ہُوا۔ خصوصاً اطبّاء کو اس وقت تک پریکٹس کی اجازت نہ ہوتی جب تک انہیں باقاعدہ سند نہ مل جاتی۔ اور یہ سند مدارس کے بڑے بڑے شیوخ دیتے تھے۔

## مدرّسین کے لباس:

مدرّسین کا ایک خاص لباس ہُوا کرتا تھا جو انہیں دُوسرے پیشہ ور لوگوں سے ممتاز کرتا تھا۔ امام ابُو یوسف کے وقت جو لباس رائج تھا وُہ سیاہ عمامہ اور چادر تھی۔ فاطمیوں کے عہد میں سبز عمامہ اور چھ ٹکڑوں پر مشتمل سنہری لباس جن میں سے اہم ٹوپی اور چادر ہوتی تھی۔ رہا جبّہ جو علماء اور مدرّسین کے لیے مخصوص تھا، تو اس کا آغاز امویوں کے دور ہی سے ہو گیا تھا۔ اندلس میں مدرّسین اور علماء کا لباس مشرقی علماء اور مدرّسین سے قدرے مختلف تھا۔ اور زیادہ اختلاف عمامہ میں تھا، وُہ لوگ نہایت چھوٹا عمامہ استعمال کرتے تھے۔ بعض تو عمامہ پہنتے ہی نہ تھے۔ چنانچہ جب مشہور ادیب امام ابو علی نامی، اندلس گئے اور وہاں کے علماء نے ان کا استقبال کیا تو وُہ ان کا بڑا عمامہ دیکھ کر متحیّر ہوئے اور بیوقوفوں اور بچّوں نے ان سے مزاح بھی کیا اور کنکریاں پھینکیں۔ اقوامِ مغرب نے اپنا لباس اندلس کے مسلمانوں ہی سے لیا اور یورپ کی یُونیورسٹیوں میں ہڈ اور گون کی شکل میں اہلِ علم کا جو لباس آج بھی جاری ہے اس کا ماخذ مسلمان اساتذہ کا لباس ہے۔

## انجمن اساتذہ:

اس دور میں مدرّسین کی باقاعدہ مختار انجمن ہوتی تھی جیسا کہ آج کل طلبہ، شہریوں، مختلف

پیشہ وروں کی اپنی اپنی یونینیں ہوتی ہیں، مدرسین اپنے نمایندوں اور صدر کا انتخاب کرتے تھے اور وُہ اس معاملہ میں خود مختار تھے۔ حکومت اس میں اس وقت مداخلت کرتی تھی جب ان میں اختلاف رُونما ہو جاتا، ابُو شامہ نے روضتین میں مقلد دولعی سے روایت کی ہے کہ جب حافظ مرادی فوت ہُوئے تو اس وقت ہم لوگوں یعنی فقہار کی جماعت میں دو گروہ تھے۔ عرب اور کرد۔ اور ہمارے درمیان اختلاف پیدا ہُوا۔ ہم میں سے کچھ لوگوں کا رجحان فقہ کی جانب تھا۔ اس بنار پر انھوں نے چاہا کہ اس منصب کے لیے شیخ شرف الدّین ابوالحضرون کو بُلایا جائے اور بعض لوگوں کا میلان نظری علوم اور اخلاقیات کی طرف تھا، چنانچہ انھوں نے قطب نیشاپوری کو بُلانا چاہا۔ اس اختلاف کی وجہ سے ایک فتنہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور اس کا علم نورالدّین کو ہُوا، اس نے جماعت اہلِ علم کو بُلایا اور ان سے مجدالدّین بن الدایہ نے سلطان کی جانب سے بطور نائب ملاقات کی اور کہا کہ سلطان فرماتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ نوریہ دین اور علم کی نشر و اشاعت اور بدعات کو ختم کرنے کی غرض سے بنایا تھا آپس کی سر پھٹول کے نہیں بنایا، آپ حضرات کا یہ اختلاف کسی صورت میں بھی مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا ہم دو فریقوں کو راضی کرنے کی خاطر دونوں کے مطلوبہ حضرات کو بلائے لیتے ہیں۔ چنانچہ دونوں کو بُلا کر شرف الدّین کو مدرسہ نوریہ اور قطب الدّین کو "مدرسہ نفری" کا صدر مدرس بنایا گیا۔

## چند مشہور مدارس اور ان کے قائم کرنے والے:

مدارس اور خصوصاً اعلیٰ تعلیمی اداروں کی اس قدر بہتات تھی کہ پُورا عالمِ اسلامی اعلیٰ مدارس سے بھرا پڑا تھا۔ تاریخ اسلامی بڑے تعجب اور فخر سے بعض ایسے فرزندانِ اسلام کے نام پیش کرتی ہے جنھوں نے عالمِ اسلامی کے ہر شہر میں بڑے بڑے مدارس تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کیا، ان لوگوں میں سرِ فہرست صلاح الدّین ایّوبی ہیں جنھوں نے مصر، دمشق، موصل اور بیت المقدس کے چپہ چپہ پر مدارس کا جال پھیلا دیا تھا۔ نورالدّین الشہید بھی ایسے لوگوں سے ہیں جنھوں نے صرف شام میں چودہ بڑے مدارس قائم کیے۔

جن میں سے چھ دمشق میں، چار حلب میں، دو حماۃ میں اور حمص میں اور ایک بعلبک میں تھا۔ نیز نظام الملک طوسی آلِ سلجوق کے وزیرِ اعظم بھی ایسے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے عراق اور خراسان کو مدارس سے بھر دیا تھا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ اس نے عراق اور خراسان کے ہر شہر میں ایک اعلیٰ مدرسہ قائم کیا۔ اور دُور دراز علاقوں میں بھی مدارس قائم کیا کرتا تھا۔ مثلاً اس نے جزیرہ ابنِ عمر میں ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا جو نہایت خوبصورت تھا۔ جہاں بھی اسے کسی ماہرِ فن عالم کا پتہ چلتا وہاں اس کے لیے مدرسہ قائم کر کے اوقاف کا بندوبست کر دیتا اور ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کر دیتا تھا۔

نظامیہ بغداد سب سے اہم اور منظّم مدرسہ تھا۔ پانچویں اور نویں صدی ہجری کے درمیان بڑے بڑے فضلا اس مدرسے سے نکلے۔ اور اس کے طلبہ کی تعداد چھ ہزار تک جا پہنچی تھی۔ جس میں ممالکِ اسلامیہ کے بڑے بڑے رؤسا کے بچے، فقیر سے فقیر تر لوگوں کے بچے ایک جگہ بیٹھ کر بغیر کسی فیس کے تعلیم حاصل کرتے تھے، بلکہ فقرا کے لیے تو مفت تعلیم کے علاوہ وظائف بھی مقرر تھے، جو اس مقصد کے لیے وقف کردہ زمین کی آمدنی سے دیے جاتے۔

ایسے صاحبانِ جاہ و منصب کے دوش بدوش دوسرے دولت مند اور تجار اور اغنیا حضرات بھی قیامِ مدارس اور ان کے لیے اوقاف قائم کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے تھے تاکہ ان اوقاف کی وجہ سے مدارس کو مالی استحکام حاصل رہے اور طلبہ بڑے اطمینان سے ان مدارس کی جانب متوجہ ہو سکیں۔ بہت سے ایسے مخیّر حضرات بھی گزرے ہیں جنہوں نے اپنے گھروں کو مدارس میں تبدیل کر دیا تھا اور ان میں جو کتابیں تھیں یا ان کے ساتھ جو جائدادیں تھیں انہیں طلبا کے لیے وقف کر دیا تھا۔

ان وجوہات سے پورے عالمِ اسلام میں عموماً اور مشرقی علاقوں میں خصوصاً مدارس کی بہتات ہو گئی تھی۔ ابنِ جبیر اندلس کا مشہور سیاح ان مدارس کی کثرت، ان کے اوقاف وافر غذائی پیداوار اور بے حد آمدنی کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اور اس نے اندلس کے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ مشرق میں جا کر علم حاصل کریں۔ وہ کہتے ہیں:

"مشرقی علاقوں میں مدارس کے طلبہ کے لیے بے شمار اوقاف ہیں، خصوصاً دمشق میں۔ ہمارے مغربی (اندلسی) طلبہ میں سے جو اطمینان و فراغت چاہتا اسے چاہیے کہ وہاں چلا جائے۔ وہاں اسے بہت سے ایسے فوائد حاصل ہوں گے جو طلب علم میں مددگار ہوں گے۔ خصوصاً معیشت سے پوری طرح فارغ البالی ہو جاتی ہے۔"

ابن جبیر کی اس شہادت کی ایک خاص قیمت ہے کیونکہ وہ بیان واقعات میں، نہایت سچا اور دیانت دار سیاح سمجھا جاتا ہے۔ اور اس نے کثرت اوقاف اور کثرت مدارس کے لحاظ سے دمشق کا خصوصی تذکرہ کیا ہے۔ اور یہ ہے بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کیونکہ دمشق میں چار سو سے زائد ایسے آباد مدارس تھے جن میں دُور دراز سے طلبہ آتے تھے اور اس سلسلہ میں اس تاریخی شہادت کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ دمشق میں مدارس کی کثرت کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی طالب علم ایک سال قیام کے ارادہ سے دمشق آتا، تو اسے ہر مدرسے میں ایک رات سے زیادہ سونے کا موقع نہ ملتا، اور سال ختم ہو جاتا۔

ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں، سلطان بن علی بن منقذ کنانی کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے جو دمشق کی تعریف اور اس کی فضیلت میں ہے۔ اس میں اس نے دمشق کے مدارس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"وہاں ایسے مدرسین ہیں، جن کے سامنے آپ جو مشکل سوال بھی پیش کریں، آپ ان میں سے کوئی ایک نوجوان پائیں گے جو اسے فوراً حل کر دے گا۔ وہاں جو شخص اُلجھن اور حیرت لے کر جائے گا اس کی اُلجھن دُور ہو جائے گی اور وُہ راہِ ہدایت پائے گا اور جو فکری لحاظ سے غریب ہو گا وُہ فوراً متموّل ہو جائے گا۔ ان مدارس کے اوقاف کی پیداوار سے قیدی رہائی پاتے ہیں اور غریب مستغنی ہو جاتے ہیں۔ وہاں آئمہ ہیں جو علوم کا درس دیتے ہیں اور ایسے سرداران علم تزکیہ ہیں جو نفوس کی بیماریوں کے لیے شفا ہیں حالانکہ یہ بیماری

بڑی پیچیدہ ہوتی ہے۔"

## مدارس کے لیے اوقاف کی چند مثالیں :

ہم اب وُہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔جن سے اوقاف کی بہتات کا اندازہ ہو جائے گا۔ دمشق کے مدرسہ نوریہ کبری کے اوقاف، اس مدرسہ کے دروازے پر ثبت دستاویز کے مطابق درجِ ذیل ہیں :

گندم منڈی کے تمام نئے حمام، اور باب السلامہ کے باہر وارفد کے دو نئے حمام ان دو حماموں کے متصل مکان "عونیۂ حمی" کا کارخانہ ادراق اور وزیر کا باغیچہ، ارزہ کے باغ جوزہ" کا نصف اور چوتھائی" باب جابیہ کے باہر کی گیارہ دکانیں۔ اور داویا کے نو کھیت۔

حلب کے نوری ہسپتال کے اوقاف یہ تھے :

"معرانا کا پورا گاؤں، جبلِ سمعان کی وادی عسل کی مزروعہ زمین کا نصف حصہ، کفر تابا کی زمین میں سے پانچ فدان یعنی پانچ جوڑے بیل زمین اور خالدی کھیت کا ایک تہائی حصہ۔ مطخ کی ایک چکی نیز باب الجنان کے سامنے کی چکی کی تمام آمدنی اور اعزاز کے ابومرابا کے کھیت سے تین فدان یعنی تین جوڑی کے برابر زمین۔ اور مطخ کے لیے کھیت "خمیسہ" سے آٹھ جوڑی بیل کے برابر کی زمین، معرہ کے کھیت قرزل سے گیارہ جوڑی زمین۔ غربیات کے گاؤں "بیت راعیل" کی آمدنی کا ایک تہائی حصہ۔ سوق ہوا کی دس دکانیں۔ باب انطاکیہ باب مرح اور باب جنان کے باہر کی عام بستیاں"

دمشق کی مساجد اور مدارس کے لیے اوقاف کی کثرت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ امام نووی متوفی ۶۷۶ھ نے اپنی پوری زندگی میں دمشق میں پیدا ہونے والا کوئی پھل نہ کھایا۔ کیونکہ "غوطہ" کا اکثر حصہ اور دمشق کے دوسرے اکثر باغات درحقیقت وقف تھے۔ جن کو ظالم لوگوں نے دبا رکھا تھا۔

## مختلف علوم و فنون کے لیے مخصوص مدارس :

بہت سے مدارس متعدد اغراض و مقاصد کے حامل تھے۔ بعض تو ایسے مدارس تھے جن میں صرف قرآن مجید کی تفسیر و قرأت اور اس کے حفظ کی تدریس ہُوا کرتی۔ بعض ایسے مدارس تھے جن میں محض علمِ حدیث اور متعلقہ علوم پڑھائے جاتے تھے۔ بعض دوسرے مدارس فقہ کے لیے مخصوص تھے اور ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور پھر ہر مسلک کی فقہ کے لیے خاص مدرسہ ہوتا تھا، اس طرح طب کے لیے مخصوص مدارس تھے اور بعض مدارس صرف یتیموں کے لیے مخصوص تھے۔

نعیمی نے جو دسویں صدی کے علماء میں سب سے ممتاز ہیں، اپنی کتاب الدارس فی تاریخ المدارس میں، دمشق کے مدارس اور ان کے اوقاف ہی کی مکمل فہرست دی ہے۔ اس کتاب سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دمشق میں صرف قرآن اور علوم قرآن کی تعلیم کے لیے سات مدارس تھے۔ حدیث کے لیے سولہ مدرسے، قرآن اور حدیث کے مشترکہ تین مدرسے، فقہ شافعیہ کے تریسٹھ مدارس، فقہ حنفیہ کے لیے باون مدرسے، فقہ مالکی کے لیے چار مدرسے اور فقہ حنبلی کے لیے گیارہ مدرسے تھے، یہ مدارس طب کے مدارس کے علاوہ تھے، (نیز زاویے رخانقاہیں)، سرائے اور جامع مساجد ان کے علاوہ تھیں۔ یاد رہے کہ ان سب مقامات پر بھی باقاعدہ درس و تدریس کا کام ہوتا تھا، اور لوگ پڑھتے پڑھاتے تھے۔

## اس وقت یورپ کا کیا حال تھا؟ :

اس کے ساتھ ساتھ اگر ہم، اہلِ غرب کی وُہ حالت بیان کریں جس میں یہ لوگ اس وقت مبتلا تھے تو یہ نہایت مناسب ہو گا۔ آپ یہ سُن کر حیران رہ جائیں گے کہ وُہ اس وقت سو فی صدی جاہل اور پُورے اُجڈ تھے۔ علم صرف راہبوں کی چار دیواری تک محدُود تھا۔ اور صرف کاہنوں اور پادریوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس تقابل سے بہ سہولت معلوم ہو جاتا

ہے کہ ہماری تہذیب کے عروج کے دور میں اُمتِ مسلمہ کس قدر بلندیوں تک پہنچی - اجتماعی اداروں اور علمی مراکز کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ہماری تہذیب کے کارنامے کس قدر شاندار ہیں؟ نیز کس طرح اسلام نے علم کی نشر و اشاعت، انسانی تہذیب کی سطح بلند کرنے اور ہر مذہب و ملت کے تمام افراد کے لیے ان چیزوں کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؟

ابنِ کثیر اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں، ۶۳۱ھ کے واقعات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"اس سال مدرسہ مستنصریہ بغداد کی عمارت مکمل ہوئی - اس سے پہلے اس جیسا کوئی مدرسہ نہیں بنایا گیا - یہ چاروں فقہی مذاہب کے لیے وقف کیا گیا، ہر مذہب کے باسٹھ فقہاء اس میں کام کرتے - ان میں سے چار ماہرینِ فن ہوتے - ہر مذہب کا ایک ایک مدرس، ایک شیخ الحدیث، دو قاری، دس سامع ایک شیخ طب، دس مسلمان ہوتے جو مطب کرتے تھے - ایک یتیموں کا مکتب بھی تھا، ہر طالب علم کے لیے مقرر روٹی، گوشت اور مٹھائی اور دوسرے اخراجات کی ایک خاص مقدار مقرر کی گئی جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہوتی تھی۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:

"اور اس مدرسے کے لیے ایک ایسا کتب خانہ وقف کیا گیا جس کی کوئی مثال سننے میں نہیں آئی، بہت بڑی تعداد میں کتابیں تھیں جو نہایت خوشخط لکھی ہوئی تھیں اور ہر فن کی بہترین کتابیں جمع کی گئی تھیں۔"

## دسواں باب

# شفاخانے اور طبّی مدارس

# شفاخانے اور طبّی مدارس

ہماری تہذیب جن بنیادوں پر اُٹھائی گئی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان میں جسمانی اور رُوحانی دونوں قسم کی ضروریات ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ تہذیب اسلامی نے جسم کی نشو ونما اور دیکھ بھال کی طرف بھی توجہ دی تاکہ تابناک رُوح کے ساتھ انسان ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکے۔ اس سلسلہ میں تہذیب اسلامی کی اساس رکھنے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں سے یہ کلمات قابلِ غور ہیں:
" ان لجسدك عليك حقاً" (بخاری و مسلم) (بے شک تیرے جسم کے بھی تم پر کچھ حقوق ہیں) اسلام کی تمام عبادات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں علمِ طب کے اہم مقصد، حفظانِ صحت کے اصولوں کو دقت سے مدِ نظر رکھا گیا ہے[۱]۔ چنانچہ نماز، روزہ اور حج کی ادائیگی کے لیے جتنے شرائط و قیود ہیں اور ان کی ادائیگی کے دوران جسم کو جو کچھ کرنا پڑتا ہے یہ سب کچھ حفظانِ صحت اور جسم کی تر و تازگی کے لیے نہایت

---

۱: علی بن عباس علمِ طب کی یہ تعریف کرتے ہیں: "یہ ایک علم ہے جس میں حفظانِ صحت اور بیماروں کے لیے حالتِ صحت واپس لانے سے بحث کی جاتی ہے۔"

مفید ہے۔ اس کے ساتھ جب ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیب اسلامی نے کس طرح امراض اور ان کے پھیلنے کا مقابلہ کیا، ہر مرض کے مقابلہ کے لیے اس کے علاج کی ترغیب دی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ طب کے میدان میں بھی ہماری تہذیب کس قدر ٹھوس اور مضبوط اصولوں پر قائم ہوئی ہے۔ اور اس میدان میں اس کے کارنامے کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں، اس نے بڑے بڑے ہسپتال اور طبی ادارے قائم کیے جن سے پوری انسانیت نے فائدہ اٹھایا اور ایسے ایسے اطبا پیدا کیے جن کے علمی اور طبی کارناموں پر آج بھی انسانیت فخر کر رہی ہے۔

## عرب ایام جاہلیت سے ہی علم طب حاصل کرتے آئے تھے:

عرب جندیسا پور کے طبیہ کالج سے واقف تھے، جسے کسریٰ ایران نے چھٹی صدی کے نصف آخر میں قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ میں عرب کے بعض ڈاکٹروں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ مثلاً حارث بن کلدہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گذرا ہے اور حضورؐ کے چند صحابہ کا طبی مشیر رہا اور وہ جب بیمار ہوتے تھے تو وہ ان کا علاج کیا کرتا تھا۔

## سب سے پہلا باقاعدہ اسپتال:

ولید بن عبدالملک کے دور میں مسلمانوں نے پہلا ہسپتال قائم کیا، جو جذام کے مریضوں کے لیے خاص تھا۔ اس ہسپتال کے لیے جو ڈاکٹر مقرر ہوئے، ان کے لیے بڑی بڑی جاگیریں اور تنخواہیں مقرر ہوئیں اور اس اسپتال میں علاج کرانے والے مریضوں کو حکم تھا کہ وہ ہر وقت اسپتال ہی میں رہیں، ان کے لیے وظیفے مقرر تھے، جیسا کہ اندھوں کے لیے بھی خاص وظیفے مقرر ہوئے۔ پھر اس اسپتال کے بعد تو ہر جگہ ہسپتال بنتے گئے۔ جنہیں "بیمارستان" کہا جاتا تھا۔ یعنی "مریضوں کا گھر"۔

## دو قسم کے اسپتال :

اسپتال دو قسم کے ہوا کرتے تھے۔ (۱) گشتی شفا خانہ۔ (۲) قائم ہسپتال۔ گشتی شفاخانوں میں سے ایک شفاخانے کا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پتہ چلتا ہے۔ جو غزوہ خندق میں قائم کیا گیا۔ اس جنگ میں زخمیوں کے لیے ایک علیحدہ خیمہ قائم کیا گیا تھا۔ جب حضرت سعد بن معاذ زخمی ہوئے اور ان کے بازو پر "اکحل" نامی رگ میں زخم آیا تو آپ نے حکم دیا کہ انہیں زخمیوں کے خیمے میں رکھا جائے تاکہ میں قریب رہ کر بسہولت ان کی خبر گیری کر سکوں۔ یہ اسلام میں پہلا گشتی جنگی ہسپتال تھا۔ اس کے بعد خلفاء و بادشاہوں نے اس میں توسیع کی۔ یہاں تک کہ گشتی ہسپتال تک میں وہ تمام سہولتیں فراہم ہونے لگیں۔ جن کی بیماروں کو ضرورت ہوتی تھی یعنی علاج، کھانا پینا، دوائیں، کپڑے، ڈاکٹر اور دواساز سب موجود ہوتے تھے۔ یہ گشتی شفا خانے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں منتقل ہوتے رہتے، جہاں قائم ہسپتال نہ ہوتے۔

وزیر علیٰی بن علی جراح نے سنان ابنِ ثابت کو لکھا، جو اس وقت بغداد اور اس کے متعلقہ ہسپتالوں کے انچارج تھے :

"میں نے سواد یعنی گاؤں میں بسنے والے لوگوں کے متعلق سوچا ہے کہ وہاں بیمار تو لازماً ہوں گے لیکن ان کے لیے کوئی معالج نہ ہو گا کیونکہ ان بستیوں میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے، آپ جلد از جلد ڈاکٹروں کا ایک گروپ تیار کریں اور ان کے لیے دواؤں اور مشروبات کا ایک وافر ذخیرہ فراہم کر دیں۔ یہ لوگ گاؤں جائیں اور جہاں جس قدر ٹھہرنے کی ضرورت ہو ٹھہریں اس میں مریضوں کے معالجہ کے بعد دوسرے گاؤں منتقل ہو جائیں۔"

سلطان محمود سلجوقی کے عہد میں گشتی شفاخانے اس قدر وسیع ہو گئے تھے کہ ان کا ساز و سامان چالیس اونٹوں پر لادا جاتا تھا۔

رہے قائم شفاخانے اور ہسپتال تو وہ اس کثرت سے تھے کہ عالم اسلامی کا کوئی ٹکڑے

سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا شہر ان سے فائدے اُٹھاتا تھا۔ کوئی سا چھوٹے سے چھوٹا شہر ایسا نہ تھا جہاں ایک سے زیادہ ہسپتال نہ ہوتے۔ مثلاً ایک وقت ایسا تھا کہ صرف قرطبہ میں پچاس بڑے ہسپتال تھے۔

## مختلف نوع کے اسپتال :

ان اسپتالوں کی نوعیت بھی مختلف ہو گئی تھی۔ بعض ہسپتال فوجیوں کے لیے مخصوص تھے اور ان کے مخصوص ڈاکٹر ہوا کرتے تھے۔ یہ ڈاکٹر فنا ئدینِ لشکر، خلیفوں اور اُمراء کے خاص معالجوں کے علاوہ ہوتے تھے۔ قیدیوں کے لیے علیحدہ اسپتال، ڈاکٹر ہر روز قیدیوں کا معائنہ کرنے اور انہیں علاج و معالجہ کی ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں، چنانچہ وزیر علی بن عیسٰی بن جراح بن ثابت، رئیس اطباء بغداد کو لکھتے ہیں :

> "مجھے قیدیوں کے متعلق بیحد فکر ہے، ان کی کثرت اور قید خانوں کی حالت گواہ ہے کہ ان میں بے شمار افراد مریض ہوں گے لہٰذا میرا خیال ہے کہ ان کے لیے علیحدہ ڈاکٹر مقرر کیے جائیں جو ہر روز ان کا معائنہ کریں اور انہیں دوائیں اور مشروبات پلائیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ تمام قید خانوں کا معائنہ کریں اور وہاں کے بیماروں کا علاج کریں۔"

## ابتدائی طبّی امداد کے مراکز :

ابتدائی طبّی امداد کی فراہمی کے لیے بھی مراکز قائم کیے جاتے تھے۔ جو جامع مسجد اور ایسے عام مقامات پر قائم کیے جاتے تھے جہاں لوگوں کی کثرت ہوا کرتی تھی مقریزی لکھتے ہیں کہ :

> "ابن طولون نے جب مصر میں اپنی مشہور روزگار جامع مسجد تعمیر کی تو اس کے آخری حصّہ میں ایک وضو خانہ اور ایک ڈسپنسری قائم کی جس میں ہر قسم کی دوائیں موجود رہتی تھیں اور خادم مقرر تھے۔ جمعہ کے دن وہاں ایک ڈاکٹر

کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ اور نمازیوں میں سے اگر کسی کو اچانک تکلیف ہو جاتی تو اس کا فی الفور علاج کیا جاتا۔"

## عام شفاخانے:

بعض ہسپتال عمومی تھے جن کے دروازے عوام الناس کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ یہ دو قسم کے ہوتے تھے:

۱۔ مردوں کے ہسپتال۔

۲۔ عورتوں کے ہسپتال، اور یہ ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے، ہر قسم میں متعدد شعبے ہوتے تھے، جو خاص خاص امراض کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ داخلی امراض کا شعبہ۔

۲۔ آنکھوں کا شعبہ۔

۳۔ جراحت کا شعبہ۔

۴۔ ہڈیوں اور ٹوٹے ہوئے اعضا پر پٹی باندھنے کا شعبہ۔

۵۔ دماغی امراض کا شعبہ۔

داخلی امراض کے پھر چند ذیلی شعبے تھے:

۱۔ بخار کا شعبہ۔

۲۔ پیٹ اور بدہضمی کا شعبہ۔

ہر شعبے کا ایک انچارج اور صدر ہوتا تھا۔ مثلاً شعبۂ جراحت۔ شعبۂ چشم اور شعبۂ استخواں وغیرہ وغیرہ، اور ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ اسپیشلسٹ ہوا کرتے تھے۔ اور پھر پورے ہسپتال کا ایک انچارج ہوا کرتا تھا، جسے "ساعور" کہا جاتا تھا۔

اطباء کے لیے ڈیوٹی کے اوقات مقرر تھے اور ان اوقات میں وہ اپنے ایک مقرر شعبے میں بیٹھ کر مریضوں کو دیکھا کرتے۔

ہر ہسپتال میں عطار اور نرسیں وغیرہ چھوٹے درجے کے ملازمین بھی ہوا کرتے، ان کے علاوہ دوسرے معاون بھی ہوا کرتے تھے۔ ان ملازمین کے متعین معاوضے معقول ہوا کرتے تھے۔ ہر ہسپتال میں ایک دواخانہ ہوا کرتا تھا جسے "خزانۂ مشروبات" کہا جاتا تھا۔ اس میں پینے کے لیے کثیر الاقسام دوائیں، نفیس قسم کی معجونیں، اور اعلیٰ درجے کے مربّے ہوتے تھے، علاوہ ازیں نفیس نفیس دوائیں اور اعلیٰ قسم کے عرق بھی ہوتے تھے جو صرف ہسپتالوں ہی میں دستیاب ہو سکتے تھے۔ نیز ان میں نازک قسم کے جراحی آلات، شیشے کے برتن اور دوسرے ایسے ایسے برتن ہوتے تھے جو صرف بادشاہوں ہی کے محلوں میں استعمال ہوا کرتے تھے۔

## میڈیکل کالجوں سے تعلق :

یہ ہسپتال طبی مدارس کا کام بھی دیتے تھے، ہر ہسپتال میں ایک بڑا کمرہ ہوتا تھا جس میں علوم طب پر لیکچر دیے جاتے تھے۔ رئیس الاطبّا عام ڈاکٹروں اور طلباء کے ساتھ وہاں جمع ہوتے جہاں ہر قسم کی کتابیں اور ہر قسم کے آلات موجود ہوتے تھے، مریضوں کے معائنہ اور علاج کے بعد طلبا اساتذہ کے سامنے بیٹھ جاتے اور طبّی مباحث شروع ہو جاتے۔ اُستاد اور طلبہ کے درمیان قیمتی مباحث ہوتے اور اچھی کتابیں پڑھائی جاتیں۔ اکثر اوقات آپ اساتذہ طلبہ کے ساتھ ہسپتال کے اندر جاتے تھے تاکہ انہیں عملی کام کرائیں جیسا کہ آج کل طلبہ کالجوں کے متعلقہ ہسپتالوں میں پریکٹس کرائی جاتی ہے ابن اصیبعہ، جنہوں نے، دمشق کے نوری ہسپتال میں طب کی تعلیم حاصل کی، لکھتے ہیں:

"جب حکیم مہذب الدین اور حکیم عمران ہسپتال میں، بیماروں کے معائنہ اور معالجہ سے فارغ ہوتے تو میں ان کے ساتھ ہوتا، اور میں شیخ رضی الدین رحبی کے پاس بیٹھ جاتا۔ اور مریضوں کے امراض کی تشخیص کے متعلق ان کے استدلال کا طریقہ دیکھتا۔ جو کچھ وہ مریضوں کے متعلق بیان کرتے اور جو کچھ ان کے لیے لکھتے، ان میں سے اکثر امراض اور ان کے لیے تجویز کردہ

دواؤں کے بارے میں، ان سے بحث بھی کرنا۔"

## مستند اطباء کو علاج معالجہ کی اجازت دی جاتی:

ہر کسی کو اپنے طور پر علاج کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ حکومت کے مقرر کردہ رئیس الاطباء کے سامنے پیش ہو کر اسے امتحان دینا پڑتا تھا۔ وہ جس فن میں سند حاصل کرنا چاہتا اسے اس میں رسالہ لکھنا پڑتا تھا۔ یہ رسالہ تو خود اس طالبعلم ہی کی تصنیف ہوتی یا کسی دوسرے طالب علم کی تحریر ہوتی لیکن یہ اس پر اپنے نوٹس اور تبصرے لکھ کر پیش کرتا۔ رئیس الاطباء طالب علم سے تفصیلی انٹرویو لیتے اور اس فن کے تمام متعلقہ اور مندرجہ مسائل پر سوالات کرتے۔ اگر وہ ہر لحاظ سے اطمینان بخش جوابات دے دیتا تب رئیس الاطباء اسے پریکٹس کرنے کی اجازت دیتے۔ ۳۱۹ھ مطابق ۹۳۱ء کا واقعہ ہے کہ خلیفہ مقتدر باللہ کے وقت کسی ڈاکٹر نے مریض کا غلط علاج کیا اور وہ مر گیا، خلیفہ نے حکم دیا کہ بغداد کے تمام ڈاکٹروں کا نئے سرے سے امتحان لیا جائے۔ چنانچہ سنان بن ثابت، رئیس الاطباء نے تمام ڈاکٹروں کا نئے سرے سے امتحان لیا۔ اس موقع پر صرف بغداد میں ڈاکٹروں کی تعداد ۸۶۰ سے کچھ اوپر نکلی۔ یہ تعداد ان لوگوں کے علاوہ تھی جو پرانے اور اپنے فن میں معروف و مشہور تھے جو امراء و وزراء اور خلفاء کے خصوصی معالج تھے اور جن کے امتحان کی ضرورت نہ تھی۔

## اسپتالوں میں کتب خانہ علم طب:

یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ہر ہسپتال میں ایک بڑا کتب خانہ ہوتا تھا جس سے طلبہ اور ڈاکٹر دونوں فائدہ اٹھاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ قاہرہ کے "ابنِ طولون ہسپتال" میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابوں پر مشتمل لائبریری تھی۔ اور اس میں علمِ طب کے مختلف شعبوں کی کتابیں تھیں۔

## بلا معاوضہ :

ہر آدمی بسہولت ہسپتال میں داخل ہو سکتا تھا اور کوئی فیس یا معاوضہ نہ لیا جاتا تھا۔ فقیر و امیر، قریب اور بعید، ملکی اور غیر ملکی اور عوام و خواص کے درمیان کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا، ہسپتال کے خارجی حصے میں مریض کا گہرا معائنہ کیا جاتا، اگر مرض خفیف ہوتا تو اسے نسخہ لکھ کر دے دیتے اور وہ ڈسپنسری سے دوا لے کر چلا جاتا، جس کا ہسپتال میں داخلہ ضروری سمجھا جاتا اس کا نام نوٹ کر لیا جاتا، اسے حمام میں بھیجا جاتا، سابقہ کپڑے اُتار کر ایک خاص اسٹور میں جمع کر دیے جاتے اور اسے ہسپتال کے خاص کپڑے دے دیے جاتے۔ اور پھر اسے اس کے مخصوص وارڈ میں پہنچا دیا جاتا۔ اس کے لیے ایک پلنگ مخصوص ہو جاتا جس پر پاک و صاف بستر ہوتا۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا شروع ہو جاتی اور غذا ایسی دی جاتی جو اس کی صحت کے لیے نہایت مفید ہوتی۔ غذا کی مقدار بھی مقرر ہوتی تھی، مریضوں کے لیے درج ذیل چیزیں بطور خوراک استعمال ہوتی تھیں۔ بکری کا گوشت، گائے کا گوشت، مرغی اور دوسرے پرندے۔ مریض کی تندرستی کی علامت یہ تھی کہ وہ ایک صحیح آدمی کے لیے مقرر روٹی ایک سالم مرغی کے ساتھ ایک ہی دفعہ کھا جاتا اور ہضم کر جاتا تو اسے تندرست خیال کیا جاتا۔ جب بیماری کے بعد نقاہت ہوتی تو مریض کو ایسے ہی کمزور لوگوں کے وارڈ میں منتقل کیا جاتا اور وہاں علاج ہوتا رہتا۔ جب اس کا علاج ہر لحاظ سے مکمل ہو جاتا تو اسے ایک نیا لباس دیا جاتا اور اس کے ساتھ اس قدر سرمایہ بھی دیا جاتا جس سے وہ کسب معاش کے قابل ہو جاتا۔ ہسپتال کے تمام کمرے نہایت درجہ صاف ستھرے ہوتے تھے۔ ان میں ہر وقت پانی چلتا رہتا تھا۔ ان کمروں میں اعلیٰ درجے کے فرش بچھے ہوتے تھے۔ ہر ہسپتال میں صفائی کے انسپکٹر مقرر تھے اور اس طرح اکاؤنٹنٹ اور دوسرے افسر بھی مقرر ہوتے تھے۔ اکثر اوقات خلیفۂ وقت خود مریضوں کا معائنہ کرتا اور ان کے معاملات میں دلچسپی لیتا۔

یہ تھا وہ اعلیٰ نظام جو عالم اسلامی کے تمام ہسپتالوں میں رُو بعمل تھا۔ خواہ وہ مشرق

کے ہوں یا مغرب کے۔ بغداد، دمشق، قاہرہ، بیت المقدس، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور اندلس کے تمام ہسپتالوں میں یہی نظام رائج ہیں۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ عالم اسلامی کے چار بڑے شہروں کے چار ہسپتالوں کا خاص طور پر ذکر تفصیل کے ساتھ کریں۔

## ۱۔ عضدی ہسپتال، بغداد :

اسے عضدالدولہ بن بویہ نے ۳۷۱ھ میں تعمیر کیا۔ اپنے وقت کے مشہور ڈاکٹر رازی نے اس کی جائے تعمیر کو اس طرح متعین کیا تھا کہ بغداد کے چار مجوزہ مقامات پر رات کے وقت گوشت کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دیا گیا۔ اور صبح کے وقت جب چاروں ٹکڑوں کا معائنہ کیا گیا تو وہ جگہ جہاں پر رکھا ہوا گوشت کا ٹکڑا خراب نہ ہوا اور سڑا نہ تھا، اس جگہ کو مناسب قرار دے کر وہاں ہسپتال تعمیر ہوا۔ اس ہسپتال پر بہت بڑی رقم خرچ کی گئی اور اس میں کام کرنے کے لیے ۲۴ مشہور ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وہاں لائبریری ڈسپنسری، اسٹور اور مطبخ کا بندوبست کیا گیا۔ ۴۴۹ھ میں خلیفہ قائم بامراللہ نے اس ہسپتال کو نئے سرے سے منظم کیا۔ اس میں ہر قسم کی مشروب دوائیں، جڑی بوٹیاں اور دوسری دوائیں فراہم کیں۔ ایسی دوائیں جو نہایت نادر الوجود تھیں۔ مریضوں کے لیے فرش اور رضائیوں کا بندوبست کیا گیا۔ علاوہ ازیں اچھی خوشبوؤں، برف، خدام، چپڑاسیوں، دربانوں، چوکیداروں اور ہر وقت نگران ڈاکٹروں کا اہتمام کیا۔ وہاں بڑا حمام بنایا اور ایک باغ لگایا جس میں ہر قسم کے پھل اور پھول موجود ہوتے تھے کشتیوں میں کمزور اور نفیر مریضوں کو یہاں منتقل کیا جاتا رہتا اور ڈاکٹر صبح و شام اپنی اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں ان کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

## ۲۔ نوری ہسپتال دمشق :

سلطان عادل، ملک نورالدین شہید نے ۵۴۹ھ مطابق ۱۱۵۴ء میں اس ہسپتال کو اس

رقم سے تعمیر کیا جو اس نے فرنگی بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ سے بطور فدیہ وصول کی تھی اس کی تعمیر کے وقت یہ ہسپتال عالمِ اسلامی کے تمام ہسپتالوں سے اعلیٰ ترین اور خوبصورت ترین ہسپتال تھا۔ اس نے اس ہسپتال میں اُمرا کے داخلہ پر پابندی لگا دی تھی اور اسے فقرا اور مساکین کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہاں اغنیاء کو صرف اس وقت یہاں سے دوا دی جاتی جب وُہ مجبور ہو جاتے، جو مریض بھی جاتا، یہاں اس کو دوا اور مشروبات صرف صبح کے وقت دیئے جاتے تھے۔ ابنِ جبیر سیاح ۵۸۰ھ میں اس ہسپتال میں داخل ہُوا یہاں ڈاکٹر جس شفقت کے ساتھ مریضوں کی دیکھ بھال کرتے تھے، ان کے لیے دوائیں تیار کرتے تھے اور ان کو سہولت فراہم کرتے تھے، اس نے اس کی بیحد تعریف کی ہے۔ یہاں ایک خاص شعبہ دماغی امراض کے مریضوں کے لیے مخصوص تھا۔ جہاں ان مریضوں کو زنجیروں میں باندھ دیا جاتا تھا جو دماغ کے شدید مرض میں مبتلا ہوتے، اور ان کے علاج اور خوراک کا مناسب بندوبست کیا جاتا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ۸۳۱ھ میں کوئی عجمی شخص دمشق آیا جو علم وفضل کے علاوہ ذوقِ سلیم بھی رکھتا تھا، وُہ ہسپتال دیکھنے بھی گیا، وہاں وُہ اطبّاء کی کثرت، مریضوں سے ان کا شغف اور التفات و توجہ، مریضوں کے لیے مختلف قسم کے کھانے اور سہولتیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سہولتوں پر مزید یہ کہ وہاں سامانِ آرائش و تعیش تک بھی موجود تھا۔ اس نے اطبّا کا امتحان لینا چاہا اور اپنے آپ کو مصنوعی طور پر بیمار بنا لیا اور تین دن تک ہسپتال میں داخل رہا۔ تین دن تک مسلسل رئیس الاطبّاء اس کی نبض دیکھتے رہے اور اس کی کمزوری کا پتہ لگاتے رہے۔ لیکن انہوں نے پہلے دن ہی معلوم کر لیا تھا کہ وُہ درحقیقت مریض نہیں ہے وہ محض اطبّاء کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کے کھانے کے لیے پُرتکلّف خوراک تجویز کی، موٹا تازہ مُرغا، حلوہ، مفرح مشروبات اور مختلف قسم کے پھل۔ یہ چیزیں اسے تین دن تک ہسپتال سے ملتی رہیں۔ تین دن کے بعد رئیس الاطبّاء نے اس کے لیے ایک چٹ لکھ کر چھوڑ دی جس کا مضمون یہ تھا:

"ہمارے ہاں صرف تین دن تک مہمان نوازی کا رواج ہے" چنانچہ عجمی نے معلوم کر لیا

کردہ لوگ اس کے ارادے (امتحان) کو سمجھ گئے، اور تین دن تک اس کو ان لوگوں نے بطورِ مہمان مقیم رکھا۔

یہ ہسپتال ۱۳۱۷ھ تک اسی طرح کام کرتا رہا۔ اس کے بعد اسے پردیسیوں کے ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ وہی ہسپتال ہے جہاں آج کل جامعہ سوریہ کا طبیہ کالج چل رہا ہے ہسپتال ختم کر کے وہاں کالج اور مقامی مدرسہ قائم کر دیا گیا۔

## ۳۔ بڑا منصوری ہسپتال :

یہ "بیمارستان قلاوون" کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے کسی امیر کا محل تھا، ملک منصور، سیف الدین قلاوون، نے اسے ۶۸۳ھ مطابق ۱۲۸۴م میں ہسپتال میں تبدیل کر دیا۔ اس کے لیے خاص جائداد وقف کر دی جس سے ایک ہزار درہم سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مسجد، ایک مدرسہ اور یتیموں کے لیے ایک مکتب بھی قائم کیا گیا، اس ہسپتال کے قیام کے اسباب کے متعلق مؤرخین کہتے ہیں کہ جب ۱۲۷۶م میں، امیر قلاوون ظاہر بیبرس کے زمانے میں بطورِ میرِ لشکر، رُوم کے مقابلے کے لیے نکلے تو دمشق میں بیمار ہو گئے، اطباء نے ان کا علاج کیا اور اس میں دوائیں نوری ہسپتال سے لے کر استعمال کی گئیں، وُہ تندرست ہو گئے اور خود جا کر نوری ہسپتال کا معائنہ کیا۔ اس وقت وہ اس ہسپتال کو دیکھ کر بیحد متاثر ہوئے اور منت مانی کہ اگر اللہ نے ان کو برسرِ اقتدار کیا تو وُہ ایسا ہی ہسپتال بنائیں گے۔ جب وُہ بادشاہ ہُوئے، تو انھوں نے اس مکان کو منتخب کیا اور اسے خرید کر ہسپتال میں تبدیل کر دیا۔ ہسپتال اپنی تنظیم اور ترتیب کے لحاظ سے پُوری دُنیا میں ایک واحد نمونہ تھا۔ صبح کے وقت تمام لوگ مالک و غلام، بادشاہ و رعیت، مرد اور عورتیں سب کے سب اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے، جو مریض یہاں سے تندرست ہو کر نکلتا تھا اسے پُورا لباس دیا جاتا تھا، جو مر جاتا تھا اس کی تجہیز و تکفین بھی ہسپتال کے ذمہ ہوتی تھی۔ طب کی مختلف شاخوں کے ڈاکٹر علیحدہ علیحدہ مقرر کیے گئے تھے۔ مریضوں کے کپڑے دھونے، ان کو غسل کرانے، کمروں اور بستروں کی صفائی اور دُوسری سہولتوں کے

لیے خدام اور نرس مقرر تھے۔ اس طرح ہر مریض کے لیے دو محافظ اور نگران ہوتے جو اس کی خدمت کرتے۔ ہر مریض کو علیحدہ چارپائی اور بستر دیا جاتا تھا۔ ہر قسم کے مریضوں کے لیے علیحدہ علیحدہ وارڈ تھے۔ طبی مباحث اور لیکچروں کے لیے مقامات متعین تھے۔ جہاں پرنسپل طلبہ کو طبی موضوعات پر درس دیا کرتا تھا۔ اس ہسپتال کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ یہاں صرف داخل شدہ مریضوں کی دیکھ بھال ہی نہ کی جاتی تھی بلکہ ان مریضوں کی دیکھ بھال بھی کی جاتی تھی جو اپنے گھروں ہی میں رہنا پسند کرتے تھے۔ وہاں ہی انہیں غذائیں اور دوائیں فراہم کی جاتیں۔ یہ ہسپتال اس طرح کام کرتا رہا۔ اس ہسپتال کے ایک آنکھوں کے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس ہسپتال میں روزانہ داخلی اور خارجی مریضوں کو ملا کر چار ہزار سے زیادہ افراد کا معالجہ کیا جاتا تھا جو بھی تندرست ہو جاتا اسے کپڑے اور اس قدر نقدی دی جاتی تھی کہ وہ باہر آتے ہی دوسروں کا محتاج نہ ہو جائے۔

اس ہسپتال کے وقف کی دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر ایک مریض کو اس کا کھانا مخصوص اور علیحدہ برتن میں دیا جاتا تھا جس کو کوئی دوسرا مریض استعمال نہ کر سکتا تھا اور یہ لازمی تھا کہ یہ کھانا اسے ڈھانپ کر دیا جائے نیز اس ہسپتال کی ایک عجیب ترین خصوصیت یہ تھی کہ یہاں بے خوابی کے مریضوں کے لیے ایک علیحدہ جگہ تھی، جہاں خوش کن موسیقی سے اُن کی تواضع کی جاتی، انہیں دلچسپ قصے سنائے جاتے اور یہ کام ایک مہارت رکھنے والے قصہ گو کے سپرد ہوتا۔ ان میں سے کمزور مریضوں کو ہنسا دینے والی باتوں کی ایکٹنگ کر کے خوش کیا جاتا، نیز ان کے سامنے دیہاتی ناچ پیش کیا جاتا جس سے دیہاتی لوگ خوب متعارف ہیں۔ اسپتال سے قریب کے مؤذنوں کو حکم تھا کہ وہ صبح سے تقریباً دو گھنٹے قبل ہی اذان دے دیا کریں اور خوش الحانی سے اشعار پڑھیں تاکہ مریض خوش ہوں اور تکلیف کم محسوس کریں، کیونکہ بے خوابی اور طویل رات ان کے لیے باعثِ تکلیف بنتی تھی، اس ہسپتال کی یہی حالت تھی جبکہ ۱۷۹۸ء میں فرانسیسی مصر میں داخل ہوئے اور اسے فرانسیسی علماء نے بچشم سر دیکھا اور اس کے متعلق تفصیلات اپنی کتابوں میں درج کیں۔

خدا کی قسم یہ انسانیت کا وُہ اُونچا معیار ہے جہاں تک جدید دُنیا اب آکر ہمارے زمانے میں بمشکل پہنچ سکی ہے ——— اس ضمن میں مجھے وُہ بات یاد آئی جو میں نے طرابلس میں سُنی تھی کہ وہاں ایک ایسا عجیب وقف ہے جس کی آمدنی ایسے دو اشخاص کے لیے مخصوص ہے جو روزانہ ہسپتالوں میں جائیں اور جو بیماروں کے پاس جا کر سرگوشی کے انداز میں باہمی اس طرح باتیں کریں کہ مریض سُن لے اور اس سے وُہ یہ اثر لے کہ اب اس کی حالت بہت اچھی ہو رہی ہے، اس کا چہرہ سُرخ معلوم ہوتا ہے اور آنکھوں میں چمک ہے۔

## منصوری اسپتال کا وقف نامہ:

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم الشان ہسپتال کے وقف نامے کی پوری عبارت قارئین کے سامنے پیش کر دی جائے جیسا کہ "تاریخ البیمارستانات فی الاسلام" کے مصنف نے لکھا ہے:

"بلند عزائم کو جن اعلیٰ ترین نیکیوں کے اجر کے مواقع ملتے ہیں اور جن کا نامہ اور اچھائیوں کے بہت زیادہ فوائد سمجھے جا سکتے ہیں، جس قابلِ قدر بھلائی کا بے انتہا ثواب حاصل کرنے کے لیے کوئی سونے والا جاگ سکتا ہے اور جس افضل ترین بھلائیوں کی جانب کوئی متوجہ ہونے والا متوجہ ہو سکتا ہے یا کوئی کھڑا ہونے والا اُٹھ سکتا ہے تو وُہ وہی بھلائیاں ہیں جن کے نتائج دائمی بھلائی کی شکل میں ہوں اور اس سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مسرتیں حاصل ہوں اور ان بھلائیوں کا ثواب آباؤ اجداد کو برابر ملتا رہے اور یہ کہ دُور رس آرزوؤں کے ساتھ ان کی بنیاد دین تقویٰ کی پختہ اساس پر رکھی گئی ہوں ——— ظاہر ہے کہ ایسی بھلائیاں اوقاف ہی ہیں جن کی بھلائی عام ہوتی ہے، جن کا اجر اور ثواب ہمیشہ قائم رہتا ہے، جن کے فوائد بے اندازہ اور اُخروی اجر بہت قیمتی ہے۔ پس درحقیقت یہی نیکیاں ہی

جنّت میں اور بھی ایک ایسی قربانی ہے جس سے رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ وُہ صدقہ ہے جو خوبصورت حوُروں کا مہر ہے۔ یہ خیرات موتی اور مرجان ہی نہیں بلکہ اجرِ اُخروی کے سمندر بھی ہیں ـــــــ ذرا یہ خیال کیا جائے کہ ایک بیکس مریض کے دل میں کس قدر خوشی دوڑ اُٹھتی ہے، ٹوٹے ہوُئے دل کو کس طرح سہارا ملتا ہے؟ اور اسے پناہ دے کر اور علاج کر کے کس طرح بے نیاز کر دیا جاتا ہے؟ غرض اس کا ثواب اس قدر زیادہ ہے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ وُہ آدمی بڑا خوش قسمت ہے جس نے اپنے مولا غفور و رحیم کے ساتھ ایسا معاملہ کیا۔ اور آمدنی اور خرچ میں اس نے اللہ سے ایسا معاملہ کیا جو اس کے ظاہر اور باطن دونوں سے واقف ہے اور اپنی طاقت و استطاعت کے مطابق اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دیا اور نیکی کے میدان میں سب سے بازی لے جانے کی فرصت کو غنیمت جانا اور ایک بیمار مسلمان کو اس کے علاج و معالجے میں مدد دی اور اس کے رنج و اَلم کو دُور کیا جس کے صلہ میں کل اسے خالقِ کائنات کے دربار میں عذاب سے نجات ہو گی اور اس سے بڑھ کر یہ اُمید بھی کہ اللہ کے ہاں اسے مزید بلند مرتبے نصیب ہوں گے اور اسے اللہ کا قرب نصیب ہو گا، جہاں اسے کسی ظلم اور زیادتی کا خوف نہ ہو گا۔ غرض یہ ایک ایسی نیکی ہے جو اس کے تمام گناہوں کی معافی کا سبب ہو گی، اور اسے کوئی غم نہ رہے گا۔"

چنانچہ ان درجات اور ان کے حصول کی رغبت کی بنا پر ملک عادل منصور نے منصُوری ہسپتال کے وقف کا حکم دیا ........ (یہاں وقف نامہ اوقاف ان کی جگہ اور حالات کا ذکر کرتا ہے)

"یہ ہسپتال تمام اُمرا و غربا اور مرد اور عورتوں کے علاج کے لیے وقف ہے خواہ وُہ قاہرہ میں ہوں یا اس کے ارد گرد مصری علاقے سے تعلق رکھتے ہوں مقامی باشندے ہوں یا دُوسرے علاقوں سے آئے ہوُئے ہوں اور جس

رنگ ونسل سے بھی تعلق رکھتے ہوں ...... وہ جس مرض و مصیبت میں بھی مبتلا ہوں، خواہ جسمانی امراض کے شکار ہوں یا رُوحانی اور اعصابی، اور وُہ امراض کم ہوں یا زیادہ اور ایک جیسے ہوں یا مختلف ہوں، اور وُہ خواہ ظاہری ہوں یا باطنی، یا دماغی امراض میں مبتلا ہوں جن کی اصلاح بڑے اہم مقاصد میں سے ہے اور جن کا علاج از حد ضروری اور اہم ہے اور جنہیں کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان سے اعراض و انحراف کیا جا سکتا ہے۔ یا ان کے کوئی اور عارضہ ہو جس کی اصلاح انسان کے لیے ضروری ہے ......... یہاں علاج دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے کیا جائے گا جو ڈاکٹروں کے ہاں معروف ہیں اور یہاں ڈاکٹر اپنے طبّی علوم اور پریکٹس میں مشغول رہ کر مریضوں کے لیے فائدہ مند ہوں گے۔

یہاں عوام فرداً اور مجتمعاً، بوڑھے اور بچے، نابالغ، لڑکے اور لڑکیاں سب داخل ہو سکیں گے۔ نادار مریض خواہ مرد ہوں یا عورتیں مکمل شفایابی تک ہسپتال کے اندر داخل رہیں گے یہاں علاج کے لیے جو سہولتیں بھی ہوں ان پر صرف کی جائیں گی اور تمام لوگوں میں ضروریات کی تقسیم ہو گی خواہ اجنبی ہوں یا رشتہ دار، مقامی ہوں یا مسافر ہوں، قوی ہوں یا ضعیف، عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے، اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ، امیر ہوں یا غریب، افسر ہوں یا ماتحت، اندھے ہوں یا آنکھوں والے، افضل تر ہوں یا کمتر، صاحبِ شہرت ہوں یا گمنام، عالی شان ہوں یا بے قدر، سرمایہ دار ہوں یا افلاس زدہ اور مالک ہوں یا مملوک، یہ علاج بلا معاوضہ ہو گا اور اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ علاج محض اللہ کے لیے اور اجرِ اُخروی کے حصول کی غرض سے اور اس کے احسانِ عام کی وجہ سے ہو گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مریض کی بھلائی پر خرچ کیا جائے۔ اور ان لوگوں پر جو مریضوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر، آنکھوں کے ڈاکٹر، جرّاح، عطّار، بہترین اور لذیذ کھانے

تیار کرنے والے، معجون بنانے والے، آنکھوں کی دوائیں بنانے والے، مفرد مسہل اور مرکب مسہل بنانے والے، منتظم، چپڑاسی، خزانچی، امین، متولی اور ان کے علاوہ وہ تمام کارکن جو عام طور پر ہسپتالوں میں کام کرتے ہیں، نیز ان چیزوں پر جو مریض کے علاج کے سلسلہ میں ضروری ہوتی ہیں، نیز مریضوں کے لیے ضروری کھانے پینے کی چیزیں، آنکھوں کے استعمال کی چیزیں، دیگچے وغیرہ اور معجون، مختلف قسم کے مرہم، تیل، مشروبات، مفرد و مرکب دوائیں، فرش اور بستر، برتن اور ایسے آلات جو اس سلسلہ میں کام آتے ہیں۔ ناظم کو اختیار ہوگا کہ وہ اس وقف کی آمدنی سے مریض کی عمومی ضروریات پر بھی خرچ کرے مثلاً روزانہ خوشبو جلانے کے اخراجات، ان کے کھانے کے لیے رکابیاں، پینے کے لیے شیشے کے پیالے اور کانچ کے گلاس، کوزے اور مٹی کی صراحیاں، مٹی کے دیے اور ان میں جلانے کے لیے تیل اور پانیں سے پینے کا پانی فراہم کرنے کے لیے، جو کھانے اور پینے میں استعمال ہوتا ہے، مریض کے کھانے کے ڈھانپنے پر جب انہیں کھانا دیا جائے گرمی میں کھجور کے پتوں کے بنے ہوئے پنکھوں کی خریداری ہو، ان سب چیزوں پر ناظم اوقاف اسی وقف کی آمدنی سے خرچ کرے گا اور خرچ مسرفانہ نہ ہوا اور نہ کوئی چیز خواہ مخواہ تلف کی جائے، قدر ضرورت پر زیادتی نہ کی جائے، تمام اخراجات حقیقی ضرورت کے دائرہ کے اندر اندر کیے جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اجر اور ثواب حاصل کیا جا سکے۔

ناظم اوقاف، اسی وقف کی آمدنی سے دو آدمی مقرر کرے گا جو مسلمان امین، دیانت دار ہوں۔ ایک اشیاء کی تقسیم کے مرکز کا ذمہ دار ہو، جو پینے کی دوائیں، آنکھوں کی دوائیں، جڑی بوٹیاں، معجون، تیل اور فتیلے تقسیم کرے اور دوسری چیزیں جن کی متعلقہ افسر نے اجازت دے دی ہو۔ دوسرے کا کام یہ ہوگا کہ وہ ہر صبح و شام مریض کو خواہ مرد ہے یا عورت اس کے

مخصوص پیالے تقسیم کرے اور انہیں وُہ دوائیں پلائے جو ان کے لیے تجویز ہُوئی ہوں، اس کی ڈیوٹی ہوگی کہ وُہ مطبخ کی نگرانی کرے۔ جہاں مریضوں کے لیے مقوی کھانے، مُرغ، چُوزے اور گوشت وغیرہ تیار ہوگا۔ اس کا فرض ہوگا کہ وُہ ہر مریض کے لیے اس کا مجوزہ کھانا، ایک علیحدہ اور مخصوص تھالی میں اس کے لیے پیش کرے اور اس میں اس کے ساتھ کوئی دُوسرا مریض شریک نہ ہوگا، نیز اس کا فرض ہوگا کہ وُہ کھانا ڈھانپ کر تمام مریضوں تک پہنچائے۔ اور اس وقت تک کام کرتا رہے جب تک تمام مریضوں کو ان کا پُورا مجوزہ کھانا مل نہیں جاتا۔ صبح و شام اس کی یہ ڈیوٹی ہوگی ......

نیز ناظمِ اوقاف کو اختیار ہوگا کہ وُہ وقف کی آمدنی سے ہسپتال کے لیے عام ڈاکٹر، آنکھوں کے ڈاکٹر اور جرّاح، معروف و معقول اُجرت پر رکھے اور ظروف و احوال اور مریضوں کی ضروریات کے مطابق تنخواہیں متعیّن کرے وُہ تعداد اور مقدار تنخواہ کے بارے میں مختار ہے لیکن اس میں افراط و تفریط نہ کرے بلکہ ایک معتدل رویّہ اختیار کرے۔ عملے کا یہ فرض ہوگا کہ وُہ ہر وقت اس ہسپتال کے بیماروں اور مصیبت زدوں کی دیکھ بھال کریں ڈیوٹی کے متعلق وُہ مختار ہیں چاہیں تو بیک وقت ڈیوٹی پر حاضر ہوں اور چاہیں تو باری مقرر کر لیں اوقات کار خود باہمی مشورہ سے ناظمِ اوقاف کی اجازت سے مقرر کریں۔ ان کا فرض ہے کہ ہر مریض سے اس کا حال دریافت کریں۔ اور نوٹ کریں کہ اس کا مرض کم ہُوا ہے یا زیادہ اور ناظمِ اوقاف کے احکام کے مطابق ہر مریض کی شیٹ پر روزانہ اس کے لیے دوا اور غذا تجویز کریں اور اس کے مطابق عمل ہو۔ عملے کو چاہیے کہ وُہ ہسپتال میں رات کو رہے خواہ سب کا سب عملہ رہے یا وُہ باہمی ڈیوٹیاں تقسیم کریں۔ آنکھوں کے ڈاکٹر روزانہ نشست رکھیں اور آنکھوں کے مریضوں کا علاج کریں، ہر دن صبح کے وقت، باہر سے جو آنکھ کا مریض معائنہ کرانے

اور دوا لینے کی غرض سے آئے اسے بغیر علاج کے واپس لوٹانے کی اجازت نہیں ہے، وُہ لازماً اس کا علاج کریں اور اس سے بڑی نرمی سے پیش آئیں جن مریضوں کی آنکھیں خراب ہو گئی ہوں ان کے ساتھ نرمی ہونی چاہیے۔ اگر آنکھوں کے اندر زخم ہو گئے ہوں تو معالج کو چاہیے کہ وُہ سرجن سے مشورہ کرے، اگر وُہ ضرورت سمجھتا ہے تو مریض کو سرجن کے پاس اپنے ساتھ لے جائے، اور اسے اکیلا نہ چھوڑے۔ اس کے بعد بھی ڈاکٹر شفایابی تک مریض کی نگرانی کرتا ہے ........ ناظمِ اوقاف کو چاہیے کہ وُہ اس وقف کی آمدنی سے ایک شیخ الطب مقرر کرے جو طبی امور و مسائل پر ہر وقت تحقیقات کرتا رہے۔ یہ ماہر بڑے

دارالمشورہ ہیں بیٹھیں جو ان کے لیے

مذکورہ وقف نامہ میں متعین کیا گیا ہے۔ اس ماہر کا کام یہ ہوگا کہ وُہ مختلف طبی معاملات پر تحقیقات کرے۔ ان کے لیے اوقات ناظمِ اوقاف مقرر کریں گے جس قدر وقت بھی وُہ اس کام کے لیے ضروری سمجھتا ہو..... لیکن یاد رہے کہ ہسپتال کے عملہ کی تعداد مقررہ اسامیوں کے اندر اندر ہونا چاہیے۔ ناظمِ وقف اس وقف کی آمدنی سے ہسپتال میں متعینہ کارکنوں اور خادموں، مردوں اور عورتوں کو مناسب اُجرت دے۔ یہ اُجرت ان کے کام کی نوعیت کے مطابق ہو۔ ان خدّام کو یہ اُجرت اس لیے دی جائے کہ اس ہسپتال میں داخل بیمار مرد اور عورتوں کی خدمت کرنا ان کا فرض ہے نیز یہ کہ وُہ ان کی جگہ صاف ستھری رکھیں، ان کے کپڑے دھوئیں اور جس قدر سہولتیں اور آسائشیں ہسپتال کی جانب سے ان کے لیے مہیا کی گئی ہیں، ان سے دریغ نہ کریں۔ یہ سہولتیں بھی احوال و ظروف کے لحاظ سے موزوں اور مناسب ہونی چاہئیں........ ناظمِ وقف کا فرض ہے کہ وُہ اس ہسپتال کے مرد یا عورت مریضوں میں سے مرنے والوں کی

تجہیز و تکفین کا بندوبست بھی کرے۔ ان کو غسل دے اور حنوط لگانے کے اخراجات ادا کرے، قبر کھودنے کی اُجرت دے اور سنت نبوی کے مطابق باعزت طور پر دفنانے کا بندوبست کرے۔ جو آدمی اپنے گھر میں بیمار رہو اور لاچار ہو تو ناظمِ وقف کو چاہیے کہ اس ہسپتال کی جس دوا، شربت یا معجون کی اسے ضرورت ہو وہ اس کے گھر پہنچا دے، لیکن یہ اس طرح سے ہو کہ ہسپتال کے اندر مریضوں کی ضروریات میں کمی واقع نہ ہو، اگر ایسا کوئی بیرونی مریض اپنے گھر میں مر جاتا ہے تو ناظر، اس کی تجہیز تکفین، غسل دینے، قبر کھودنے اور قبرستان تک پہنچانے کی اُجرت دے جو اہلِ میت کے شایانِ شان ہو۔ جو لوگ ہسپتال میں ہوں اور بفضلِ خدا تندرست ہو جائیں تو ناظم کو چاہیے کہ اسے عام مروجہ اوسط درجے کا لباس فراہم کرے، جو اس کے حسبِ حال ہو، اس مد میں وقف کا ناظم اتنا زیادہ نہیں خرچ کر سکتا جس سے ہسپتال کی اندرونی ضروریات کے متأثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ بہر حال یہ کام اس کی صوابدید پر چھوڑا جاتا ہے ........ اس وقف کے ناظم کا فرض ہے کہ وُہ ظاہری اور پوشیدہ دونوں حالات سے ڈرے۔ اور کسی اُونچے مرتبے والے کے ساتھ کسی نچلے طبقہ کے آدمی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر سلوک نہ کرے[1] نہ ملکی باشندے کو غیر ملکی پر ترجیح دے بلکہ خرچ میں زیادہ ثواب اور زیادہ تقرب الی اللہ کا لحاظ رکھے جو رب الارباب ہے۔"

---

[1]: تہذیبِ جدید کے فرزندوں کو اس فقرے پر غور کرنا چاہیے جن کے یہاں ہسپتالوں میں آج بھی آفیسر وارڈ موجود ہیں اور پھر ہسپتال تو تجارت گاہ بنے ہوئے ہیں۔ جہاں ایک بیکس کے لیے بہر حال کچھ نہیں ہے۔

(مترجم)

## ۴۔ مراکش کا ہسپتال :

اس کو سلطان منصورؒ ابو یوسف نے تعمیر کرایا، جو مغرب کے موحدین کے سلسلہ کے ایک نامور فرمانروا تھے، مراکش کے معتدل ترین مقامات میں سے ایک وسیع میدان اس کے لیے منتخب کیا گیا، معماروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس ہسپتال کو ممکن حد تک خوبصورت ترین ڈیزائن کے مطابق تیار کریں اور حکم دیا کہ اس ہسپتال میں ہر قسم کے پھل دار، خوشبودار اور دوسرے درخت لگائے جائیں۔ چنانچہ اس ہسپتال کے تمام مکانات اور کمروں سے پانی کی نہریں گذاری گئیں، چار مخصوص حوض بنائے گئے جن میں سے ایک کے درمیان سفید سنگِ مرمر لگایا گیا، ہسپتال کے لیے نفیس بستر تیار کیے گئے جو اُون، کتان، ریشم اور چمڑے سے تیار کیے گئے تھے۔ اس قدر خوبصورت کہ جن کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ ہسپتال کے اندر دواسازی کا مرکز بنایا گیا جس میں مختلف قسم کے شربت، روغنیات آنکھوں کی دوائیں اور دُوسرے نسخے تیار کیے جاتے تھے۔ مریضوں کے لیے گرمیوں اور سردیوں میں رات اور دن کے علیحدہ علیحدہ کپڑے تیار کیے گئے، جب مریض شفایاب ہو جاتا تھا تو اگر وہ غریب ہوتا تو اسے ڈسچارج کرتے وقت ایک معتد بہ سرمایہ دیا جاتا تھا جس سے وہ کاروبار کرنے کے اہل ہو جاتا۔ اگر وہ مالدار بھی ہوتا تب بھی اس کی رقم اسے دے دی جاتی۔ یہ ہسپتال صرف فقراء کے لیے ہی مخصوص نہ تھا بلکہ اغنیاء بھی اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے، بلکہ مراکش کے جس حصہ میں بھی کوئی اجنبی نادار بیمار ہو جاتا اس کو لا کر اس ہسپتال میں داخل کر دیا جاتا۔ یا تو وہ تندرست ہو کر نکلتا یا مر جاتا۔ سلطان بذاتِ خود ہر جمعہ کو ہسپتال جاتے اور مریضوں کے حالات اور ڈاکٹروں کی کارکردگی اور مریضوں سے ڈاکٹر اور نرسوں کے سلوک کے متعلق معلومات حاصل کرتے اور انتظامات کرتے۔

## ایک جرمن مستشرق کا رشک :

الغرض یہ ہیں صرف چار نمونے ان سینکڑوں ہسپتالوں میں سے، جو اس وقت

عالمِ اسلامی میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہُوئے تھے اور یہ اس وقت تھے جب کہ یورپ جہالت کے تہ بتہ اندھیروں میں سرگرداں تھا۔ اور ان ہسپتالوں، ان کی باریکی، ان کی صفائی اور ان کے اندر کارفرما انسانیت کی بلندترین روح سے بالکل دُور اور جاہل اور ناآشنا تھا۔ ذرا آپ مشہور جرمن مستشرق ماکس مایرہوف کی بھی سُنیں۔ وُہ اس وقت کے یورپین ہسپتالوں کے متعلق کیا کہتا ہے جبکہ ہمارے ہسپتالوں کی حالت مذکورہ بالا تھی۔ ڈاکٹر مارکس کہتے ہیں:

"عربی ہسپتال اور گذشتہ زمانہ کے اسلامی ممالک کا نظام ہمیں ایک ایسا سبق دے رہا ہے جو ہمارے لیے نہایت سخت ناگوار اور کڑوا ہے اور ہم اس کی صحیح قدر اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ہم اس نظام کا اس وقت کے یورپین ہسپتالوں کے نظام سے دقیق مقابلہ و موازنہ نہ کرلیں۔"

## پیرس کے ایک بڑے اسپتال کی حالتِ زار:

آج سے قریبًا تین سو سال قبل بلکہ اس سے بھی کم عرصہ قبل تک یورپ ہسپتال کے مفہوم تک سے بھی واقف نہ تھا بلکہ اگر ہم کہیں کہ ۱۷۱۰ء تک ان کی یہ حالت تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مریضوں کا علاج یا اپنے گھروں پر کیا جاتا تھا، یا دارالغرباء میں ہوتا تھا۔ اس سے قبل یورپ کے ہسپتال عبارت تھے، دارالمساکین سے، جن میں خواہ بیمار ہوں یا نہ ہوں وُہ لوگ قیام پذیر ہوتے جن کا کوئی گھر نہ ہوتا یا معذور لوگ خواہ بیمار ہوں یا نہ ہوں۔ یورپ کے ہسپتالوں یا دارالمساکین کی بہترین مثال پیرس کا "اوتیل دیو" ہو سکتا ہے، جسے اپنے زمانے کا سب سے بڑا ہسپتال کہا جاتا تھا۔ ماکسی ٹورڈ اور ٹینوں دونوں نے درجِ ذیل الفاظ میں اس ہسپتال کے حالات منضبط کیے ہیں:

"اس ہسپتال میں ۱۲۰۰ بستر ہیں، جن میں ۴۸۶ بستر ایک ایک مریض کے لیے مخصوص ہیں۔ باقی بستر ....... جن کی چوڑائی پانچ قدم سے زیادہ نہ ہوتی ....... عام طور پر تین سے لے کر چھ مریضوں کے لیے ہوتے

تھے، عمارت کے بڑے کمرے بدبُودار، مرطوب اور ہمیشہ تاریک رہنے اور بغیر ہوا دار کھڑکیوں اور روشندانوں کے تھے۔ جن میں ہر وقت قریباً آٹھ سو سے زیادہ مریض، زمین پر پڑے رہتے تھے، اور جگہ اس قدر تنگ تھی کہ وُہ ایک دُوسرے کے اُوپر، بُری طرح لیٹے ہوتے تھے۔ یہ کھلی زمین پر ہویا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر، جن کی حالت دیکھ کر انسان کو رحم آجاتا ہے، ایک متوسط درجہ کی چارپائی پر پانچ اور چھ مریض بیک وقت ایک دُوسرے سے ملے ہُوئے پڑے ہوتے تھے۔ ایک کے پاؤں دُوسرے کے سر پر، بچے بوڑھوں کے پاس، عورتیں مردوں کے پہلو میں، اگرچہ عقل اس کی تصدیق نہیں کرتی، لیکن یہ حقیقت ہے ...... ایک طرف عورت ایامِ ماہواری میں ہے، ساتھ ہی ایک بچہ ٹائیفائڈ کا مریض اور تشنج کی حالت میں پڑا ہے اور بخار سے پھنک رہا ہے اور یہ دونوں بھی ایک ایسے مریض کے پاس پڑے ہیں جو جلدی امراض کا شکار رہے اور وُہ اپنی گلی سڑی جلد کو خون آلُود ناخنوں سے کُھرچ رہا ہے جس کے سبب پیپ بستر پر بہہ رہی ہے۔ ان مریضوں کو جتنا خراب کھانا ملتا ہے، اس کی کیفیت کے اظہار کے لیے بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس حد تک گھٹیا ہونے کا تصور کیا جانا ممکن ہے، وُہ کھانا مریضوں کو دیا جاتا ہے۔ اور وُہ بھی نہایت قلیل مقدار میں اور غیر منظم اور طویل وقفوں کے بعد دیا جاتا ہے۔ اس ہسپتال کی نگران راہب عورتیں، اہلِ ثروت مریضوں کو زیادہ ترجیح دیتی ہیں اور دُوسروں کے حقوق پامال کر کے انہیں شراب پلاتی ہیں، بعض اوقات ایسے مریضوں کو باہر سے بطورِ خیرات آئے ہُوئے حلوہ اور مرغن کھانا کھلا دیتیں جنہیں ایسی غذا سے پرہیز ضروری ہوتا۔ چنانچہ کچھ تو بدہضمی اور ہیضہ سے مر جاتے اور کچھ بھوک سے مر جاتے۔ اس ہسپتال کے دروازے ہر وقت کُھلے رہتے تھے۔ ہر کوئی ہر وقت

داخل و خارج ہو سکتا تھا۔ اس طرح بیماری پھیلنے کا اندیشہ رہتا تھا۔ بول و براز کے ڈھیر اور گندی ہوا، اس پر مستزاد یہ کھانے کا انتظام محض خیرات پر تھا۔ اگر اہلِ ثروت باہر سے کھانے پکا کر نہ بھیجتے تو مریض بھوک سے مر جاتے۔ جیسا کہ بعض اوقات بدہضمی اور زیادہ شراب نوشی سے مر جاتے، بستروں میں کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض بکثرت گردش کرتے۔ کمروں کی فضا اس قدر گندی اور ناقابلِ برداشت ہوتی تھی کہ خادم اور نرسیں اپنی ناکوں کو سرکے سے تر کیے ہوئے، کپڑوں سے ڈھانپ کر بھی بمشکل اندر جا سکتے اگر کوئی مریض مر جاتا تو اس کی لاش عام چارپائی سے کم از کم چوبیس گھنٹے تک نہ اٹھائی جاتی، بعض اوقات لاش پھول جاتی اور سڑ جاتی اور وہ اس چارپائی پر دوسرے مریض کے پاس ہی پڑی رہتی قریب ہوتا کہ اس سے اس غریب کا دم نکل جائے۔"

یہ ہے مختصر سا موازنہ جو تہذیبِ اسلامی کے عروج کے دور میں ہمارے ہسپتالوں اور مغربی ممالک کے ہسپتالوں کے فرق کو ظاہر کرتا ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مغربی اقوام علمی انحطاط اور ہسپتالوں کے اصول و قواعد سے جہالت کے کس قدر گہرے گڑھے میں پڑی ہوئی تھیں، ان کو اصولِ صحت کا علم تک نہ تھا۔ بلکہ وہ صحت کے عام بدیہی اصولوں تک سے ناواقف تھے، جن کے لیے کسی خاص علم کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی، مشہور حکیم اُسامہ بن منقذ نے اپنی کتاب الاعتبار میں دو ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے مغربی عیسائیوں کے طبی مبلغ علم کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"انگریزوں کی طبی امور کی بوالعجبیوں میں سے ایک واقعہ ہے کہ صاحب منیطرہ نے چچا کو لکھا کہ ہمیں ایک ایسا ڈاکٹر چاہیے جو میرے ساتھیوں کا علاج کرے۔ میرے چچا نے ان کے پاس ثابت نامی ایک عیسائی ڈاکٹر بھیج دیا وہ دس دنوں کے اندر ہی واپس آگیا، ہم نے اس سے پوچھا "کیا تم نے اس قدر

جلدی مریضوں کا علاج کر لیا" اس نے کہا " وہ میرے پاس ایک ایسا فوجی لائے تھے جس کے پاؤں میں ایک پھوڑا تھا جب اس کے لیے لخیمہ (ایک درخت) کی پٹی تیار کی اور وہ پھٹ گیا۔ نیز ایک عورت تھی جس کو جلد کی خشکی سے خارش کی تکلیف تھی، میں نے اس کو پرہیز کرایا اور اس کے مزاج کو مرطوب بنایا لیکن اچانک کوئی انگریز ڈاکٹر وہاں پہنچا اس نے ان لوگوں سے میرے متعلق کہا کہ یہ کیا جانتا ہے جو ان کا علاج کرے گا۔ پھر فوجی سے کہا کہ "بتاؤ تم دو پاؤں کے ساتھ موت چاہتے ہو یا ایک ٹانگ کے ساتھ زندگی؟" اس نے کہا کہ میں ایک پاؤں کے ساتھ زندگی چاہتا ہوں، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ایک تگڑا فوجی اور تیز کلہاڑا لایا جائے، یہ دونوں حاضر کیے گئے۔ اور میں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس کے پاؤں کو لکڑی کے موٹے تختے پر سیدھا کیا اور قوی ہیکل فوجی سے کہا "اس کے پاؤں کو کلہاڑے کی ایک ضرب سے کاٹ پھینکو" اس نے ایک وار کیا۔ اور میں یہ تماشہ دیکھ رہا تھا کہ ایک ضرب سے اس کی ٹانگ نہ کٹ سکی۔ چنانچہ اس نے زور سے دوسرا وار کیا۔ ٹانگ کے اندر سے گودا باہر نکل آیا اور بہنے لگا۔ اور مریض فی الفور فوت ہو گیا"

اس کے بعد مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح اس نے عورت پر اُبلتا پانی ڈالا اور وہ بیچاری بھی فی الفور اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئی۔

## نتائجِ موازنہ :

۱- میں اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ناظرین کو ان نتائج کی طرف متوجہ کرتا ہوں جو اس موازنہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ کہ تہذیبِ اسلامی نے مغربی تہذیب کے مقابلہ میں قریباً نو سو سال پہلے ہسپتالوں کے میدان میں اعلیٰ ترین معیار قائم کیا۔

۲- یہ کہ ہمارے ہسپتال ایسے اعلیٰ انسانی جذبات، انسانیت پر رحم و انصاف کے

اصولوں کے تحت قائم کیے تھے، جن کی مثال نہ قدیم تاریخ میں ملتی ہے اور نہ یہ جذبات اور اصول آج تک مغربی ممالک میں پائے جاتے ہیں۔

۳۔ یہ کہ مسلمان وہ پہلی قوم ہے جس نے دریافت کیا کہ خوش آوازی، مزاحیہ ادب اور نفسیاتی طور پر مریض کو یہ تاثر دینا کہ وہ رُو بصحت ہے، بیماری کے علاج میں نہایت مفید ہیں۔

۴۔ یہ کہ اجتماعی کفالت میں ہم نے اس قدر اُونچا ریکارڈ قائم کیا ہے جہاں تک مغربی ممالک آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی نہیں پہنچ سکے۔ مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا اور ان کی رہائش وخوراک کا بندوبست بھی بالکل مفت ہوتا۔ بلکہ فراغت کے بعد فقراء ومساکین مریضوں کو اس قدر سرمایہ بھی دیا جاتا جس سے وہ اپنی زندگی کی گاڑی کو بسہولت چلا سکتے۔

۵۔ یہ ہے انسان دوستی کا وہ اُونچا مقام جہاں تک ہم پہنچے جبکہ مہذب دُنیا میں قیادت کا جھنڈا ہمارے ہاتھ میں تھا۔ کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ آج ہم کس مقام پہ کھڑے ہیں اور یہ مغربی ممالک آج کہاں ہیں؟

# گیارھواں باب

# خاص اور عام کُتب خانے

اسلامی تہذیب میں، رفاہِ عامہ کے اداروں کے موضوع پر گفتگو کے ساتھ ساتھ لائبریریوں کا تذکرہ بھی نامناسب نہ ہوگا۔ تعلیم کے لیے بے شمار مدارس تھے اور ان کے علاوہ بھی علمی ادارے تھے، جن پر علماء، اُمراء اور بااثر لوگ خرچ کرتے تھے، خصوصاً اس دَور میں جبکہ نشر و اشاعت اور طباعت کی موجودہ سہولتیں مہیا نہ تھیں اور کتابیں مخصوص لوگوں کے ذریعہ ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں اور ایک کتاب پر اس قدر وقت اور سرمایہ خرچ ہُوا کرتا تھا کہ ایک طالب علم یا تنگ دست عالمِ دین اس کے خریدنے سے معذور رہتا۔ رہا یہ کہ پُوری لائبریری یا کتب خانہ فراہم کیا جائے، جو ایک فن کی کتابوں پر مشتمل ہو یا اس شعبۂ علم کی کتابوں پر مشتمل ہو جس میں اس نے تخصیص کیا ہو تو یہ دُور کی بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے گذشتہ معاشرے میں لائبریریوں کا قیام، خالص انسانی جذبات کا نتیجہ اور غایت درجہ علم دوستی کا ثمرہ تھا۔

دُنیا کے جتنے قدیم ادب ہیں اُن میں سے غالباً عربی ادب ہی وُہ واحد ادب ہے جو کتابوں کے معاملہ میں "سرمایہ دار" کہلانے کا مستحق ہے۔ یہاں ہر فرد کتاب کا عاشق معلوم

ہوتا ہے ۔ کتاب ہی کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں اور کتابوں ہی سے ہر ایک کو دلچسپی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کتاب ایک ایسا دوست ہے جس سے مدتِ دراز سے ملاقات نہیں ہو سکی ۔ گھر بھی بہت دُور ہے اور دل اس کی طرف مائل نہیں ہیں اور آنکھیں مشتاقِ دید ہیں ۔ احمد بن اسماعیل کہتے ہیں :

"کتاب رات کو باتیں کرنے والا ایک ایسا دوست ہے جو آپ کی مشغولیت (مطالعہ) کی حالت میں باتیں چھیڑ کر باعثِ کلفت نہیں ہوتا اور آرام و فراغت کے وقت آپ کو بلا کر زحمت نہیں دیتا ، اور جب آپ اس سے ملنا چاہیں تو آپ کو کسی آرائش کی ضرورت نہیں ۔ اور کتاب ایک ایسا ہمنشین ہے جو آپ کی حد سے زیادہ تعریف نہیں کرتا اور ایک ایسا دوست ہے جو آپ کو دھوکا نہیں دیتا اور ایک ایسا رفیق ہے جو باعثِ ملال نہیں ہوتا اور ایک ایسا ناصح ہے جو آپ کو لغزش میں مبتلا نہیں ہونے دیتا ۔"

## کتابوں سے شغف :

مسلمان ادیب ، لوگوں سے مجلس آرائیوں کے مقابلہ میں مطالعہ کتب کو ترجیح دیا کرتے تھے ، اور خلیفہ یا بادشاہ سے تقرب کی بہ نسبت کتابوں سے تقرب ان کے لیے زیادہ پسندیدۂ خاطر اور باعثِ اطمینان تھا ۔ محمد بن عبدالملک الزیات مشہور ادیب اور وزیر کچھ عرصے کے لیے اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے ۔ جاحظ نے ان سے ملنے کا ارادہ کیا اور سوچا کہ سیبویہ جو عربیت کا امام تھا ۔ اس کی کتاب ان کے لیے مناسب تحفہ ہو گی ۔ وزیر نے یہ تحفہ بڑی خوشی کے ساتھ قبول کیا اور کہا : "خدا کی قسم آج تک مجھے اس سے زیادہ محبوب اور پیارا ، کوئی ہدیہ کسی نے نہیں دیا ۔" کسی خلیفہ نے ایک بار کسی عالمِ دین کو بات چیت کے لیے بلایا ۔ جب ایلچی آیا تو دیکھا کہ وہ عالمِ دین کتابوں کے ایک بڑے ذخیرے میں گھسے ہوئے ہیں اس نے کہا : "آپ کو امیر المؤمنین نے بلوایا ہے ۔" انہوں نے جواب دیا : "امیر المؤمنین سے کہہ دو کہ میرے پاس بڑے بڑے

علماء اور فلاسفر بیٹھے ہیں، میں ان سے بات چیت کر رہا ہوں جب فارغ ہوں گا ۔۔۔ تو آجاؤں گا۔" خادم لوٹا اور خلیفہ کو اطلاع دی۔ اس نے متعجب ہو کر پوچھا کہ وہ کون علماء اور فلاسفر ہیں جو ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ خادم نے کہا خدا کی قسم میں نے تو وہاں کسی کو نہیں دیکھا۔ چنانچہ خلیفہ نے اس خادم کے ذریعہ حکم بھیجا کہ جس طرح بھی ہو وہ فوراً حاضر ہوں، جب وہ آئے تو خلیفہ نے پوچھا وہ کون علماء ہیں جو آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ تو انہوں نے جواب میں یہ اشعار پڑھے :

لے هم جلساء ما نمل حديثهم
امينون، مامونون غيبًا و مشهدا

اذا ما خلونا كان خيرُ حديثهم
معينا على نفي الهموم مؤيدا

يفيدُنا من علمهم علم ما مضى
و عقلاً و تاديبًا و رأيًا و سؤددا

فلا ريبة تخشى و لا سوء عشرة
و لا نتقى منهم لسانًا و لا يدا

فان قلت اموات فلست بكاذب
و ان قلت احياء فلست مفندا

"وہ ساتھی ہیں جن کی باتیں ملول نہیں کرتیں خواہ حاضر ہوں یا غائب، امین اور قابلِ اعتبار ہیں وہ۔

جب علیحدگی میں ملتے ہیں تو اُن کی باتیں نہایت نفع بخش ہوتی ہیں، غموں کو دُور کرنے میں معاون اور مؤید ہوتی ہیں۔

وہ اپنے علم کے ذریعہ ہمیں سابقہ علوم سے مستفید کرتے ہیں اور اس کے ساتھ عقل و شائستگی اور حکمت و رائے سے بھی نوازتے ہیں۔

نہ آپ کو ان سے کسی قسم کا کوئی کھٹکا ہو گا، نہ بد اخلاقی کا ڈر اور نہ آپ کو ان

کے ہاتھ اور ان کی زبان سے کسی نقصان کا ڈر ہو گا۔

اگر میں کہوں کہ وہ مر چکے ہیں تو بھی جھوٹا نہ ہوں گا اور اگر کہوں کہ زندہ ہیں تو بھی کوئی مزاح نہ ہو گا۔"

خلیفہ کو معلوم ہوا کہ جناب کی مراد کتابوں سے تھی، لہٰذا اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور فوراً حاضر ہونے سے معذوری کے اظہار پر کوئی سرزنش نہیں کی۔

صاحب بن عباد نے، نوح بن منصور سامانی کے شاہی محل میں، اعلیٰ ترین عہدہ قبول کر کے رہنے کے بجائے ایک کتب خانہ کے پہلو میں رہنا زیادہ پسند کیا اور یہ اس لیے کہ انہیں اپنے کتب خانہ سے عشق تھا، چنانچہ وہ اسے چھوڑ کر جا نہیں سکتے تھے، اور صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ اسے اپنے ساتھ اٹھا کر لے جا بھی نہیں سکتے تھے، اس لیے انہوں نے اپنے کتب خانے کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی اور کتب خانے ہی میں رہنا پسند کیا۔ یہ تھی وہ علمی رُوح جس کی بنا پر ہمارے علماء و اغنیاء اور اُمراء نے کتابوں کے ساتھ اس قدر شغف کا مظاہرہ کیا اور انہیں جمع کیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے اموال اور اپنے گھروں کے ساز و سامان کے نقصان کو کتابوں سے زیادہ آسان سمجھتے تھے۔

## کتابیں سلامت ہیں تو کوئی غم نہیں :

ایک دفعہ کسی جنگ کے موقع پر، ابن عمید کے گھر پر فوجوں نے حملہ کر دیا اور ان کے غلاموں اور چوکیداروں کو قید کر لیا اور ابن عمید دار الامارہ کی جانب بھاگ گئے فوجوں نے ان کے گھر کا تمام مال و اسباب لُوٹ لیا، ابن عمید نے آ کر دیکھا کہ گھر کا سارا اثاثہ لُٹ چکا ہے، یہاں تک کہ ان کے بیٹھنے کے لیے بھی کوئی چیز نہیں ہے حتٰی کہ پانی پینے کے لیے بھی انہیں کوئی پیالہ نہ ملا۔ لیکن اس کے باوجود ان کو کسی چیز کی فکر نہ تھی اور تھی تو صرف اپنے کتب خانے کی فکر تھی، جس سے زیادہ عزیز ان کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔ ان کے کتب خانے میں مختلف علوم اور ادب و حکمت وغیرہ سارے فنون کی بے شمار کتابیں تھیں اور جن کی کثرت کا حال یہ تھا کہ ان کو ایک سو اُونٹ بمشکل

اُٹھا سکتے تھے، جب ابنِ عمید نے اپنے لائبریرین کو دیکھا تو اس سے کُتب خانے کا حال پُوچھا، اس نے کہا کہ کتب خانہ جُوں کا توں ہے اُسے کسی نے نہیں چھوا۔ ابن عمید کا چہرہ کِھل اُٹھا اور لائبریرین سے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ تم نیک بخت نگران ہو۔ تمام دُوسرے مال و اسباب تو دوبارہ مہیا ہو سکتے ہیں اور ان کا بدل ہو سکتا ہے لیکن اس ذخیرے یعنی کتب خانہ کا بدل ممکن نہیں ہے۔

## کتابوں کی خریداری اور فراہمی میں مسابقت :

پھر اسی علمی رُوح اور کتابوں کے اسی ذوق و شوق کی بنار پر لوگ کتابیں حاصل کرنے کے لیے ایک دُوسرے سے بازی لے جانا چاہتے تھے۔ اور جُونہی تصنیف ختم ہوتی تو مؤلفین سے ان کی وُہ کتابیں خرید لینے کے لیے لوگ ایک دُوسرے سے سبقت کرنا چاہتے۔ مثال کے طور پر اندلس کے امیر حکم کو معلوم ہُوا کہ ابوالفرج اصفہانی اپنی مشہور ادبی کتاب الاغانی لکھ رہے ہیں۔ اس نے اندلس سے اسے ایک نسخے کی قیمت کے طور پر ایک ہزار دینار بھیج دیے اور کہا کہ جُونہی کتاب ختم ہو مجھے بھیج دی جائے، چنانچہ یہ کتاب مصنف کے اپنے وطن عراق سے بھی پہلے اندلس جیسے دُور دراز ملک میں پڑھی گئی۔

## کُتب خانوں کی فراوانی :

اس ادبی ذوق اور علمی رُوح کی وجہ سے تمام عالمِ اسلامی میں جگہ جگہ کُتب خانے قائم ہو گئے تھے، ایسے مدارس کم ہی تھے جن کے ساتھ کتب خانے نہ ہوں اور شاید ہی کوئی چھوٹا موٹا گاؤں ایسا ہو جس میں کوئی کتب خانہ نہ ہو۔ باقی رہے بڑے شہر اور دارالخلافہ تو وہاں تو کتب خانے اور مکتبے، اس افراط سے تھے جس کا تصور بھی قرونِ وسطیٰ میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

## کتب خانوں کی نوعیتیں:

یہ کتب خانے عموماً دو قسم کے ہوا کرتے تھے، عام اور خاص۔ عام نوعیت کے کتب خانے خلفاء، اُمراء، علماء اور دُوسرے اہلِ ثروت کی جانب سے قائم کیے جاتے تھے۔ اُن کے لیے مستقل پختہ عمارتیں تعمیر کی جاتی تھیں اور بعض اوقات یہ بڑی مسجدوں اور مدرسوں سے ملحق ہوتے تھے۔

کتب خانوں کے لیے جو الگ اور مستقل عمارتیں تعمیر ہوتیں وہ اس طرح کہ عمارت متعدد کمروں پر مشتمل ہوا کرتی تھی جن کے درمیان بڑے ہال ہوتے تھے اور ان کو ایک دُوسرے سے ملا دیتے تھے، کتابیں دیواروں کے ساتھ لگے ہُوئے کارنسوں پر رکھی جاتی تھیں۔ ہر کمرہ علم کے ایک خاص شعبے کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا۔ مثلاً ادب کی کتابوں کا ہال، فقہ کی کتابوں کا ہال اور طب کی کتابوں کا ہال اور اسی طرح دُوسرے علوم کے لیے، اس عمارت میں کمرے مطالعہ کرنے والوں کے لیے مخصوص ہُوا کرتے تھے۔ بعض کمرے کاتبوں کے لیے مخصوص ہوتے تھے جو ہر وقت کتابیں لکھتے رہتے تھے۔ اور بعض عمارتوں میں ایک کمرہ موسیقی کے لیے بھی مخصوص ہوتا جہاں طلبہ ذہنی تھکن دُور کرنے کے لیے آتے اور پھر سے تازہ ہو کر مطالعہ میں مشغول ہوتے ...... اس لحاظ سے اسلامی تہذیب اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے ...... نیز وہاں ایسے کمرے بھی ہوتے تھے جن میں وہاں کے مقیم فضلاء باہمی علمی بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔

یہ سارے بہترین اور آرام دہ فرنیچر سے مزین ہوتے تھے۔ وہاں آنے والوں کے لیے کھانے کے کمرے بھی علیحدہ تعمیر کیے جاتے تھے اور غرباء کے لیے سونے کے کمرے بھی تھے۔ جیسا کہ علی بن یحییٰ بن منجم کی لائبریری کے متعلق منقول ہے کہ بغداد کے متصل قفص کے گرد و نواح میں کرکر نامی ایک گاؤں میں اس لائبریری کی ایک عظیم الشان عمارت تھی، اس میں ایک عظیم ذخیرۂ کتب تھا جسے "خزانۂ حکمت" کہا جاتا تھا۔ ہر جگہ سے لوگ یہاں آتے اور قیام کرتے اور مختلف علوم حاصل کرتے، یہاں انہیں ہر قسم کی کتابیں

بکثرت وسہولت فراہم کی جاتیں، ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی انہیں مہیا کی جاتیں اور یہ تمام اخراجات علی بن یحییٰ کی ذاتی جائداد سے کیے جاتے تھے۔ اس لائبریری میں بعض ایسی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی تھیں جن کا تصور ہم آج بھی مغربی تہذیب و تمدن کے کسی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ ملک کے دارالحکومت میں نہیں کر سکتے۔ موصل میں ابوالقاسم جعفر بن محمد حمدان موصلی نے ایک مکان تعمیر کیا جس کا نام اس نے "دارالعلم" رکھا۔ یہاں اس نے طالب علموں کے لیے ایک عظیم کتب خانہ وقف کیا جس میں آنے سے کسی کو نہ روکا جاتا تھا اور اگر کوئی غریب طالب علم آجاتا اور حصولِ ادب اس کا نصب العین ہوتا تو اسے سٹیشنری کے ساتھ ساتھ اخراجات کے لیے اچھی خاصی رقم بھی دی جاتی تھی۔ یہ مکتبہ ہر دن کھلا رہتا۔

اب آپ ہی بتائیں کہ کیا آج لندن یا واشنگٹن یا دنیا کے کسی دوسرے دارالحکومت میں کوئی ایسی لائبریری ہے جو تشنگانِ علم کو اس قدر سہولتیں فراہم کرتی ہو کہ کتابوں کے ساتھ ساتھ رہائش اور اخراجات کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی جاتی ہوں۔

عام لائبریریوں میں ملازم رکھے جاتے تھے جن کے بڑے افسر کو "خازنِ مکتبہ" کہا جاتا تھا۔ اس عہدے پر ہمیشہ وقت کے مشہور علماء میں سے کسی کو مقرر کیا جاتا تھا۔ کچھ دوسرے افراد طلبا اور مطالعہ کرنے والوں کو کتابیں لینے دینے کے لیے مقرر ہوا کرتے تھے۔ انہیں مناول کہا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ ترجمہ کا کام کرتے رہتے تھے جو غیر عربی تصنیفات کو عربی میں منتقل کرتے رہتے تھے، کاتب مقرر تھے جو اپنی خوش نویسی سے خوبصورت نسخے تیار کرتے رہتے تھے، جلد ساز ہوتے تھے جو خوبصورت اور پختہ جلد بندی کرتے رہتے تھے تاکہ کتابیں ضائع نہ ہوں اور پھٹنے نہ پائیں۔ ان مشہور آسامیوں کے علاوہ بھی کئی لوگ دوسری ضروریات کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔

ہر چھوٹے اور بڑے کتب خانے کی ایک فہرست ہوا کرتی تھی، کہ اسے دیکھ کر بسہولت، مطلوبہ کتاب نکالی جاسکے۔ یہ فہرست مختلف علوم کے لحاظ سے مرتب ہوا کرتی تھی۔ ہر الماری کے ساتھ ایک لسٹ رکھی جاتی جس میں ان کتابوں کی تفصیل

درج ہوتی تھی جو اس الماری میں موجود ہوتی تھیں۔ اکثر کتب خانوں سے متعلق یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم تھی کہ کتاب کی ضمانت دے کر باہر لے جانے کی ہر شخص کو اجازت ہے لیکن مشہور صاحب فضل اور علماء کو کتابیں بلا ضمانت دی جاتی تھیں۔

ان لائبریریوں کے آمدنی کے ذرائع جن سے ان کی یہ جملہ ضروریات پوری ہوتی تھیں مختلف تھے۔ ایک ذریعہ تو وہ اوقاف تھے جو خصوصاً ان لائبریریوں کے لیے قائم کیے جاتے تھے اور اکثر لائبریریوں کا بڑا ذریعہ آمدنی یہی اوقاف تھے۔ اور ایک ذریعہ یہ تھا کہ اُمراء اور علماء جو یہ لائبریریاں قائم کرتے تھے خود ان کے مصارف پُورے کیا کرتے تھے مثلاً محمد بن عبدالملک الزیات ناقلین اور کاتبوں کو دو ہزار پونڈ ماہانہ دیا کرتا تھا۔ مامون الرشید حنین ابن اسحٰق کو اس کی ہر اُس کتاب کا سونے سے تول کر معاوضہ دیا کرتا تھا جو وہ غیر عربی سے عربی میں منتقل کیا کرتا۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ کتب خانوں کی تاریخ میں سے اخذ کر کے بعض خاص (ذاتی) اور عام کتب خانوں کا بطور مثال تذکرہ کریں۔

## ۱۔ مکتبۂ خلفاء فاطمین، قاہرہ:

قاہرہ کے خلفائے فاطمیہ کا یہ کتب خانہ مشہور ترین کتب خانوں میں سے تھا۔ یہ عجیب کتب خانہ تھا جس میں نفیس ترین قرآن مجید اور کتابیں موجود تھیں۔ جن کی مجموعی تعداد اکثر مؤرخین کی رائے کے مطابق بیس لاکھ تھی اگرچہ مقریزی کا خیال ہے کہ وہ سولہ لاکھ کتابوں پر مشتمل تھی۔

## ۲۔ دارالحکمت، قاہرہ:

حاکم بامر اللہ نے اسے قائم کیا اور ۱۰ر جمادی الاولیٰ ۳۹۵ھ کو اس کا افتتاح ہوا جبکہ اس کی عمارات کو مزین کر دیا گیا اور فرش کو قیمتی مفروشات سے آراستہ کیا گیا اور کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے لگا دیے گئے۔ اس میں منتظم اور کتابوں کا اجراء کرنے

والے اور دُوسرے ملازم اور خدمت گار مقرر کر دیے گئے۔ اس میں اس قدر عظیم الشان ذخیرہ کتب جمع کیا گیا، جو اس سے پہلے کسی بادشاہ نے جمع نہیں کیا تھا۔ اس کے چالیس حصے تھے، ہر حصہ اٹھارہ ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ جن میں قدیم علوم پہ ہر قسم کی کتابیں تھیں۔ ہر آدمی وہاں جا سکتا تھا، کوئی وہاں جا کر محض مطالعہ کرتا، کوئی نقل کرتا اور کوئی صرف تعلیم حاصل کرتا۔ اس لائبریری کی جانب سے قلم، دوات اور ہر طرح کی روشنائی اور کاغذ مہیا کیے جاتے تھے۔

## ۲۔ بیت الحکمت بغداد:

ایسے ہی کتب خانوں میں سے بغداد کا بیت الحکمت ہارون الرشید نے قائم کیا اور مامون کے زمانے میں بام عروج کو پہنچا۔ یہ کتب خانہ نہ تھا بلکہ ایک عظیم یونیورسٹی تھی۔ جس میں محققین، مفکرین، مطالعہ کرنے والے اور بحث و استفادہ کرنے والے سب ہی جمع رہتے۔ اس میں کاتب اور مترجم مقرر تھے۔ یہ لوگ ان کتابوں کے ترجموں میں مصروف رہتے جو ہارون رشید اور مامون نے انقرہ، عموریہ اور قبرص کی فتح کے بعد حاصل کی تھیں، ابن ندیم کہتا ہے کہ مامون رشید اور رُوم کے بادشاہ کے درمیان ایک طویل خط و کتابت ہوئی تھی جبکہ مامون نے اسے کسی معرکہ میں شکست دی تھی۔ اس صلح کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ وہ اپنے ہاں کی تمام کتابوں کے ترجمے کی اجازت دے گا۔ اور ترجمہ وہ لوگ کریں گے جنہیں مامون بھیجے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تمام رومن ذخیرۂ علم کو عربی میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ تاریخ کی ایک زریں مثال ہے کہ ایک فاتح کی نظر میں فتح کی اس سے بڑی کوئی قیمت نہ تھی کہ وُہ علوم و فنون کو اپنی قوم کے افراد تک منتقل کر دے۔

## ۳۔ مکتبۂ حکم، اندلس:

یہ کتب خانہ جو نہایت وسیع اور عظیم الشان تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

چار لاکھ مجلدات پر مشتمل تھا، اور اس کی فہرستیں نہایت منظم اور مفصل تھیں، یہاں تک کہ اس کتب خانے میں شعراء کے جو دیوان موجود تھے صرف ان کی فہرست چوالیس حصوں پر مشتمل تھی۔ فنِ کتابت کے ماہرین وہاں موجود رہتے تھے۔ اس طرح جلد سازی اور کتب داری کے ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس میں کتابوں کا اس قدر بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا جو نہ اس سے قبل ہوا تھا اور نہ بعد میں دیکھا گیا۔

## ۵۔ مکتبۂ بنی عمار، طرابلس:

یہ کتب خانہ اپنی وسعت اور عظمت میں بس اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔ اس میں ایک سو اسی ۱۸۰ تو صرف کاتب تھے جو ہر وقت کتابیں نقل کیا کرتے ان کی ڈیوٹی کے اوقات رات اور دن کو بدلتے رہتے تھے تاکہ کتابت کا کام مسلسل جاری رہے اور کسی وقت بھی منقطع نہ ہونے پائے۔ بنو عمار کو نئی اور نایاب کتابیں جمع کرنے کا بیحد شوق تھا۔ انہوں نے بعض افسروں اور تاجروں کو محض اس کام میں لگا رکھا تھا کہ وہ مختلف علاقوں کا دورہ کریں اور اندرون ملک اور بیرون ملک غریب و بعید علاقوں سے ان کے مکتبے کے لیے ہر فن میں مفید کتابیں جمع کریں۔ اس مکتبے سے مصر نے استفادہ کیا اور اپنی بعض کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ اس کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد کیا تھی، معتدل قول یہ ہے کہ اس میں ایک ملین کتابیں جمع تھیں۔

## ذاتی کتب خانے:

مخصوص اور ذاتی کتب خانوں میں سے ہم صرف ان کا ذکر کریں گے جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ یوں تو عالمِ اسلامی شرقاً و غرباً کتب خانوں سے بھرا پڑا تھا، کم ہی ایسا کوئی عالم تھا جس کا خود اپنا ہزاروں کتابوں پر مشتمل کتب خانہ نہ ہو۔ ایسے خاص کتب خانوں میں سے فتح بن خاقان (جو ۲۴۷ھ میں قتل کیے گئے) کا کتب خانہ بہت مشہور ہے۔ یہ نہایت وسیع کتب خانہ تھا۔ اس نے اس وقت کے مشہور عالم اور

ادیب علی بن یحییٰ المنجم کو اس کتب خانے کے لیے کتابوں کی تلاش اور جمع پر مامور کیا تھا اس شخص نے اسی ذخیرۂ کتب میں وُہ کتابیں جمع کیں جو کسی دُوسری جگہ نہیں پائی جاتی تھیں۔

ابنِ خشاب (متوفی ۵۶۷ھ) کا کتب خانہ بھی ایسے ہی کتب خانوں کی صف میں آتا ہے۔ یہ علم نحو میں بہت ماہر تھا۔ اور تفسیر، حدیث، منطق اور فلسفہ میں بھی درک رکھتا تھا یہ جنون کی حد تک کتابوں کا عاشق تھا۔ اس والہانہ محبت نے اسے مجبور کیا کہ وُہ کتابیں جمع کرنے میں بعض مذموم حرکات کا ارتکاب بھی کر گذرے۔ جب وُہ بازار جاتا اور کوئی اچھی کتاب خریدنا چاہتا تو لوگوں کی نظریں بچا کر اس میں سے کچھ اوراق نکال لیتا اور کتب فروش سے کہتا یہ کتاب تو ناقص ہے۔ اس طرح وُہ کتاب نہایت کم قیمت پر حاصل کر لیتا اور جب وُہ کسی سے کتاب مستعار لیتا تو مالک کے مطالبہ پر مختلف بہانے بناتا مثلاً یہ کہ وُہ کتابوں کے انبار میں کہیں دب گئی ہے، اور مل نہیں رہی ہے، اور کتاب واپس نہ کرتا۔

جمال الدین قفطی (متوفی ۶۴۶ھ) کا کتب خانہ بھی مشہور تھا۔ اس نے بے شمار کتابیں جمع کیں اور اس کی فیاضی اور سخاوت کی وجہ سے تمام اطراف و اکناف سے لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ دُنیا میں اسے کتابیں ہی سب سے عزیز تھیں، اور اس نے اپنے آپ کو کتابوں کے لیے ہی وقف کر رکھا تھا۔ اسی لیے اس نے شادی بھی نہ کی تاکہ اہل و عیال کی خبر گیری میں مصروف نہ ہونا پڑے۔ مرتے وقت اس نے اپنا کتب خانہ ناصر کو دینے کی وصیت کی۔ اور اس کی قیمت ۵۰ ہزار پونڈ کے برابر تھی۔

حلب کے علمائے بنی جرادہ کا کتب خانہ بھی مشہور ہے۔ ان میں سے ایک شخص ابوالحسن ابن ابی جرادہ (متوفی ۵۴۸ھ) نے اپنے خط سے بہترین کتابوں کے تین کتب خانے لکھے۔ ایک اپنے لیے، ایک اپنے بیٹے ابوالبرکات کے لیے اور ایک کتب خانہ اس کے بیٹے عبداللہ کے لیے۔

موفق بن مطران دمشقی (متوفی ۵۸۷ھ) کا کتب خانہ بھی مشہور تھا۔ اس نے کتابیں حاصل کرنے میں بڑی بلند ہمتی کا مظاہرہ کیا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کا ذخیرۂ کتب

طب اور دوسرے علوم سے متعلق دس ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ اور اس نے تین کاتب رکھ رکھے تھے جو اس کے کتب خانے کے لیے ہر وقت کتابیں نقل کرتے رہتے تھے۔ وہ انہیں باقاعدہ تنخواہیں دیتا تھا اور دوسری ضروریات فراہم کرتا تھا۔

## ان کتب خانوں کے ساتھ دشمنوں کا برتاؤ:

ہماری تہذیب کی ترقی کے دَور میں عالم اسلامی میں کتب خانوں کی جو کثرت تھی، اس کے تذکرہ سے جس قدر ہم خوش ہوتے ہیں اس سے زیادہ ہمارے قلوب محزون و رنجیدہ ہوتے ہیں، جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ ان قیمتی سرمایوں کا انجام کیا ہوا؟ کس طرح وہ تباہ ہوئے؟ کس بیدردی سے انہیں دریا بُرد کیا گیا اور کس بے رحمی سے انہیں جلایا گیا؟ علم و دانش کی یہ وہ تباہی اور خسارہ ہے جسے قیامت تک پورا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ان کتب خانوں پر ایسی بربادیاں آئیں، جن کے نتیجے میں انسانیت ایسی لاکھوں کتابوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی جو فکرِ انسانی کی تخلیق کا تاریخی شاہ کار تھیں۔

جب تاتاریوں کی تباہ کاریوں کا سیلاب بغداد میں داخل ہوا تو سب سے پہلے انہوں نے ان کتب خانوں کو تاکا، چنانچہ سب کو معلوم ہے کہ اَن پڑھ تاتاریوں کو، جس کتب خانے میں جو کچھ بھی ملا، وہ دریائے دجلہ میں پھینکتے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے دریا کی گہرائی اتنی پاٹ دی کہ ان کے سوار شانہ سے شانہ ملائے ہوئے پانی سے گذرے۔ تمام دریا کا پانی مہینوں تک اس میں پھینکی ہوئی ان کتابوں کی سیاہ روشنائی کی وجہ سے متغیر ہو کر بہتا رہا۔

اس کے بعد صلیبی جنگوں کی شکل میں بھی تباہی آئی جس نے طرابلس، معرہ، بیت المقدس، عسقلان وغیرہ شہروں کے تمام قیمتی کتب خانے تباہ کر دیے، کیونکہ ان شہروں کو عیسائیوں نے فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ صرف طرابلس میں عیسائیوں نے تین ملین (۳۰ لاکھ) جلدیں تباہ کیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا

ہے کہ یہ تباہی کس قدر عظیم تھی۔

اندلس پر اسپینیوں کے استیلا نے جتنے عظیم کتب خانوں سے، انسانیت کو محروم کیا ہے وہ تاریخ کی حسرت ناک داستان ہے۔ ان متعصب مذہبی لوگوں نے کتابوں کے کتنے بڑے ذخائر جلائے، اس کا اندازہ اس طرح کیجیے کہ غرناطہ کے ایک میدان میں صرف ایک دن میں دس لاکھ کتابیں جلائی گئیں۔

عالمِ اسلامی کے ان عظیم کتب خانوں کی ایسی عام تباہیاں تو وہ ہیں جو اغیار کے ہاتھوں ہوئیں۔ ان کے علاوہ ہمارے داخلی فتنوں نے بھی کچھ کم نقصان نہیں پہنچایا۔ مصر کے خلفائے فاطمیہ کے کتب خانے کا انجام یہ ہوا کہ ترک غلام خاندان کو جب مصر پر تسلط ہوا تو انہوں نے اس کتب خانے کو تہس نہس کر ڈالا۔ اسے آگ لگا دی، کتابوں کی جلدوں سے نفیس چمڑے اکھاڑ کر انہوں نے اپنے لیے جوتے تیار کرائے۔ بے شمار کتابوں کو دریائے نیل میں پھینک دیا گیا۔ کچھ کتابوں کو لوگ مختلف علاقوں کی طرف لے بھاگے جو باقی رہ گئیں وہ کھلے میدان میں پھینک دی گئیں اور ہوا ان کے نفیس اور قابلِ قدر اوراق سے کھیلتی رہی۔ چنانچہ بعض ایسے ٹیلے تھے جو کتابوں کے ٹیلے کے نام ہی سے مشہور ہو گئے۔

حلب میں ایک عظیم کتب خانہ تھا۔ جس کا نام "خزانۃ الصوفیہ" تھا۔ عاشورہ کے موقع پر شیعہ سُنی فساد ہو گیا اور اسے لوگوں نے لوٹ لیا اس میں چند کتابوں کے سوا کچھ نہ رہا۔

اندلس کے حکمران مستنصر کے کتب خانہ کا انجام یہ ہوا کہ جب بربر قبائل فاتحانہ داخل ہوئے تو انہوں نے اس کتب خانے کو برباد کیا۔ بہت سی کتابوں کو کوڑیوں کے مول نیلام کیا گیا اور جو باقی رہ گئیں، ان کو تباہ کر دیا۔

کتابوں اور کتب خانوں کی بربادیوں کے سلسلہ میں ایک بڑی عجیب اور مضحکہ خیز حرکت امیر "ابن فاتک" کی بیوی نے کی۔ یہ صاحب پانچویں صدی ہجری کے مصری امراء میں سے تھے۔ ان کا ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ ان کی بیوی بڑے باعزت اور دولت مند

گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن چونکہ ابنِ فاتک کے اوقات کا ایک بڑا حصہ ان کے اس کتب خانہ میں صرف ہوتا تھا، اس لیے ان کی بیوی کو ان کی کتابوں سے بیحد چڑ ہو گئی تھی۔ جب ابنِ فاتک فوت ہو گئے تو وہ اور اس کی لونڈی کتب خانے میں داخل ہو گئیں اور کتابوں کو اٹھا اٹھا کر اس بڑے حوض میں پھینکنا شروع کر دیا جو ان کے صحن میں تھا۔ وہ رو پیٹ بھی رہی تھی اور کہتی جاتی تھی کہ ہمیشہ ان کتابوں نے اسے مصروف رکھا اور کبھی میری طرف متوجہ نہ ہونے دیا...... یہ تھا اس عورت کا انتقام جو اس نے اپنے خاوند کی کتابوں کے ساتھ شیفتگی کے سبب ان کی وفات کے بعد ان کتابوں سے لیا۔ تاریخِ اسلامی میں کئی اور ایسی بیویوں کا ذکر بھی آتا ہے جنہیں کتابوں سے اسی طرح کی نفرت تھی جیسی کہ ابنِ فاتک کی بیوی کو تھی۔ امام زہری کی بیوی امام صاحب کو ہر وقت کتابوں میں غرق دیکھ کر کہتی:

"خدا کی قسم یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں"

یہ تھی ہماری تہذیب و تمدن کے دور میں ہمارے کتب خانوں کی داستانِ غم اور یہ ہے ان کا حسرت ناک انجام۔

## اعترافِ حق:

اگرچہ دشمنوں کی اچھی کارگذاری کا اعتراف کرنا نفسِ انسانی کے لیے بیحد گراں ہوتا ہے لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس بات کا برملا اعتراف کریں کہ یورپ کے مختلف کتب خانوں نے ہماری اس میراث کے بقایا میں سے بہت سی قیمتی چیزوں کو محفوظ رکھا۔ اور ان کتب خانوں میں آج بھی عربی کتابوں کے وہ ذخائر موجود ہیں جن کے مثل پورے عالمِ اسلام میں نہیں ہیں۔

# بارھواں باب

# مجالس اور علمی حلقے

# مجالس اور علمی حلقے

یہ ہماری شاندار تہذیب کا ایک عجیب رنگ ہے۔ اور ثقافت کے پھیلنے اور علم کی نشر و اشاعت پر اس کا نہایت اچھا اثر ہوا تھا۔ اس سے اجتماعی سطح کی بلندی اور عام علمی ذوق میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ثقافت کو ترقی نصیب ہوئی۔ یہ رنگ ان مجالس اور علمی حلقوں کا رنگ ہے جو مسلمانوں کے دار الحکومتوں اور بڑے بڑے شہروں میں بکثرت ہوتی تھیں۔ جبکہ ان کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے مدارس، علمی ادارے اور کتب خانے بھی بڑی کثرت سے تھے، یہ مجلسیں اپنی کثرت اور ان میں اٹھنے والی بحثوں کے تنوع کے لحاظ سے، امتِ مسلمہ کی شوکت اور عزت کے دور میں، علمی بیداری کا روشن ترین منظر تھیں۔ جب آپ یہ دیکھیں گے کہ امت کے مختلف طبقے امراء، علماء، ادبا اور شعراء اپنی خاص اور عام مجالس میں مختلف علمی، ادبی اور فلسفی موضوعات پر بحث کے لیے مقابلے منعقد کرتے ہیں تو اس سے آپ کو یہ یقین ہو جائے گا کہ امتِ مسلمہ اپنے علمی شغف اور اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے اس بلندی تک جا پہنچی ہے جس سے آپ کو یقیناً اس کی ترقی اور عظمت کی شہادت ٹھوس شہادت ملے گی۔

## اقسام وانواع :

یہ مجالس متعدد اور متنوع تھیں، بعض مجالس خلفائے وقت کی زیر پرستی ہوتی تھیں، خود خلیفہ ان کی صدارت کرتا تھا۔ ان میں خلفاء کے دار الحکومت کے مشہور ترین علماء، فقہا اور ادبا شریک ہوتے تھے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کی نشوونما سے ان مجالس کی ہیئت میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ خلفاء راشدین کے عہد میں یہ مجالس گورنروں کی کارکردگی اور اُمورِ مملکت کے متعلق بحث و تمحیص کرتیں اور ان کی حیثیت ایک ایسی اسمبلی کی ہوتی تھی جس میں قوم کے بڑے بڑے لیڈر پیش آمدہ اہم اور مختلف قسم کے مسائل اور اُمور کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتے۔ حضرت عمر بن الخطاب کو ایک دفعہ حکومت کے کسی اہم کام کے نگران کی ضرورت پیش آئی تو اُنہوں نے شرکاء مجلس سے دریافت کیا کہ مجھے ایک ایسے آدمی کی نشاندہی کریں جسے میں ایک اہم کام پر لگانا چاہتا ہوں، تو شرکاء مجلس نے کہا "فلاں" آپؓ نے جواب دیا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" لوگوں نے دریافت کیا تو پھر کیسا آدمی چاہیے ؟" تو آپؓ نے فرمایا: "مجھے ایسا آدمی چاہیے کہ اگر وہ موجود ہو اور قوم کا کوئی سربراہ نہ ہو تو ایسا نظر آئے جیسے وُہی سربراہ ہے اور اگر قوم میں ان کا سربراہ ہو تو وُہ تو ایک عام آدمی کی طرح ہو۔" تو شرکاء نے کہا کہ یہ صفت تو صرف ربیع بن زیاد حارثی ہی میں پائی جاتی ہے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ لوگوں کی نگاہ بالکل صحیح آدمی پر پڑی پھر اس کے بعد انہیں اس منصب پر مامور کیا گیا۔

## بنو اُمیّہ کے دَور کی علمی مجالس :

اُمویوں کے دور میں یہ مجالس علم ادب اور شعر و حکمت کی اکاڈمی بن گئیں۔ ایک دفعہ عبداللہ بن ہاشم امیر معاویہؓ کی مجلس میں حاضر ہُوئے تو حضرت معاویہؓ نے کہا: "کون ہے جو سخاوت، دلیری اور مروّت کی صحیح تعریف کر سکتا ہے ؟" تو عبداللہ نے کہا: "سخاوت کا مفہوم یہ ہے کہ عطیہ اور مال، سوال سے بھی پہلے دے دیا جائے۔" دلیری "جرأت

اقدام اور قدم پھسلنے کے وقت استقامت کو کہتے ہیں۔" اور مروّت " دین میں اصلاح اور تقویٰ اور اصلاحِ حال اور پڑوسی کی حمایت سے عبارت ہے۔" عبدالملک نے ایک مجلس میں حاضرین سے پوچھا تم میں سے کون ہے جو جسم انسانی سے تعلق رکھنے والے اعضا کے متعلق ایسے الفاظ پیش کرے جس کے ابتدا میں حروف تہجی بالترتیب موجود ہوں وہ جو مانگے گا میں انعام دُوں گا۔ تو سوید بن غفلہ نے کہا " حضور میں پیش کرتا ہُوں "
عبدالملک نے کہا؟ " فرمائیے " اس نے کہا: " انف (ناک) بطن (پیٹ) ترقوۃ (ہنسلی کی ہڈی) ثغر (اگلے دانت) جمجمہ (کھوپڑی) حلق، خد (گال، دماغ) ....... مجلس کے حاضرین میں سے ایک دُوسرے شخص نے کہا حضور میں ایسے الفاظ جسم انسانی میں سے دو دفعہ پیش کرتا ہُوں تو سوید نے کہا چلو میں تین تین پیش کرتا ہُوں۔ چنانچہ وُہ کہنے لگا: انف، اسنان (دانت) اذن (کان) اور اس طرح ب، ت وغیرہ کے لیے بھی تین تین لفظ پیش کرتا چلا گیا۔ عبدالملک اس قدر الفاظ فی البدیہ پیش کرنے پر حیران رہ گیا اور اسے انعام دیا۔

ایک دیہاتی عبدالملک کی مجلس میں آیا جہاں مشہور شاعر جریر بھی تشریف فرما تھے۔ عبدالملک نے دیہاتی سے کہا؟ " کیا تم شعر کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" دیہاتی نے جواب دیا آپ جو چاہیں مجھ سے پوچھیں۔ عبدالملک نے کہا: " مدح کے باب میں سب سے اچھا شعر کونسا ہے؟" دیہاتی نے کہا جریر کا یہ شعر:

الستم خیر من رکب المطایا
واندی العالمین بطون راح

" کیا تم ان تمام لوگوں سے اچھے نہیں ہو جو کبھی سوار ہوئے اور کیا تم تمام عالم کی نسبت زیادہ سخی نہیں ہو، ......

جریر نے سر اُٹھایا اور دیر تک سر اُٹھائے رکھا، عبدالملک نے پوچھا کہ فخریہ شاعری میں سب سے زیادہ اچھا شعر کونسا ہے؟ دیہاتی نے جواب دیا: جریر کا یہ شعر:

اذا غضبت علیک بنو تمیم حسبت الناس کلھم غضابا

"جب تجھ سے بنو تمیم ناراض ہو جائیں تو تُو خیال کرے گا کہ تمام لوگ تیرے خلاف غضب ناک ہیں۔"

جریر خوشی سے جھُومنے لگے۔ عبدالملک نے پھر پوچھا کہ ہجو میں اچھا شعر کونسا ہے؟

دیہاتی نے کہا جریر کا یہ شعر :

فغض الطرف انک من نمیر

فلا کعبا بلغت ولا کلابا

"آنکھیں نیچی کرلے، کیونکہ تو بنی نمیر میں سے ہے۔ نہ کعب کے مرتبہ تک تیری رسائی ہوسکتی ہے اور نہ کلاب کے مرتبہ تک۔"

جریر کا چہرہ چمک اُٹھا۔ لیکن عبدالملک نے پھر پُوچھا کہ غزل میں اچھا شعر کس کا ہے؟

دیہاتی نے کہا وُہ جریر کا یہ شعر ہے :

ان العیون التی فی طرفہا حور

قتلننا ثم لم یحیین قتلانا

"انہی آنکھوں نے جو ترچھی نظر سے دیکھتی ہیں قتل تو کر دیا ہے لیکن قتل کے بعد ہماری لاشوں کو زندہ نہ کیا۔"

جریر مارے خوشی کے مسلسل جھُوم رہے تھے۔ عبدالملک نے پوچھا کہ وہ کونسا شعر ہے جس میں سب سے بہترین تشبیہ ہو۔ دیہاتی نے کہا وُہ جریر کا یہ شعر ہے :

سری نحوھم لیل کان نجومہ

قنادیل فیھن الذبال المفتل

"ان کی طرف رات چلی جس کے ستارے۔ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے قندیلوں میں بٹی ہُوئی بتیاں جل رہی ہوں۔"

یہ سُن کر جریر کی مسرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی اور کہا :

"امیرالمؤمنین میرا انعام بھی اس دیہاتی کو دے دیں۔" عبدالملک نے جواب دیا :

"اسے بھی اسی قدر دے دیا جائے گا اور آپ کا انعام بحال رہے گا۔" دیہاتی دربار سے

نکلا تو اس کے داہنے ہاتھ میں آٹھ ہزار روپے تھے اور بائیں ہاتھ میں کپڑے کا تھان تھا۔

## دورِ عباسی کی علمی مجالس:

عہدِ عباسی میں، ان مجالس میں ترقی اور تبدیلی ہوتی رہی اور مجالس اپنی وسعت، ساز و سامان اور زیرِ بحث فنون و موضوعات کے تنوع اور علماء و ادبا کی کثرت کے لحاظ سے شاندار مجالس بن گئیں۔ یہ مجالس ان کے علاوہ تھیں جو خوش گپیوں کے سبب منعقد ہوا کرتی تھیں اور جن پر ادبی رنگ غالب ہوا کرتا تھا اور جن میں شعر و شاعری اور شعراء کی نوک جھونک ہوتی رہتی اور گانے بجانے کے وہ خاص کلمات زیرِ بحث آتے تھے جنہیں گویا گاتے تھے۔ رشید اور مامون عباسی خلفاء میں سے اپنی وسیع اور عمدہ ترین مجالس کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہیں۔ ہارون الرشید کے پاس تو ہر علم و فن کے بڑے بڑے علماء ہر وقت جمع رہتے تھے۔ چنانچہ اس کے دربار کے ممتاز شعراء یہ تھے ابو نواس، ابو العتاہیہ، دعبل، مسلم بن الولید اور عباس بن الاحنف اور فقہاء میں سے ابو یوسف شافعی، محمد بن الحسن۔ اور اہلِ لغت میں سے ابو عبیدہ، اصمعی اور کسائی، اور مورخین میں سے مشہور مورخ واقدی اور مفسرین میں سے ابراہیم موصلی اور اس کا بیٹا اسحٰق وغیرہ اس کی مجالس کے شرکاء تھے۔

بطور مثال ایک عجیب ادبی مباحثے کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایسے مباحثے اکثر ان مجالس میں ہوا کرتے تھے۔ ہارون الرشید کی ایک مجلس میں ایک دفعہ کسائی اور سیبویہ اور لغت و ادب کے بعض بڑے ائمہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسائی کا خیال تھا کہ عرب ایک محاورہ اس طرح استعمال کرتے ہیں: "کنت اظن ان الزنبور اشد لسعا من النحلۃ فاذا ھو ایاہ (میں سمجھتا تھا کہ بھڑ کا نیش شہد کی مکھی کی نیش سے زیادہ شدید ہے چنانچہ اب معلوم ہوا کہ وہ ایسی ہی ہے) لیکن سیبویہ نے کہا کہ استعمال (بجائے فاذا ھو ایاہ) کے "فاذا ھو ھی" ہے۔ اس ادبی محاورے پر ان کے درمیان طویل بحثیں ہوتی رہیں۔ بالآخر اس پر اتفاق ہوا کہ کسی ایسے دیہاتی سے فیصلہ کرایا جائے جو کبھی اہلِ شہر سے نہ ملا ہو، اور

اس کی زبان شہری زبان کے اختلاط سے پاک ہو۔ ہارون الرشید کو کسائی سے غایت درجہ لگاؤ تھا اور وُہ دل سے چاہتا تھا کہ کسائی اس مقابلہ کو جیت جائے، کیونکہ اس کے عہدِ خلافت سے پہلے کسائی اس کا معلّم خاص تھا۔ ہارون نے ایک دیہاتی کو بُلایا اور اس سے دریافت کیا۔ اس نے اس طرح ادا کیا جس طرح سیبویہ کہہ رہا تھا۔ ہارون نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ تم اسے کسائی کی طرح ادا کرو۔ اس نے کہا کہ میری زبان سے یہ فقرہ ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ آخر وُہ اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ مجلس میں کسائی اور سیبویہ دونوں اپنے اپنے خیال کے مطابق اس محاورے کو ادا کریں گے، تو وُہ کسائی کی زبان سے ادا کیے ہُوئے محاورے کو صحیح کہہ دے گا۔ چنانچہ اگلے دن پھر مجمع میں ایسا ہی ہُوا، لیکن سیبویہ کو علم ہو گیا کہ اسے دھوکہ دیا گیا ہے اور لوگوں نے کسائی کی ناجائز طرفداری کی۔ اس کا سیبویہ پر بڑا اثر ہُوا اور وُہ نہایت حزن و ملال کے ساتھ بغداد سے نکل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد وُہ زیادہ دن زندہ نہ رہا اور اسی حزن و ملال میں وُہ انتقال کر گیا۔

اسی طرح ہارون الرشید کی مجالس میں فقہی مباحث بھی ہُوا کرتے۔ چنانچہ علم فقہ کے دلچسپ مناظروں میں سے ایک یہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن الحسن نے یہ کہا کہ کسائی علم فقہ میں ماہر نہیں ہے وُہ صرف کلامِ عرب میں کچھ درک رکھتا ہے کسائی نے کہا جو آدمی کسی ایک علم میں مہارت حاصل کرے دُوسرے سارے علوم میں بصیرت کے ساتھ چل سکتا ہے۔ امام محمد نے بطور آزمائش پُوچھا کہ اگر کسی کو سجدہ سہو کے دوران ہی سہو ہو جائے تو کیا وُہ دوبارہ سجدہ سہو کرے گا؟ کسائی نے کہا "نہیں" امام محمد نے پوچھا "دلیل کیا ہے؟" اس نے کہا نحو کا مشہور قاعدہ ہے کہ جو لفظ مصغّر ہو چکا ہے اس کی مزید تصغیر نہ ہو گی۔

اسلامی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں مامون رشید کی مجالس نہایت شاندار اور اُونچے درجے کی علمی مجالس رہی ہیں۔ کیونکہ وُہ بذاتِ خود ایک بلند پایہ عالم تھا، اس کے محل میں ہر وقت علماء، ادباء، شعراء، اطباء اور بڑے بڑے فلسفیوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ ان لوگوں کو مامون اپنی وسیع سلطنت کے اطراف و اکناف سے کھینچ لایا تھا۔ ان پر بلا امتیاز

جنس و عقیدہ اس کی خصوصی توجہ اور عنایات ہوتی تھیں۔ بعض دفعہ مجلس میں کسی اختلافی بحث کو وہ خود شروع کر دیتا تھا۔ اس طرح علماء کو بحث و مباحثہ میں حصہ لینے پر آمادہ کرتا۔ اس نے علماء اور فلاسفہ کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں سے استدلال پیش کریں، وہ ان سے کہتا تھا، قرآن، انجیل اور تورات سے استدلال نہ کرو بلکہ مسائل پر بحث کو عقل و منطق تک محدود رکھو۔" اس کا مقصد یہ تھا کہ مجلس میں مذہبی نزاعات نہ پیدا ہوں کیونکہ مجلس میں مختلف خیالات اور مذاہب کے اہلِ علم ہوا کرتے تھے۔ فقہاء اور محدثین کی مسئلہ خلقِ قرآن کی مشہور بحث میں اس نے خود حصہ لیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی علوم میں وہ کس قدر دست گاہ رکھتا تھا اور اسے نصوص پر کس قدر عبور تھا۔ ان مجلسی مباحث اور مناظروں کے لیے خاص قواعد ہوتے تھے اور تمام لوگ ان کی پابندی کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ مناظر غصہ میں نہ آئے، تعجب نہ کرے، شور نہ کرے، اپنے مدِمقابل کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی جانب متوجہ نہ ہو، جبکہ وہ بات کر رہا ہو تلاشِ حق اور راہِ صواب کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہ ہو۔

## فاطمین کے عہد کی علمی مجالس:

اسی طرح جب ہم عباسی خلفاء سے آگے بڑھ کر قاہرہ کے فاطمی خلفاء کی مجالس کو دیکھتے ہیں تو ان کی بھی یہی عظمت اور یہی شان نظر آتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ دارالحکومت میں علماء کا انبوہِ کثیر ہے، اور علمی موضوعات پر ہر وقت بحث و مباحثہ اور مجادلہ ہو رہا ہے اور اکثر اوقات خود خلفاء ان مباحث کی صدارت کرتے ہیں۔

## وزراء اور اُمرا کی علمی مجالس:

ان کے علاوہ وزراء اور اُمراء کی خصوصی مجالس بھی ہوا کرتی تھیں جن میں ہر فن کے اہلِ علم جمع ہوتے تھے۔ برامکہ کی مجالس کے حالات سے ادب و تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان مجالس میں علمی موضوعات پر مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے تھے، سیف الدولہ حمدانی کی مجلس میں ابو فراس الحمدانی وغیرہ جیسے پایہ کے چالیس سے زیادہ صرف شعراء تھے اور

جن میں مشہور شاعر متنبی بھی شرکت کرتا۔ یہ مجالس بھی اپنی خوبی اور وسعت میں عباسیوں کے زرّین عہد کے وزراء کی شاندار مجالس کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ یہی حال وزیر ابن الفرات کی مجالس کا تھا۔ ابوحیان توحیدی اپنی کتاب "الامتاع والمؤانسۃ" میں ان مجالس کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں جو وزیر موصوف کی صدارت میں منعقد ہوئی تھیں۔ ان مجالس میں سیرانی، خالد قدامہ بن جعفر، علی بن عیسیٰ الجراح اور ان جیسے بے شمار دوسرے مشہور فلسفی اور منطقی شریک ہوئے تھے۔ ابوحیان نے ابوعبداللہ حسین بن سعدان صمصام الدولہ کے وزیر کے ساتھ اپنی علمی مجالس کا بھی خاص تذکرہ کیا ہے۔

## عام اہلِ علم کی علمی مجالس :

جب ہم خلفاء، اُمراء اور وزراء کو چھوڑ کر عام علماء اور ادباء وغیرہ کی مجالس کی طرف آتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں ایک نئی علمی زندگی ملتی ہے ان قابلِ قدر مجالس میں سے ایک کا حال ملاحظہ ہو :

ایک دفعہ مشہور ادیب مقفع، اور وقت کے مشہور علماء، ادباء اور لکھنے والے کسی مجلس میں جمع ہوئے۔ ابن المقفع نے جو فارسی النسل تھا پوچھا کہ "دنیا میں کونسی قوم عقلمند ہے؟" اُنہوں نے اس کی پاسداری کے طور پر کہہ دیا کہ فارسی اعقل الامم ہیں۔ ابن المقفع نے کہا: "ایسا ہرگز نہیں، نہ انہیں دقتِ نظری حاصل ہے اور نہ ان میں اہلِ فضل ہیں، ان میں یہ قابلیت ہے اور نہ ان کے لیے یہ فضیلت ہے۔ وہ پڑھنے پڑھانے والے لوگ ضرور ہیں۔ دوسرے لوگوں کی طرف سے بات پیدا کی جاتی ہے اور وہ اسے سیکھ کر اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ خود ان میں استنباط اور استخراج کا ملکہ نہیں ہوتا" اس پر اہلِ مجلس نے کہا تو پھر رُومی ہیں۔ لیکن ابن مقفع نے انکار کیا اور کہا وہ صرف مضبوط اجسام ہی رکھتے ہیں۔ علمِ ہندسہ اور تعمیرات میں ماہر ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ کسی نے کہا تو پھر چینی ہیں۔ ابن مقفع نے کہا کہ وہ محض صنعت و حرفت جانتے ہیں فکر و ذہانت سے انہیں کیا واسطہ؟ کسی نے کہا تو پھر تُرک ہیں، لیکن ابن مقفع نے کہا، وہ تو شکاری

جانور ہیں[1]۔ مقصد یہ کہ وُہ جنگ کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔ کسی نے کہا تو پھر ہندوستانی ہوں گے ابنِ مقفع نے کہا: "وُہ حد درجے کے وہم پرست، پرلے درجے کے چالاک، شاطر اور شعبدہ باز ہوتے ہیں"۔ تنگ آکر انہوں نے اس سے پُوچھا تو پھر کون ہیں تو اس نے کہا کہ عرب ہیں۔ اس پر حاضرین نے کانا پھوسی شروع کر دی۔ کیونکہ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ ایک فارسی الاصل شخص عربوں کو تمام اقوام پر کسی طرح ترجیح دے سکتا ہے؟ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر ابن المقفع نہایت برہم ہُوا اور کہا: "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے سامنے چاپلوسی کر رہا ہُوں۔ خدا کی قسم کہ یہ بات میں تمہاری خاطر نہیں کہہ رہا بلکہ اس لیے کہہ رہا ہُوں کہ اگر میں عربی النسل ہونے سے محروم ہُوں تو مجھے ایک حق بات کہنے اور تسلیم کرنے سے ہرگز محروم نہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اس نے بالتفصیل بتایا کہ عرب کو دُوسری اقوام پر فضیلت کیوں حاصل ہے؟ کیونکہ وُہ ایسے علاقے میں آباد تھے جہاں نہ کوئی آسمانی کتاب تھی اور نہ علوم مروّج تھے لیکن اس کے باوجود اپنی فطری صلاحیّت سے انہوں نے نباتات میں معلومات فراہم کیں اور بتایا کہ ان میں کونسی بکریوں اور کونسی اُونٹوں کے لیے مفید ہیں۔ انہوں نے موسموں کے اختلاف سے ربیع، خریف اور گرما و سرما میں تقسیم کیا اور موسموں کے تغیرات اور انوار[2] کا علم انہوں نے بارشوں سے اخذ

---

[1]: اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن المقفع کے دور میں مسلمانوں کے علمی حلقے اسلامی تعلیمات سے کس قدر دُور ہو گئے تھے اور کس طرح وُہ قوم کو قوم پر ترجیح دیتے تھے اور قومیت و نسلیت اور وطنیت کی یہ وبا کس قدر عام تھی جو بعد میں مسلمانوں کے زوال کا باعث ہوئی (مترجم)

[2]: "نو" بارش کو بھی کہتے ہیں اور بھی یعنی عرب محاورے "نوء" بارش کو بھی کہتے ہیں اور اس کے معنی ستارے کا غروب ہونا اور اسی وقت مشرق میں دوسرے ستارے جو اس کے مقابل ہوں کا طلوع ہونا بھی ہیں۔ انوار اہلِ نجوم کے یہاں ۲۸ ہیں، ہر تیسرے دن میں ایک ستارہ مغرب میں غروب ہوتا ہے اور اس کے مقابل مشرق میں اسی وقت دُوسرا ستارہ طلوع ہوتا ہے اور ان ۲۸ ستاروں کے طلوع و غروب کے چکر کے خاتمہ کے ساتھ سال کا اختتام ہو جاتا ہے۔ اور پھر سال از سرِ نو شروع ہوتا ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ ۲۷۰)

کیا۔ ستاروں سے اُنھوں نے برّ و بحر کے سفروں کی سمت معلوم کرنے کا کام لیا۔ اُنھوں نے بُرائی سے بچنے اور اچھائی کی طرف ہونے کے لیے ایسے کچھ اصول وضع کر لیے جو انہیں مکارمِ اخلاق پر اُبھارتے اور دنائت سے بچاتے، یہاں تک کہ دُور دراز رہنے والا دیہاتی اور پریشان حال باشندہ بھی مکارمِ اخلاق کی تعریف کرنے لگتا ہے تو اس کے متعلق ایک ایک چیز بیان کر کے چھوڑتا ہے۔ اس طرح جب وُہ بُرائی کی قباحت بیان کرتا ہے تو موضوع کا حق ادا کر دیتا ہے۔ ان کا جو کلام بھی ہمارے سامنے ہے اس میں مکارمِ اخلاق و نیکی کی تعلیم ہے، پڑوسی کی حفاظت، سخاوت، اچھے اخلاق کے حصول کی تلقین کی گئی ہے ان میں سے ہر آدمی محض اپنی دماغی کاوش اور نظری ذہانت سے ان نتائج تک پہنچا بغیر کسی سابقہ نظیر اور تعلیم و تعلّم کے۔ اس لیے میں نے آپ سے کہا کہ عرب پیدائشی طور پر معتدل مزاج، صائب الفکر اور ذکی الفہم ہیں۔

## چند کتب فروش:

نامناسب نہ ہوگا کہ یہاں چند مسلم کتب فروشوں کا تذکرہ بھی لیا جائے انہیں "وراق" کیا جاتا تھا۔ ان کے ہاں بھی علماء، ادباء اور تعلیم یافتہ لوگوں کی مجالس ہُوا کرتی تھیں، ان کے ہاں ہر شخص کو اپنے ذوق اور فن کی مفید مطلب باتیں ملتی تھیں۔ بیشتر کتب فروش، ادیب اور تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تھے، وُہ اپنے پیشے سے علمی پیاس بجھاتے تھے۔ آپ کی معلومات کے لیے یہ کافی ہے کہ کتاب "الفہرست" کے مصنف ابنِ ندیم اور معجم الادباء اور معجم البلدان کے مصنف یاقوت، دونوں کتب فروش تھے۔ ابُو الفرج اصفہانی مصنف اغانی، اور

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۹) زمانۂ جاہلیت میں عرب کا خیال تھا کہ ایک ستارے اور دُوسرے کے غروب کے وقت بارش یا ہُوا کا ہونا ضروری ہے اسی وجہ سے وُہ بارش کو اسی ستارے کی طرف منسوب کرتے تھے، جس کے طلُوع کے وقت ہوتی تھی۔ اور کہتے تھے کہ مثلاً: مطرنا بنوء الثریا (ثریا کے نو سے ہم پر بارش ہوتی)

ابُو نصر الزجاج کُتب فروشوں کے ہاں آکر بیٹھتے تھے۔ یہ دونوں وہاں آنے والے شعرا کے ساتھ شعر و شاعری اور ادبی موضوعات پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے ایک دفعہ جب یہ دونوں ابُوالفتح بن الحراز کی دُکان پر ملے تو وہاں ایک شاعر ابُوالحسن علی بن یُوسف بھی بیٹھے ہُوئے تھے اور ابُوالفتح بن الحراز ابراہیم بن عباس سولی کے وُہ اشعار پڑھ رہے تھے جن میں سے ایک شعر یہ ہے :

سے ۵     دای خلتی من حیث یخفی مکانها

فکانت قذی عینیه حتی تجلت

"اس نے میری محبت (یا حاجت) کو اس طرح دیکھا کہ اس کی جائے قیام پوشیدہ تھی، تو وُہ اس کے لیے آنکھوں کا تنکا رہی یہاں تک کہ وُہ ظاہر ہوگئی"

جب ابُوالفتح نے یہ شعر پڑھا تو ابُوالحسن نے اسے نہایت پسند کیا اور دوبارہ پڑھوایا ابُونصر زجاج کہتے ہیں کہ مجھ سے ابُوالفرج نے کہا "جاؤ اور ابُوالحسن سے کہو کہ تُو نے اس شعر کی تحسین کرنے میں حد درجہ غلو سے کام لیا ہے اور درحقیقت ہے بھی اچھا شعر لیکن یہ بتائیے کہ اس میں کمال کیا ہے؟ یعنی کونسی صنعت ہے؟ ابُوالفرج کہتے ہیں کہ میں اس کے پاس گیا اور اس سے یہ کہا۔ اس نے جواب دیا" کہ یہ جو کہا "فکانت قذی عینیه" اس میں بڑے محاسن ہیں" میں ابُوالفرج اصفہانی کے پاس آیا اور انہیں اس کا جواب بتایا۔ اُنہوں نے کہا آپ دوبارہ اس کے پاس جائیں اور کہیں کہ آپ نے غلطی کی ہے کمالِ صنعت تو "من حیث یخفی مکانها" میں ہے۔

کتابوں کی دوکان کی علمی افادیت ہی کی بنا پر تو بعض ادیبوں نے کہا ہے :

مجالسة السوق مذمومة     ومنه مجالس قد تختسب

فلا تقربن غیر سوق الجیاد     وسوق السلاح وسوق الکتب

فهاتیک آلة اهل الوغی

وهاتیک آلة اهل الادب

"بازاروں میں بیٹھنا مذموم سمجھا جاتا ہے لیکن بازار کی بعض مجالس اچھی بھی سمجھی جاتی

ہیں۔

لہٰذا بازاروں کی مجالس کے قریب نہ جاؤ، سوائے گھوڑوں کے بازار، اسلحہ کے بازار اور کتابوں کے بازار کے ۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ تمہیں جنگی آلات دے گا اور یہ ادبی ہتھیار فراہم کرے گا۔"

واقعی بڑی اچھی بات کہی ہے، کیونکہ انسان کو یا تو فنونِ جنگ اور علمِ اسلحہ کی حاجت ہوتی ہے یا پھر علم و ادب سے آراستہ ہونے کی ہر اس شریف انسان کو ضرورت ہے جو با عزت اور با وقار زندگی بسر کرنا چاہتا ہو۔

## تفریحی مجالس میں بھی علمی بحث و تحقیق:

غرض، جو قوم بھی حیات کی تلاش کی متمنی ہو، وہ سب سے پہلے اپنے لیے علم و ادب کی غذا تلاش کرتی ہے جب اُمتِ اسلامیہ اقوامِ عالم کو زندگی بخش رہی تھی تو اس وقت اس نے علم و فن کی نشر و اشاعت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ بلکہ مختلف فرزندانِ اسلام خلیفہ سے لے کر، عالم اور تاجر تک سب علم کی نشر و اشاعت، مدارس کھولنے اور اس سلسلہ میں تمام سہولتیں فراہم کرنے میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتے تھے۔ مدارس میں ایسی باتیں زیرِ بحث آیا کرتی تھیں جن سے طلباء کے ذہن کھلتے تھے اور ان کی عقل بڑھ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ لوگوں کی رات کی مجلس آرائیاں اور ان کے لہو و لعب کی مجالس بھی علماء و ادباء کے وجود سے خالی نہیں رہتیں اور ایسی مجالس میں بھی کسی مسئلہ کی تحقیق، مشکلات کے حل اور غلطیوں کی تصحیح کے لیے علم و ادب کو آوازیں دی جاتیں، چنانچہ مثال کے طور پر ایک تاریخی واقعہ ملاحظہ ہو:

خلیفہ واثق کی مجلس میں سے ایک دفعہ کسی مغنیہ نے یہ شعر پڑھا:

ؔ اظلوم ان مصابکم رجلا

اهدى السلام تحیة ظلم

"اے ظالم! تمہارا اس آدمی کو تکلیف پہنچانا جس نے تمہارے پاس "سلام"

کا تحفہ بھیجا صریح ظلم ہے۔"

حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ "رجلاً" کی جگہ "رجل" ہونا چاہیے کیونکہ اِن کی خبر ہے اس لیے اس پر پیش ہونا چاہیے حالانکہ رجلاً درحقیقت مصابکم مصدر کا مفعول تھا۔ مصابکم بمعنی اصابتکم ہے اور ان کی خبر "ظلم" ہے جس پر رفع (پیش) ہے۔ مغنیہ نے اس تصحیح کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا مجھے یہ تسلیم نہیں ہے اور نہ میں اس تصحیح کے مطابق تبدیل کر کے اس شعر کو پڑھوں گی، کیونکہ میں نے ابوعثمان مازنی کے سامنے یہ شعر اسی طرح پڑھا ہے، جو بصرہ کے بڑے ادیب شمار ہوتے ہیں۔ واثق نے ابوعثمان مازنی کو بصرہ سے بغداد بلوایا۔ مازنی کہتا ہے کہ جب میں واثق کے ہاں گیا تو اس نے "ما اسمک" (تمہارا کیا نام ہے) کے بجائے "باسمک" کہا۔ مازنی کہتا ہے کہ ...... واثق یہ بتانا چاہتا تھا کہ لغتِ مازن میں "م" کی جگہ "ب" بولا کرتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا "میرا نام بکر بن محمد مازنی ہے۔" واثق نے کہا: شیبانی مازن یا تمیمی مازن؟" میں نے کہا: "شیبانی مازن" واثق نے کہا اچھا تو پھر کچھ گفتگو کرو۔ میں نے کہا "امیر المومنین! آپ کی ہیبت مجھے کچھ کہنے سے مانع ہے" اور راجز نے کہا ہے:

سہ لا تنقلوا ها وادلوا ها دلوا

ان مع الیوم اخاہ غدوا

"اسے تیزی سے نہ چلاؤ آہستہ آہستہ جانے دو "آج" کے ساتھ ہی اس کا "بھائی" کل ہے۔"

واثق نے کہا "تشریح کیجیے" میں نے کہا لا تنقلوا ہا کے معنی ہیں چلنے میں اس پر سختی نہ کرو، کہا جاتا ہے فلونہ جب تم سخت چال چلو اور دوونت یعنی جب نرم رفتاری سے چلو۔ اس کے بعد واثق نے توزی کو بلایا۔ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے مغنیہ پر اعتراض کیا تھا اور جو واثق کے گھر میں موجود تھے اور جن کا خیال تھا کہ ان مصابکم کے بعد جو رجل ہے، اس پر زبر نہیں، بلکہ پیش ہے کیونکہ مصابکم اسم مفعول ہے اور "رجل" ان کی خبر ہے۔ مازنی نے ان سے کہا کہ اس فقرے کو تم کس طرح پڑھتے ہو: "ان ضربک زیداً ظلم" توزی نے کہا بس

میں سمجھ گیا۔

ہم نے یہاں فقہاء، محدثین اور واعظین کی مجالس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ ہر گاؤں اور ہر شہر میں بکثرت ہوتی رہتی تھیں اور جو بہت مشہور ہیں۔ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہماری تہذیب نے اپنے دورِ عروج میں عالمِ اسلامی کو علم و ثقافت کی روشنی سے معمور کر دیا تھا۔ یہ روشنی گھروں، مسجدوں، مدارس، محفلوں، مجلسوں اور دکانوں تک میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ مغرب کے مایہ ناز عالم گستاف لوبون کو کہنا پڑا کہ عرب کو علوم سے عظیم محبت تھی۔ ایک مختصر عرصہ میں اپنی فتوحات کو مکمل کر کے وہ تہذیب و ثقافت کے اونچے مقام تک جا پہنچے اور ایسی تہذیب کو جنم دیا جس کے علوم و فنون اور شعر و ادب پختہ ہو کر اپنے منتہا کو پہنچ گئے۔

# تیرھواں باب

# دارالحکومت اور بڑے شہر

آج ہم چودھویں صدی ہجری یا بیسویں صدی عیسوی سے گذر رہے ہیں۔ اب ہم زمانۂ عروج کے عالمِ اسلامی کے چند شہروں اور اس زمانے کی مغربی دُنیا کے کچھ بڑے بڑے شہروں پر سرسری نظر ڈالیں گے۔ قارئین کو ان دونوں میں ایک عظیم فرق نظر آئے گا۔ ہم حیران ہوں گے کہ ایک جانب تو ہمیں زندگی قوت اور تہذیب نظر آتی ہے۔ یعنی عالمِ اسلام میں ........ اور دُوسری طرف ابتدائی ادوار کا بالکل ایک پسماندہ خطہ ہے جس میں علم کا نام ونشان ہے اور نہ زندگی اور تہذیب کا یعنی مغرب میں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان دونوں خطوں کے بڑے شہروں کا باہم موازنہ کریں۔ اور اس سلسلے میں مغربی دُنیا کے شہروں کی صورتِ حال آپ کے سامنے پیش کریں تاکہ معلوم ہو کہ ان کی معیشت کیسی تھی؟ ان کے شہروں کی وسعت کیا تھی اور باشندوں کا معیارِ حیات کیا تھا؟

## ساتویں صدی سے دسویں صدی کا انگلستان :

لافیس اور رامبو اپنی تاریخِ عالم میں لکھتے ہیں :

• اینگلو سیکشن انگلستان ساتویں صدی سے لے کر دسویں صدی کے بعد تک ایک قلاش ملک تھا جو دُنیا کے دُوسرے حصّوں سے کٹا ہُوا تھا۔ جہالت اور وحشت و بربریّت عام تھی۔ نانراشیدہ پتھروں سے مکانات تعمیر ہُوا کرتے تھے جنہیں کیچڑ سے جوڑا جاتا تھا اور فرش پر بھی کیچڑ لیپ دیا جاتا تھا۔ مکانات تنگ اور اس کے روزن اور روشندان نہایت چھوٹے چھوٹے، دروازے بالکل کمزور اور باڑھ میں کوئی روشندان یا کھڑکی نہ ہوتی تھی۔ مویشی جو ملک کا واحد ذریعۂ آمدنی تھے مختلف قسم کے امراض اور وباؤں سے ہلاک ہوتے رہتے، رہائش اور پناہ گاہ کے لحاظ سے لوگوں کی حالت مویشیوں سے کسی قدر بھی اچھی نہ تھی۔ رئیسِ قبیلہ اپنی جھونپڑی میں اپنے قبیلہ، خادموں اور دُوسرے متعلقین کے ساتھ رہتا تھا، یہ تمام لوگ ایک بڑے کمرے میں جمع ہوتے جس کے عین وسط میں انگیٹھی ہوتی اور دُھواں نکالنے کے لیے چھت کے عین وسط میں ایک سُوراخ ہوتا۔ یہ سب لوگ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا کرتے۔ خاندان کا رئیس اور اس کی بیوی ایک طرف بیٹھ جاتے۔ اس وقت چھری کانٹے کا سوال ہی نہ تھا۔ پیالے ایسے بنے ہُوئے تھے کہ ان کا نچلا حصّہ نوکدار ہوتا۔ اس لیے ہر آدمی کو یا تو اپنا پیالہ ہاتھ میں پکڑے رکھنا پڑتا یا ایک ہی دفعہ مُنہ میں انڈیل دینا پڑتا۔ شام کے وقت کھانے سے فارغ ہوکر، رئیس خاندان اپنے کمرے میں چلا جاتا اور بقیّہ لوگ اسی بڑے کمرے میں شراب پی کر بدمست ہوتے۔ اس کے بعد ہر ایک اپنا اپنا تکیہ اور تلوار سنبھالتا اور اس کھلے ہال میں فرش، زمین پر یا کسی چبوترے پر سو جاتا۔ ہر آدمی اپنا ہتھیار اپنے سرہانے رکھتا کیونکہ ڈاکہ زنی اس قدر عام تھی اور چور اس قدر دلیر تھے کہ ہر شخص کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ کہ اچانک حملہ نہ ہو جائے۔

یورپ کی تمام سرزمین لق و دق جنگلات کا گہوارہ تھی، زراعت نہایت پسماندہ حالت میں تھی۔ شہروں کے گرد و نواح میں گندے پانی کے جوہڑ ہوتے

تھے جن سے متعفن اور جان لیوا بدبو ہر طرف پھیلتی رہتی اور غریب انسان مہلک امراض کا شکار ہو کر فصل کی طرح کٹتے رہتے۔ پیرس اور لندن میں گھر لکڑی اور بھوسہ ملی کیچڑ سے تعمیر ہوتے تھے جیسا کہ نصف صدی سے ہمارے ہاں گاؤں میں گھر تعمیر ہو رہے ہیں ........ نہ کھڑکیاں ہوتیں اور نہ دروازے والے کمرے ہوتے تھے۔ بچھونے کے نام سے بھی یہ لوگ واقف نہ تھے بچھونا کیا ہوتا تھا گھاس پھوس زمین پہ بچھاتے اور اس پر پڑ رہتے۔ صفائی ستھرائی سے قطعاً ناواقف تھے۔ حیوانات کی گندگی اور باورچی خانے کی گندی چیزیں گھروں کے سامنے ڈال دیتے، جن سے بدبو کے بھپکے اٹھتے رہتے۔ تمام خاندان ایک ہی کمرے میں سوتا۔ مرد، عورت اور بچے سب اکٹھے ہوتے، اور بسا اوقات تو پالتو جانور بھی اسی کمرے میں ان کے ساتھ ہوتے، جس چیز کو وہ تخت کہتے تھے وہ گھاس پھونس کا بھرا ہوا ایک طرح کا گدیلا تھا، جس کے اوپر اون کا گدیلا ڈال دیا ہوتا جو بطور بچھونا یا بطور تکیہ استعمال ہوتا۔ سڑکوں کے ساتھ نالیاں نہ ہوتی تھیں اور نہ انہیں ہموار کیا جاتا، اور نہ روشنی کا کوئی انتظام تھا۔ یورپ کا بڑے سے بڑا شہر ۲۵ ہزار سے زیادہ آبادی نہ رکھتا تھا۔"

یہ تھی پورے یورپ کی حالت، گیارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد تک اور اس کا اعتراف خود یورپی مصنفین کو ہے۔

## اور عالم اسلامی کے شہروں کا کیا حال تھا؟:

اب آپ مغربی دنیا کے شہروں کی مذکورہ حالتِ زار کے تصور کے ساتھ ساتھ عالم تصور میں مشرقی شہروں کی بھی سیر کر لیجیے، تاکہ اس موازنے کے بعد آپ خود فیصلہ کر سکیں کہ اس زمانے میں عالم اسلامی کے بڑے شہر اور دار الحکومت مثلاً بغداد، دمشق، قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ وغیرہ کیسے تھے اور ان میں تہذیب و تمدن کی کیفیت کیا تھی؟

اِس سلسلے میں ہمیں چاہیے کہ گفتگو کا آغاز اندلس کے شہروں ہی سے کریں کیونکہ وہ اس یورپ ہی کے پڑوس میں واقع ہیں جس سے ہم بحث کر رہے ہیں۔ چنانچہ آغاز قرطبہ سے ہونا چاہیے اور مناسب یہ ہے کہ تمام دوسری چیزوں کو چھوڑ کر صرف اس کے ظاہری خدوخال کو پیش کیا جائے۔

## قرطبہ:

قرطبہ، اُموی حکمران عبدالرحمٰن ثالث کے دور میں، مسلم اندلس کا دارالحکومت تھا۔ رات کے وقت یہ قمقموں سے روشن ہوتا تھا، لوگ دس میل ...... (یعنی ۱۶ کیلومیٹر) ...... تک ان چراغوں کی روشنی میں سفر کرتے چلے جاتے اور یہ روشنی ختم نہ ہوتی تھی۔ اس کی تمام گلیاں پختہ تھیں اور ہر قسم کا کوڑا کرکٹ سڑکوں سے اُٹھا دیا جاتا تھا۔ پورا شہر گھنے باغات میں گھرا ہوا تھا۔ جو شخص بھی باہر سے آتا وہ کافی دیر اور کافی دُور تک ان باغیچوں اور پارکوں میں سیر و تفریح کرتا ہوا آتا۔ اس کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ آبادی اس وقت تھی جبکہ پورے یورپ میں کوئی بڑا شہر ۲ ہزار نفوس سے زیادہ پر مشتمل نہ تھا۔ اس میں ۹۰۰ حمام تھے اور ۲۸۳۰۰۰ گھر تھے۔ محلات کوٹھیوں کی تعداد ۸۰ ہزار تھی۔ مساجد ۶۰۰ تھیں، شہر کا بیرونی محیط ۸ فرسخ یعنی تیس ہزار گز تھا۔ اس کی تمام آبادی تعلیم یافتہ تھی۔ شہر کے صرف مشرقی محلے میں ۱۷۰ عورتیں کتابتِ قرآن کا کام کرتی تھیں۔ یہ سب کوفی خط میں قرآن کریم لکھتی تھیں۔ اور یہ حال شہر کے صرف ایک محلے کا تھا۔ اس میں ۸۰ مدارس تھے جن میں فقراء مفت تعلیم حاصل کرتے تھے اور ۵۰ اسپتال تھے، رہی قرطبہ کی جامع مسجد تو وہ اس وقت بھی اور آج بھی اپنے فنی اور اختراعی لحاظ سے زندۂ جاوید یادگار ہے۔ اس کا اذان خانہ ۴۰ ہاتھ اونچا تھا۔ اس کا ایک گنبد نفیس لکڑی کے بنے ہوئے سہاروں پر قائم تھا۔ یہ مسجد ۱۰۹۳ ستونوں پر قائم تھی اور یہ ستون مختلف قسم کے سنگِ مرمر سے بنے ہوئے تھے اور نیچے اوپر تک شطرنج کے خانے جیسے بن گئے تھے۔ اس طرح طول میں ۱۹ خانے اور عرض میں ۳۸ خانے بن گئے تھے۔ رات کے وقت

اس میں ۷۰۰۰ چراغ جلتے تھے جن میں ایک سال میں ۲۴ ہزار پونڈ زیتون کا تیل جلتا تھا۔ اس کے جنوبی جانب ۹ دروازے تھے۔ یہ برونز (جست) کی عجیب تختیوں سے بنے ہوئے تھے البتہ درمیانی دروازے پر سونے کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ اسی طرح مشرقی اور مغربی جانب بھی نو نو دروازے تھے جو جنوبی دروازوں ہی کے مشابہ تھے۔ رہا مسجد کا محراب تو اس کے بارے میں انگریزی مؤرخین کا یہ قول نقل کر دینا ہی کافی ہے "انسانی آنکھوں نے آج تک جو چیزیں دیکھی ہیں ان سب سے یہ خوبصورت ترین چیز ہے اور یہ کہ اس جیسی کاریگری اور چمک دمک کسی قدیم اور جدید آثار میں سے کسی میں نہیں ہے"

## قرطبہ کا الزہراء:

قرطبہ سے ملحق ہی ایک عظیم قصر "الزہراء" تھا۔ یہ اپنی فنی خوبیوں اور چمک دمک کی وجہ سے عجوبۂ روزگار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں ترکی مؤرخ ضیا پاشا فرماتے ہیں:

"یہ ایک ایسا عجوبۂ روزگار محل ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی مہندس کے ذہن میں اس کے نقشے جیسا کوئی تخیل نہیں آیا، اور جب سے اللہ نے عقل پیدا کی ہے، اس جیسا کوئی نقشہ تیار نہیں ہو سکا"

اس کے گنبد ۴۳۱۶ ستونوں پر کھڑے تھے جو مختلف قسم کے سنگِ مرمر سے بنائے گئے تھے اور ان پر ایک جیسے نقش و نگار تھے، اس کے فرش پر مختلف رنگوں کے سنگِ مرمر کے تختے مختلف اور خوبصورت شکلوں میں لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر سنہری لاجوردی رنگ کے چوکھٹے لگے ہوئے تھے۔ محلّوں میں میٹھے پانی کے شفاف چشمے لا کر بہائے گئے تھے، جن کا پانی سفید سنگِ مرمر کے بنے ہوئے مختلف شکل و صورت کے حوضوں میں سے ہوتا ہوا خلیفہ کے محل میں جا کر ایک نہایت حسین و جمیل حوض میں گرتا تھا۔ جس کے درمیان سونے کی ایک مرغابی تیرتی رہتی تھی۔ جس کے سر میں ایک موتی لگا ہوا تھا، اور جس میں رنگ برنگ کی ہزاروں مچھلیاں تھیں جن کی خوراک کے لیے روزانہ ۱۲ ہزار روٹیاں پھینکی جاتی تھیں۔ الزہراء میں ایک خاص نشست گاہ تھی جس کو "قصر الخلافت" کہتے تھے، جس کی چھت اور دیواریں، سنہری اور

مختلف قسم کے صاف و شفاف سنگِ مرمر سے بنی ہوئی تھیں اور اس کے درمیان ایک بڑا حوض تھا جو پارے سے بھرا ہوا تھا۔ اِس نشست گاہ کے ہر سمت میں آٹھ محراب نما دروازے تھے، جو سونے اور قسم قسم کے موتیوں سے جڑے ہوئے ہاتھی دانت اور آبنوس کی لکڑی سے بنے ہوئے تھے اور رنگ دار پتھروں اور صاف و شفاف سنگِ مرمر کے اُونچے ستونوں پر لگے ہوئے تھے۔ دُھوپ ان دروازوں سے داخل ہوتی تھی اور اس کی شعاعیں نشست گاہ کے درمیان اور دیواروں سے ٹکراتی تھیں، اس سے اس قدر چمک پیدا ہوتی تھی جس سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور خلیفہ "الناصر" اگر اہلِ مجلس میں سے کسی کو خوف زدہ کرنا چاہتا تو وہاں موجود کسی غلام کو اشارہ کرتا جو حوض کے اندر لبریز پارے کو حرکت دے دیتا جس سے محسوس ہوتا کہ پُوری مجلس بجلی کی لپیٹ میں آگئی ہے۔ اہلِ مجلس کے دل دہل جاتے وُہ یہ محسوس کرتے کہ محل انہیں لے کر اُڑ رہا ہے، جب تک پارہ متحرک رہتا یہی کیفیت رہتی۔ اس قصر کو گھنے باغات نے گھیر رکھا تھا اور اس کے چاروں طرف بڑے بڑے میدان تھے اور اس سے بھی آگے عظیم فصیل تھی جو اس عظیم الشان عمارت کو محیط تھی جس میں تین سو جنگی برج تھے۔ قصر الزہرا، خلیفہ اور اُمرا اور حرم سراؤں کے محلات پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ کچھ ہال ایسے تھے جو خلیفہ کے بیٹھنے کے لیے مخصوص تھے اور جس جگہ خلیفہ جلوس فرماتا اسے "سطحِ ممرد" کہا جاتا تھا۔ جس پر ایک گنبد تھا جس کی اینٹیں سونے اور چاندی کی تھیں۔ لیکن جب قاضی منذر بن سعید نے، قرطبہ کی جامع مسجد کے بھرے مجمع میں خلیفہ پر سخت گرفت کی تو خلیفہ نے اس قبے کو تڑوا کر پختہ اینٹوں سے تعمیر کرایا۔ اس عظیم قصر کے لق و دق احاطہ میں آلات اور دُوسری مصنوعات کی فیکٹریاں بھی تھیں۔ اس طرح یہاں جنگی اسلحہ بھی تیار ہوتا رہتا[1] ہمیں چاہیے کہ اس کو یاد کریں آج جبکہ ہم نئے سرے سے مسلح ہو رہے ہیں۔ ہمیں یاد کر لینا چاہیے

---

[1]: قصر کے طویل و عریض احاطہ ہی میں اس طرح کے کارخانوں کا انتظام غالباً اس لیے کیا گیا تھا کہ جنگ کے موقع پر اگر دُشمن کی فوجیں محاصرہ کر لیں تو اسلحہ وغیرہ باہر سے لانے کی ضرورت نہ پڑے بلکہ قلعہ بند فوجوں کو اسلحہ وغیرہ کی سپلائی ٹوٹنے نہ پائے اور مدافعت کرنے والوں کو ہتھیار مسلسل ملتے رہیں۔

کر کسی وقت ہم خود اپنے لیے اسلحہ تیار کرتے تھے اور اس بارے میں کسی سے بھیک نہ مانگتے تھے" (مصنف) زینت و زیورات کی ایک فیکٹری، سنگتراشی، جہاز سازی اور مجسمہ سازی کے کارخانے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ہر قسم کی صنعتیں اور پیشے وہاں موجود تھے۔ اس کی تعمیر پر چار سال لگے، روزانہ تراشے جانے والے پتھروں کی اوسط تعداد ۶۰۰۰ تھی، اور وہ ان پتھروں کے علاوہ تھے جو فرش سازی میں استعمال ہوتے تھے، دس ہزار آدمی روزانہ کام کرتے تھے۔ ۴۰۰ خچر ہر وقت کام میں لگے رہتے۔ ہر تیسرے دن ۱۱۰۰ اونٹ گچ اور چونا وہاں آتا تھا۔ الزہرا کی جامع مسجد میں ہر روز ایک ہزار ماہرِ فن کاریگر کام کرتے تھے جن میں ۳۰۰ معمار، ۲۰۰ نجار، ۵۰۰ مزدور اور دوسرے کاریگر تھے۔ اس کی تعمیر صرف ۴۸ دنوں کے اندر مکمل ہوئی۔ یہ کام اس قدر تیزی سے ہوا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

۳۵۱ھ میں خلیفہ المستنصر نے اسی عظیم قصر میں مسیحی اسپین کے بادشاہ اردون بن اذفونش کا استقبال کیا۔ جب وہ الزہرا میں داخل ہوا اور اس کی چمک دمک اور خدم و حشم اور اسلحہ و سامان دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ جب وہ المستنصر کی مجلس میں پہنچا اور اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے اعیانِ مملکت اور شرفاء کو دیکھا جن میں بڑے بڑے علماء، خطباء اور فوجی جنرل موجود تھے تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی، یہ اسپینی حکمران بادشاہ کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے سر سے تاج اُتار لیا، اپنی چادر رکھ دی اور اس وقت تک جھکا رہا، جب تک اسے خلیفہ نے اجازت نہ دی۔ جب اس نے خلیفہ سے ملاقات کی تو تھوڑی دیر کے لیے سجدے میں گر پڑا، پھر کھڑا ہو کر کچھ قدم آگے بڑھا اور سجدے میں گر پڑا۔ اس نے خلیفہ تک پہنچتے پہنچتے کئی مرتبہ ایسا ہی کیا اور پہنچتے ہی وہ اس کا ہاتھ چومنے کے لیے جھکا۔ ہاتھ چومنے کے بعد وہ اُلٹے پاؤں چلا تاکہ خلیفہ کی طرف پشت نہ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھا اور خلیفہ نے اسے خوش آمدید کہتے ہوئے یہ الفاظ کہے:

"تمہاری آمد پر ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ تمہاری یہ آمد تمہارے لیے باعثِ خوشی ہو کیونکہ ہمارے نزدیک تمہارے بارے حسنِ ظن اور وسعتِ قبولیت اس سے زیادہ ہے جس کی تم توقع کر سکتے ہو" جب خلیفہ کے کلام کا مفہوم اس کی زبان میں اسے ترجمہ کر کے سمجھایا

گیا تو وہ بے حد خوش ہوا، اپنی جگہ پر جھکا اور فرش کو بوسہ دیا اور پھر کہا "میں اپنے آقا امیر المؤمنین کا ادنیٰ غلام ہوں، اس کی مہربانی پر میرا بھروسہ ہے اور اس کی عزت افزائی کا امیدوار ہوں، اس کی ذات اور اس کے آدمیوں پر مجھے پورا بھروسہ ہے، سو اس نے جو خدمت بھی میرے سپرد کی اور اپنی مہربانی سے جس درجے میں بھی مجھے رکھا، مجھے امید ہے کہ میں سچی نیت اور خالص نصیحت اور بھلائی سے آگے بڑھوں گا"۔۔۔۔۔۔ اس پر خلیفہ نے اس سے کہا "تم کو ہمارے ہاں ان لوگوں کا مقام حاصل ہے جن کے بارے میں ہم اچھی رائے رکھتے ہیں اور امید ہے کہ ہماری عزت افزائی اور اکرام داعزاز، تمہاری قوم میں تمہارے لیے باعثِ رشک ہوگا اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہماری طرف جھکنے اور ہماری سلطنت کے زیرِ سایہ رہنے سے تم کو کیا فوائد حاصل ہوئے ہیں"؟

ذرا خیال کیجیے کہ خلیفہ مستنصر کے منہ سے نکلنے والے کلمات میں کس قدر قوت اور عظمت ہے کہ انہیں سمجھتے ہی اسپین کے یہ حکمران دوبارہ سجدے میں گر جاتے ہیں اور پھر خلیفہ کو دعائیں دیتے ہیں کہ اس نے ان پر مہربانی کی اور ان کی حمایت کا یقین دلایا۔

## غرناطہ :

پھر جب ہم غرناطہ کی طرف آتے ہیں، تو تعمیر کی عظمت ہمارے سامنے الحمراء کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اس محل کو دیکھ کر دیکھنے والا انگشت بدنداں رہ جاتا تھا اور زمانے کی ستم ظریفیوں کے باوجود آج بھی یہ عمارت سارے جہان کے سیاحوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہ محل غرناطہ کے بلند پہاڑ کے دامن میں وسیع اور سبز و شاداب کھیتوں میں تعمیر کیا گیا جنہوں نے اس محل کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اس طرح یہ عمارت کرۂ ارض کی خوبصورت ترین عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں مختلف ہال اور بڑے بڑے کمرے تھے۔ مثلاً سنگِ سیاہ سے بنا ہوا ہال، سفید اور سیاہ پتھروں سے بنے ہوئے پہلو بہ پہلو دو کمرے، کمرۂ عدالت اور سفراء کے باریاب ہونے اور ملاقات کرنے کا ہال وغیرہ۔

اس مختصر بحث میں ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم الحمرا کی خوبیوں کا نقشہ کھینچ سکیں، اس کی عظمت کے لیے یہ ثبوت کافی ہے کہ فرانس کا مشہور شاعر "وکٹر ہوگو" اس سے مخاطب ہو کر ان خیالات وجذبات کا اظہار کرتا ہے:

"اے حمرا! اے حمرا! اے وہ قصر جسے فرشتوں نے تخیل کی چاہت کے مطابق مزین کیا، اور تجھے نظم وسلیقہ کا نشان قرار دے دیا، اے مجدد شرف والے قلعے! جس میں پھولوں کے نقش ونگار اور جھکی ہوئی شاخوں کے نقوش قابلِ دید ہیں، جب چاند کی چاندی کی سی سفید چاندنی تیرے عربی مناروں میں سے گذر کر، تیری دیواروں پر پڑتی ہے، تو اس وقت رات کی خاموشی میں ایک ایسی سرگوشی سنائی دیتی ہے جو اہلِ دل کو مسحور کر دیتی ہے۔"

## اشبیلیہ:

رہی اندلس کے دوسرے شہروں کی داستان اور ان کی عظمت اور ترقی کا حال تو یہ ایک طویل کہانی ہے، میں مناسب سمجھتا ہوں دوسرے شہروں کو چھوڑ کر صرف اشبیلیہ کے بارے میں یہ بیان کر دینا کافی ہو گا کہ اس شہر میں صرف ریشمی کپڑے بننے کے لیے ۶ ہزار کرگھے تھے، یہ شہر ہر طرف سے زیتون کے درختوں سے گھرا ہوا تھا اور اسی وجہ سے وہاں زیتون کا تیل نکالنے کی ایک لاکھ گھانیاں تھیں۔

## مصنوعات:

عموماً اندلس کے تمام شہر آباد تھے اور ہر شہر خصوصیت سے کسی صنعت کے لیے مشہور تھا اور یورپی لوگ اسپین کی مصنوعات میں جس قدر دلچسپی کا اظہار کرتے تھے اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اسپین کے خود اور زرہیں مشہور تھیں۔ فولاد ڈھالا جاتا تھا۔ تمام یورپ سے یہاں خریداری کے آرڈر آتے تھے...... دورِ جدید میں ہمیں ان باتوں پر ذرا غور کرنا چاہیے...... چنانچہ مصنوعات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ "زینو"

اپنی کتاب "فرانس پر حملہ" میں لکھتا ہے: "جب عربوں نے اندلس سے جنوب فرانس پر حملہ کیا اور مسیح خولانی، عنبسہ کلبی اور حر ثقفی کی قیادت میں فرانس کے شہر اربونہ، فرتشونہ، اشبون اور لیون فتح کیے تو اس حملے میں وہ ایسے ہتھیاروں سے مسلح تھے جیسے ہتھیار انگریزوں کے پاس بھی نہ تھے۔

## بغداد:

اب ہم عالم اسلامی کے مشرقی حصے کی طرف لوٹ رہے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہاں کے بڑے شہروں اور وہاں کی شاندار تہذیب کا کیا حال ہے۔ یہاں میں صرف بغداد کے ذکر پر اکتفا کر کے یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ اپنی تعمیر کے بعد کس طرح یہ شہر ایک عجوبۂ روزگار بنا جس کی کوئی مثال تاریخ قدیم میں نہیں ہے۔

بغداد اپنی توسیع و تعمیر سے پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس میں ہر سال کے آخر میں قرب و جوار کے تاجر جمع ہوتے تھے۔ جب خلفائے عباسیہ کے مشہور خلیفہ منصور نے اس کی تعمیر و توسیع کا عزم کیا تو اس نے بڑے بڑے انجینیروں اور تعمیرات کے ماہرین کو جمع کیا۔ نیز زراعت، مساحت اور اراضی کی تقسیم کے ماہرین کو بھی بلایا۔ اپنے ہاتھ سے اس کی تعمیر کی پہلی اینٹ رکھی اور کہا: بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ و الحمد للّٰہ و الارض للّٰہ یورثها من یشآء من عبادہ و العاقبة للمتقین۔[1] اس کے بعد اس نے کہا اللہ کا نام لے کر شروع کرو۔ اس کی تعمیر پر جو رقم صرف ہوئی وہ چار ملین یعنی چالیس لاکھ روپے تھی۔ ایک لاکھ مزدوروں نے اس میں کام کیا۔ اس کی تین فصیلیں تھیں جو ایک دوسرے کے بعد متصل تھیں۔ اس میں زیادہ سے زیادہ آبادی ۲۰ لاکھ رہی اور اس کے مشرقی جانب سڑکوں اور گلیوں کی تعداد ۶ ہزار تھی اور مغربی جانب چار ہزار اور اس میں دجلہ اور فرات کے

---

[1] : بسم اللہ، الحمد للہ، زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا وارث بنا دے اور بہترین انجام متقین کے لیے ہے۔

علاوہ گیارہ نہروں کی شاخیں تھیں جن کا پانی بغداد کے تمام گھروں اور محلوں کے اندر جاتا تھا اور صرف دجلہ میں ایک کنارے سے دُوسرے کنارے تک جانے آنے کے لیے چھوٹی کشتیوں کی تعداد ۳۰ ہزار تھی۔ شہر میں ۶۰ ہزار حمام تھے اور عہدِ عباسی کے آخری ایام میں ان کی یہ تعداد کم ہو کر دس ہزار سے کچھ اُوپر رہ گئی تھی۔ مساجد کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ رہا اس کی آبادی کا صحیح اندازہ، علماء کی کثرت، ادباء اور فلاسفہ کی تعداد تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

مناسب ہو گا کہ بغداد کے بارے میں ابوبکر الخطیب کا ایک اقتباس پیش کر دوں:

"ہم نے بغداد کے ذکر میں اس کی کئی خصوصیات کو چھوڑ دیا ہے، جو ساری مشرقی و مغربی دُنیا کے مقابلے میں صرف بغداد کو دی گئی ہیں۔ ان میں یہاں کے لوگوں کی خوش اخلاقی، اچھی خصلتیں، وہاں کا خوشگوار اور میٹھا پانی، بکثرت خوش ذائقہ میوے، خوشحالی، ہر صنعت میں مہارت، ہر ضرورت کا بسہولت فراہم ہو جانا، بدعات کے پھیلنے سے محفوظ ہونا، قابلِ رشک حد تک علماء، طلباء، فقہا اور طلبائے فنون کی کثرت، بڑے بڑے متکلمین، حساب دان، نحوی، بہترین شعراء، تاریخ و انساب کے رُواۃ، فنونِ ادب کے ماہرین اطراف و اکناف سے کھنچ کھنچ کر ہر علم و فن کے میدان کے شہسواروں کا آ جانا اور غرض ہر عجیب و غریب چیز کا ہر وقت موجود ہونا شامل ہے۔ یہاں تمام موسموں کے پھل ہر وقت موجود رہتے، دُنیا کے کسی کونے میں جو پھل بھی پایا جاتا وہ یہاں موجود ہوتا۔ خصوصاً خریف (گرمی اور جاڑے کے درمیانی زمانے) میں یہاں کے کسی باشندہ کے لیے کوئی مکان تنگ ہو جاتا تو وہ بسہولت اس سے اچھا مکان پا لیتا۔ اگر کسی کو اپنے مکان کے مقابلے میں کوئی دُوسرا مکان پسند آ جاتا تو اس کے لیے وہاں منتقل ہو جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ یہاں کے باشندے شہر کے جس کنارے اور جس طرف بھی رہنا پسند کرتے رہ سکتے۔ یہاں اگر کوئی دُشمن سے بھاگ

آئے تو اسے پناہ دینے والے بے شمار لوگ مل جاتے اور وُہ اسے چھپا سکتے، دُور ہوں یا قریب، یہاں وُہ اگر ایک گھر سے دُوسرے گھر، ایک گلی سے دُوسری گلی، ایک سڑک سے دُوسری سڑک اور ایک شاہراہ سے دُوسری شاہراہ میں منتقل ہونا چاہتا تو بسہولت ہو سکتا۔ غرض وقت اور حالات کے مطابق وُہ ہر قسم کی تبدیلی کر سکتا۔ یہاں کے بڑے بڑے تاجروں، بادشاہوں اور فلک بوس مکانات کے معتزمکینوں کا حال یہ تھا کہ وُہ ہر طرف سے نادار اور کمتر لوگوں پر داد و دہش کی بارش کرتے رہتے اور یہ سلسلہ ہر وقت جاری رہتا۔ غرض، یہ اللہ کے خزانے تھے جن کی حقیقت تک اللہ کے سوا کسی کو رسائی حاصل نہیں۔"

یہی مصنّف دُوسری جگہ لکھتے ہیں:

"بغداد ایک ایسا شہر تھا کہ پُوری دُنیا میں جلالتِ قدر، عظمتِ شان، علماء رؤسا کی کثرت، خواص و عوام کی تمیز، اطراف کی وسعت اور ندی نہروں اور دریا کے کناروں کی کثرت، مکانات اور محلّات کی بہتات، مساجد اور حماموں کی کثرت، دُکانوں اور ہوٹلوں کی کثرت، اچھی ہوا، میٹھے پانی ٹھنڈے سائے، گرمیوں اور سردیوں کے اعتدال، بہار اور خزاں کی صحت مندی اور آبادی کی کثرت کے لحاظ سے پُوری دُنیا میں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ ہارون الرشید کے زمانے میں یہ شہر بامِ عروج پر تھا اور آبادی سب سے زیادہ تھی جبکہ اس کو دُنیا میں آرام کے بہترین ٹھکانے، خوراک کے بہترین مواقع تھے۔ ہر طرف سرسبزی و شادابی اور سڑکوں پر لوگوں کا اژدہام رہا کرتا تھا۔ البتہ اس کے بعد بربادی کا دَور آیا۔ لوگ مصیبتوں میں پڑ گئے، شہر کی آبادی خراب ہو گئی اور خاندانوں کے خاندان یہاں سے چلے گئے لیکن ہمارے زمانے سے پہلے یہ حال نہ تھا جو آج ہے کہ ہر طرف افراتفری ہے اور اگرچہ حال میں خرابی ہے لیکن کسی وقت یہ شہر

تمام شہروں سے ممتاز اور تمام دیار و امصار سے مختلف تھا۔"

## قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا :

ہم اپنی بات المقتدر باللہ کے وقت کے بغداد کے تذکرہ پر ختم کرتے ہیں، کہ اس وقت اس کی حالت کیا تھی[1]۔ نیز اس زمانے میں جبکہ روم کے شہنشاہ کا ایلچی دربارِ خلافت میں حاضر ہوا تھا بغداد میں اسلامی خلافت کی کیا شان و شوکت تھی۔ بغداد میں صرف دارُ الخلافت (Khilafat House) اپنی وسعت اور افراد کی کثرت کے لحاظ سے موجودہ شام کے بڑے سے بڑے شہر سے بھی بڑا تھا۔ یہاں صرف خواجہ سراؤں کی تعداد گیارہ ہزار تھی۔ اور ان کے علاوہ دوسرے خدام بھی ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ایک شفٹ میں جو چپراسی اور خادم کام کرتے تھے ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ جب شہنشاہِ روم کا ایلچی آیا تو اسے دارُ الضیافت (مہمان خانہ) میں اُتارا گیا۔ دارُ الضیافت سے، دار الخلیفہ تک فوجیں قطاروں میں کھڑی ہو گئیں۔ جن فوجیوں نے اس مظاہرے میں حصّہ لیا اُن کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ جن میں سوار اور پیدل فوج شامل تھی۔ وُہ ان کے درمیان سے چل کر دارُ الخلافت تک پہنچا۔ اس نے خلیفہ کو سلام کہا، اور حکم دیا گیا کہ اُسے دار الخلیفہ کے اندر کی سیر کرائی جائے۔ خلیفہ کے رہنے والا گھر خالی کر دیا گیا تھا اور اس میں سات ہزار خدّام اور سات سو حاجب اور چار ہزار سیاہ فام غلاموں کے سوا کوئی بھی نہ تھا، یہاں خزانوں اور فوجی اسلحہ کی اس طرح نمائش کی گئی جس طرح دُلہن کے جہیز کی نمائش کرائی جاتی ہے۔ جب یہ ایلچی دارالشجرہ میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا، یہ درخت چاندی سے بنا ہوا تھا جس کا وزن پانچ لاکھ درہم تھا۔ اس درخت کی اٹھارہ بڑی شاخیں تھیں اور ہر شاخ سے چھوٹی چھوٹی بہت سی ڈالیاں نکلی ہوئی تھیں۔ ان تمام

---

[1]: جبکہ بغداد مائل بہ انحطاط ہو گیا تھا۔

شاخوں پر مختلف قسم کی چڑیاں اور پرندے بیٹھے ہُوئے تھے۔ کچھ چاندی کے اور کچھ سونے کے۔ اس درخت کے پتّے بھی مختلف قسم کے تھے اور ان کے مختلف رنگ تھے اور اس طرح حرکت کرتے رہتے تھے جیسا کہ عجیب قسم کی دھیمی دھیمی ہوا چل رہی ہو۔ یہ تمام سنہری اور روپہلی پرندے ہواؤں کے مختلف رُخ پر اس طرح مُنہ کھولے ہُوئے بنائے گئے تھے کہ ہواؤں کی لہروں سے پرندوں کے گانے اور چہچہانے کی آوازیں سُنائی دیتیں۔ دارالشجرہ کے پاس پندرہ گھوڑسواروں کے مجسمے تھے جو دیباج کا لباس پہنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے نیزے تھے، یہ ایک ہی سمت میں ایک دُوسرے کے پیچھے بھاگتے ہُوئے دکھائے گئے تھے۔ گویا کہ ایک دُوسرے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس کے بعد وُہ (رُومی سفیر) الفردوس نامی محل میں داخل ہُوا۔ اس میں بیشمار جنگی آلات تھے۔ اس کے بعد وُہ خلافت ہاؤس کے ایک محل سے دُوسرے میں لے جایا جاتا رہا، اور اس نے ۲۳ محلات کا معائنہ کیا، اور اس دوران سات دفعہ آرام کیا۔ اور پھر المقتدر باللہ کی مجلس میں واپس آیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ:

"اس موقع پر خلافت ہاؤس میں جو قالین بچھائے گئے ان کی تعداد ۲۲ ہزار تھی۔ محلوں اور نشست گاہوں میں پہلے سے جو قالین موجود تھے وُہ اس تعداد میں شامل نہیں ہیں۔ مختلف محلوں میں اس موقع پر ۳۸ ہزار ریشمی اور سنہری پردے لٹکائے گئے۔ دارالخلافت میں شہنشاہِ رُوم کے ایلچی نے جو چیزیں دیکھیں ان میں زُو بھی شامل تھا۔ اس میں مختلف قسم کے وحشی اور نامانوس جانور تھے۔ یہاں ایک ہاتھی گھر بھی تھا جس میں چار ہتھنیاں تھیں، ہر ایک کی دیکھ بھال کے لیے آٹھ ہندوستانی ملازم تھے۔ درندوں کے لیے سو گھر تھے، جن میں مختلف قسم کے سو درندے تھے۔ درندوں کے یہ گھر زُو کے دائیں طرف پچاس اور بائیں طرف پچاس تھے۔ ہر شیر

اور دُوسرے درندے کو ایک آدمی پکڑے ہُوئے تھا۔ ان کے سروں اور
گردنوں میں لوہے کی بیڑیاں ڈالی ہُوئی تھیں۔"

خلافت ہاؤس کے معائنے کے بعد شہنشاہِ رُوم کا ایلچی دنگ رہ گیا تھا کیونکہ اس
وقت پُورے کرۂ ارض پر ایسا کوئی محل موجود نہ تھا، جس کا اس نے مشاہدہ کیا تھا۔

میں سمجھتا ہُوں ہماری تہذیب کے دورِ عرُوج کے شہروں اور قصور و ایوان اور
دُوسری تعمیرات کی عظمت و قوت اور شان و شوکت کے اظہار کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔